نیل کنارے

علی سفیان آفاقی

تزئین و اہتمام

پروین ملک، وسیم گوہر

نام کتاب ——— نیل کنارے

مصنف ——— علی سفیان آفاقی

سرورق ——— ریاظ

سنِ اشاعت ——— ۱۹۹۷ء

پرنٹرز ——— یاسر عمیر پرنٹرز
پٹیالہ گراؤنڈ۔ لاہور

قیمت ——— ۱۸۰/- روپے

ابتدائیہ

نگری نگری پھرا مسافر، گھر کا رستہ بھول گیا

وہ مسافر کوئی اور ہوتے ہوں گے جو پراسرار سر زمینوں کے سفر پر نکلتے تھے تو وہاں کی جادو بھری فضاؤں میں گم ہو کر گھر کا رستہ تک بھول بیٹھتے تھے۔

علی سفیان آفاقی ان مسافروں میں سے نہیں ہیں وہ تو نیل کنارے جا کے بھی "بے نیل و مرام" واپس آ جاتے ہیں۔ بے نیل و مرام ان معنوں میں کہ جو حرکتیں کسی اجنبی دھرتی پر جا کے عین واجب سمجھی جاتی ہیں، آفاقی صاحب ان سے یوں احتراز کرتے ہیں جیسے شوگر کا مریض میٹھے کی دکان سے کاوا کاٹ کے گزرتا ہے۔ انہیں اپنے سفر کے دوران یقیناً فی میل سینکڑوں Female بھی نظر آ جائیں تو آفاقی صاحب صناعی قدرت کی داد دے کر ہزار دام سے ایک جنبش میں نکل جاتے ہیں۔ اسی لئے تو علی سفیان آفاقی وہ نظر بچا پائے ہیں جو دنیا کے کسی بھی اجنبی ملک میں جا کے وہاں کی بودو باش، قدرتی نظاروں اور تاریخی مقامات کا عمیق جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ وہاں کے باشندوں کی دلچسپ عادات و خصائل کی بھی ٹوہ لگا لیتی ہے۔

مصر کی سانولی سلونی دھرتی پر اترتے ہی علی سفیان آفاقی کے پاکستانی دل کو یہ دیکھ کر طمانیت کا احساس ہوتا ہے کہ مصری بھائی بھی کام کرنے کے معاملے میں پاکستانیوں جیسے ہی ہیں۔

مگر نیل کے اسرار کسی بھی سیاح پر رفتہ رفتہ کھلتے ہیں' قلو پطرہ کا عشاق کے دلوں پر بجلیاں گراتا حسن اب ماضی کی رداؤں میں پوشیدہ ہو چکا مگر اس کی جھلکیاں اب بھی قاہرہ کے شب و روز میں جا بجا نظر آتی ہیں۔ قاہرہ کے نائٹ کلب میں جا کے بٹ صاحب اور خاں صاحب تورقاصہ کی اداؤں میں گم ہو جاتے ہیں مگر علی سفیان آفاقی بڑی حیرت سے یہ نظارہ دیکھتے ہیں کہ ان کے آس پاس بہت سے مصری خاندان بیٹھے پورے ذوق و شوق کے ساتھ رقص و نغمہ سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ ان خاندانوں میں بچے بھی ہیں' بڑے بھی' نوجوان لڑکے اور لڑکیاں بھی والدین کے ساتھ موجود ہیں۔

قاہرہ کی گلیوں اور بازاروں میں گھومتے ہوئے بھی علی سفیان آفاقی کو پاکستان کی گلیاں اور کوچے نہیں بھولتے وہ ان جگمگاتے گلی کوچوں کو دیکھ کر بڑے خلوص سے خواہش کرتے ہیں کہ کاش ہماری سڑکیں بھی اسی طرح روشنیوں سے جگمگاتیں' خوشبوؤں سے مہکیں۔

ابوالہول' مصر کا ایسا اسرار ہے جو اپنے اندر ایک عجیب ہیبت اور جلال سموئے ہے۔ قاہرہ جا کے اس کا درشن نہ کرنا' کسی سیاح کے لئے ممکن ہی نہیں۔

وہاں کے لائٹ اینڈ ساؤنڈ شو کا جو سماں علی سفیان آفاقی نے الفاظ کے ذریعے باندھا ہے وہ قاری کو انہیں فضاؤں میں لے جاتا ہے ایک پل کے لئے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے فرعونوں کی روحیں آپ کے ارد گرد محو خرام میں اور ابوالہول کی کہانی فقط بیان نہیں کی جا رہی بیت رہی ہے۔

اس سفرنامے میں دراصل مصر کے دو سفروں کا حال بیان کیا گیا ہے جن میں پہلا سفر علی سفیان آفاقی نے فلم یونٹ کے ہمراہ کیا جب کہ دوسرا سفر انہوں نے اپنے دوستوں بٹ صاحب اور خان صاحب کی ہمراہی میں کیا۔

ہمسفر بدلنے سے روداد سفر کس طرح بدل جاتی ہے اس کا احساس قاری کو یہ کتاب پڑھنے کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔

پروین ملک

۳۰ اپریل ۱۹۹۷ء

پہلی پہلی نواسی عرفہ کے نام
جس کی پیدائش سے پہلے یقین ہی
نہیں تھا کہ واقعی سود اصل سے زیادہ پیارا ہوتا ہے

1

ہمیں مختلف اوقات میں دوبار قاہرہ جانے کا اتفاق ہوا۔ تیسری بار بھی جانے کی حسرت رہی مگر شاید یہ حسرت اس لئے پوری نہ ہو سکی کہ ہم نے دریائے نیل کے پانی میں تین سکے نہیں پھینکے تھے۔ کسی شہر میں باربار آنے کے سلسلے میں ہر ملک کے لوگوں نے مختلف روایات بنا رکھی ہیں۔ مثلاً روم میں اگر آپ "فونٹین ری وی وی" میں تین سکے پھینک کر دوبارہ آنے کی خواہش کریں گے تو آپ اگلی بار بھی روم ضرور آئیں گے۔ اسی طرح جنیوا کی جھیل کے بارے میں بھی وہاں یہی روایت مشہور ہے۔ کہ جب قاہرہ گئے تو ایک مصری نے اطلاع دی کہ اگر دوبارہ قاہرہ آنے کی خواہش رکھتے ہو تو چپ چاپ تین سکے دریائے نیل میں ڈال دو اور پھر خدا کی ذات کا تماشا دیکھو۔

"اس سے کیا ہوگا؟" خان صاحب نے بلاوجہ سوال کر دیا۔

مصری نے کہا "یہ ہوگا کہ کم از کم اگلی بار آپ پھر قاہرہ تشریف لے آئیں گے۔"

"کیا سرکاری خرچ پر؟" خان صاحب نے خوش ہو کر پوچھا۔

بٹ صاحب نے فوراً انہیں کہنی مار کر مطلع کیا کہ وہ پٹڑی سے گئے ہیں۔
ادھر مصری حیران ہو کر ہم لوگوں کی صورت دیکھ رہا تھا۔ وہ "سرکاری خرچ" والی بات نہیں سمجھا تھا۔ بڑی مشکل سے ہم نے اسے آسان انگریزی میں "سرکاری خرچ" کے معنی سمجھائے۔ خلاصہ یہ تھا کہ اگر آپ حکومت یا کسی اور کے خرچے

پر کہیں جائیں تو اسے سرکاری خرچ کہتے ہیں۔ وہ اس بات پر حیران تھا کہ آخر حکومت کو کیا پڑی ہے کہ کسی کو اپنے خرچ پر قاہرہ روانہ کرے لیکن مزید تفصیلات بتانا لاحاصل تھا کیونکہ وہ ہماری شاہ خرچ حکومتوں کے اس انداز کو سمجھ ہی نہیں سکتا تھا۔ بہرحال مصری تو سمجھا یا نہ سمجھا مگر اس کے بعد کافی دیر تک خان صاحب اور بٹ صاحب کے مابین یہی موضوع گفتگو رہا۔

"بھائی یہ تمہاری بہت خراب عادت ہے کہ اپنے ملک کے قومی راز دوسروں کو بتا دیتے ہو۔"

"اس میں کون سا راز ہے؟ سب جانتے ہیں کہ ہماری حکومتیں نہایت فراخ دلی سے سرکاری افسروں یا اپنے دل پسند لوگوں کو اکثر وبیشتر...... دنیا بھر کی سیر کراتی ہیں۔ انہیں حج اور عمرے کراتی ہیں۔ ان کو علاج کیلئے باہر کے ملکوں میں بھیجتی ہیں۔ یہ تو ایک کھلی ہوئی بات ہے۔"

اس کے باوجود خان صاحب کا کہنا تھا کہ یہ ملک وقوم کے ساتھ ناانصافی کے مترادف ہے کہ آپ اپنے اندرونی معاملات باہر کے لوگوں کو بتائیں۔ جب کافی دیر تک یہی موضوع بحث جاری رہا تو بٹ صاحب نے تنگ آکر صلح کی جھنڈی دکھا دی اور کہا "ٹھیک ہے بابا۔ آئندہ نہیں بتائیں گے۔ غلطی ہوگئی' معاف کردو۔"

اس کے بعد خان صاحب کے پاس چپ رہنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا اور آپ جانتے ہیں کہ ایک چپ ہزار دلیلوں پر بھاری ہوتی ہے لیکن بہت کم لوگ اس سنہری مقولے پر عمل کرتے ہیں۔

ہم یہ بتا رہے تھے کہ ہم زندگی میں دوبار قاہرہ گئے ہیں اور تیسری بار بھی جانے کی حسرت رہی لیکن غلطی یہ ہوئی کہ ہم دوسری بار گئے تو دریائے نیل میں سکے نہ پھینک سکے۔ کیونکہ ہمارے ہم سفر شباب کیرانوی نے ہمیں مشورہ دیا تھا کہ یار یہ سب فضول باتیں ہیں۔ دریائے نیل میں پھینکے جانے والے سکوں سے قاہرہ کے سفر کا بھلا کیا تعلق ہوسکتا ہے۔ سیاحوں کو بے وقوف بنانے کیلئے ہر ملک کے لوگوں نے یہ روایات گھڑلی ہیں۔

ہم نے کہا "ہم نے پاکستان میں کیوں ایسا نہیں کیا؟"

بولے " اس لئے کہ ہمارے ملک میں تو سیاح آتے ہی نہیں ہیں۔ گنتی کے چند سیاح آتے ہیں اور وہ بھی بس یوں ہی سے۔ ایسے لوگوں کو باربار بلانے کی کیا تک ہے۔ اس کے باوجود ہم نے سوچا کہ ہمیں بھی یہ روایت بنالینی چاہئے کہ جو کوئی دریائے راوی میں تین سکے پھینکے گا' وہ دوبارہ لاہور ضرور آئے گا۔

"مگر اتنی دور سکے پھینکنے کون جائیگا۔ آپ شاید بھول رہے ہیں کہ دریائے راوی لاہور شہر میں نہیں بہتا۔ نہ ہی وہاں کوئی دوسرا بندوست کیا گیا ہے کہ جسے دیکھنے کیلئے سیاح شہر سے اتنی دور محض سکے پھینکنے کیلئے جائیں۔ اس کی جگہ تو بہتر ہے کہ لاہور کی بادشاہی مسجد کے حوض میں سکے پھینکنے کی رسم شروع کردی جائے۔"

"یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟" ہمارے دوست اور ہم سفر حسن مہدی صاحب پریشان ہوکر بولے۔

"ارے بھائی ' اول تو بادشاہی مسجد میں غیر مسلموں کا داخلہ بند ہے۔ اگر سیاح وہاں جاکر مسجد کے حوض میں سکے پھینکنے شروع کردیں گے تو نمازیوں اور وضو کرنے والوں کی توجہ خواہ مخواہ اس طرف مبذول ہوجائے گی۔"

"اور ویسے بھی گندے سندے سکے مسجد کے وضو کرنے والے حوض میں پھینکنا' ایک طرح کا گناہ ہوگا" شباب کیرانوی نے فوراً مذہبی نقطہ نظر پیش کردیا۔

اوراس طرح یہ انتہائی مفید تجویز رفع دفع کردی گئی۔ دراصل بات یہ ہے کہ ہم پاکستانیوں کو سیاحوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ نہ ہی ہم انہیں کوئی اہمیت دیتے ہیں۔ ورنہ دنیا کے بے شمار ممالک میں سیاحت ایک باقاعدہ صنعت بن چکی ہے اور وہ سیاحوں کی آمد سے خطیر رقم وصول کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہمیں بتایا گیا تھا کہ مصر میں سیاحت آمدنی کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے۔ ملک میں کمائی کرنے والی صنعتوں میں اس کا نمبر دوسرا ہے۔ مصر ہی پر منحصر نہیں ہے' مشرق اور مغرب کے بہت سے ممالک سیاحوں کی وجہ سے خوب فائدہ اٹھاتے ہیں ۔ کروڑوں ' اربوں ڈالر کماتے ہیں اور اپنی معیشت کو ترقی دیتے ہیں۔ ہم پاکستانیوں کو اس قسم کی فضول اسکیموں پر وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس تیس سال پہلے تو پاکستان

کے بعض شہروں میں سیاح ٹائپ کے کچھ لوگ نظر بھی آجاتے تھے۔ لیکن اب تو یہ ڈھونڈے سے نہیں ملتے۔ اگر کوئی اکا دکا سیاح کراچی یا لاہور پہنچ بھی جاتا ہے تو اس کے ساتھ ٹیکسی والے ' ہوٹل والے اور دوسرے دکاندار ایسا سلوک کرتے ہیں کہ وہ دوبارہ یہ غلطی نہیں کرتا بلکہ اپنے ہم وطنوں کو انتباہ کردیتا ہے کہ وہ بھی اس کی غلطی سے سبق حاصل کریں۔ مردوں کی بات چھوڑیئے لیکن اگر کوئی بھولی بھٹکی سیاح خاتون ہمارے شہروں کی سڑکوں پر گھومنے پھرنے کیلئے نکل جاتی ہے تو سب مڑ مڑ کر اسے "عجوبہ" سمجھ کر دیکھنے لگتے ہیں۔ مرد حضرات تو یوں گھورتے ہیں جیسے بذریعہ نگاہ اس کا ایکسرے لے رہے ہیں۔ شاید اسی لئے ہمارے حکومت نے سیاحوں کے بارے میں حوصلہ شکنی کرنے کی اسکیم بنائی ہے۔ کہ نہ ہوگا بانس نہ بجے گی بانسری۔ نہ گوری گوری سیاح لڑکیاں ننگی ننگی ٹانگیں دکھانے کیلئے شہروں کی سڑکوں پر نکلیں گی' نہ لوگ انہیں گھوریں گے اور نہ ہی غیر ملکی لوگ ہمارے بارے میں افسوسناک تاثر قائم کریں گے اور لوگوں کا اخلاق بھی خراب نہیں ہوگا۔

بہرحال' یہ تو جملہ ء معترضہ تھا۔ ہم بیان کررہے تھے کہ ہمیں مصر جانے کا صرف دوبار ہی اتفاق ہوا۔ ان میں سے کوئی قیام بھی طویل نہ تھا۔ ایک بار ہم نے خان صاحب اور بٹ صاحب کی ہمراہی میں یہ سفر کیا اور دوسری بار چند احباب اور ہماری بیگم لبنیٰ ہمارے ساتھ تھیں۔ دونوں بار یہ سفر خاص طور پر نہیں کیا گیا تھا۔ یورپ سے آتے یا جاتے ہوئے قاہرہ میں قیام کرنے کا موقع مل رہا تھا۔ اس لئے سوچا کہ کیوں نہ اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اس طرح دونوں مرتبہ ہم نے بہت سے دلچسپ لوگوں کی معیت میں مصر کا دورہ کیا۔ بہتر ہوگا کہ پہلے ہم پہلے سفر کی روداد بیان کردیں جس میں خان صاحب اور بٹ صاحب ہمارے ہم سفر تھے۔

ہوا یہ کہ لندن سے واپسی پر ہمیں پی آئی اے کا ایک ایسا روٹ مل رہا تھا جس کے مطابق ہم قاہرہ میں اپنا سفر معطل کرسکتے تھے۔ یورپ کے شہر تو دیکھ لئے تھے۔ اب ایک مشرقی ملک دیکھنے کی سعادت نصیب ہورہی تھی تو سب اس نتیجے پر پہنچے کہ اس موقع کو ہاتھ سے نہیں گنوانا چاہیئے۔

" اسلامی ملکوں میں جانا تو ویسے بھی ثواب کا کام ہے" بٹ صاحب

بولے۔

"وہ کیوں ؟ آپ کو شاید یاد نہیں رہا کہ عمرہ اور زیارت مصر میں نہیں ہوتی۔ نہ ہی اہرام مصر کی زیارت کار "ثواب" ہے" خان صاحب نے اعتراض کیا۔

"آپ تو بال کی کھال نکالنا شروع کردیتے ہیں۔ یار میرا مطلب یہ تھا کہ وہ بھی ہماری طرح ایک اسلامی ملک ہے اور اپنے فرعونوں کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔"

"لیکن آپ کو شاید معلوم نہیں ہے کہ سب فرعون اب اللہ کو پیارے ہوچکے ہیں۔ البتہ ان کے مقبروں اور ممیوں سے آپ شرف ملاقات حاصل کرسکتے ہیں۔"

"آپ کو یہ تو معلوم ہوگا کہ جامع ازہر یونیورسٹی بھی قاہرہ میں ہے۔"

"جی 'معلوم ہے مگر کیا آپ اس میں داخلے کا ارادہ رکھتے ہیں؟ بھائی وہاں پڑھائی ساری عربی زبان میں ہوتی ہے اور آپ کی عربی صرف قل ہو اللہ اور الحمد اللہ تک پہنچ کر ختم ہوجاتی ہے۔"

اس سے پہلے کہ اس موضوع پر یہ بحث طول کھینچ جاتی ہم نے فوراً مصالحت کیلئے اپنی خدمات پیش کردیں۔ خان صاحب اور بٹ صاحب میں جھڑپیں تو جاری رہتی ہیں لیکن خوبی یہ ہے کہ دونوں فریق صلح صفائی کیلئے ہر دم تیار رہتے ہیں اور ان کی جنگ فی الفور بند ہوجاتی ہے۔ اگر دنیا کے دوسرے برسرپیکار ملک بھی اس پالیسی پر عمل پیرا ہوں تو ذرا سوچئے دنیا گہوارہ امن بن جائے کہ نہیں؟

اس سفر کا آغاز اس وقت ہوا جب ہم لندن میں پکاڈلی میں واقع ایک ٹریول ایجنٹ کے آفس میں گئے۔ یہ ٹریول ایجنسی ایک چھوٹی سی گلی میں تھی لیکن اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ یہ ایک پاکستانی کی تھی۔ لیکن جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا کہ خان صاحب کے نزدیک دراصل اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ پکاڈلی جیسے بارونق علاقے کے گردونواح میں واقع تھی۔ خان صاحب کی لندن کے دوران قیام میں یہ کوشش رہی کہ وہ جہاں کہیں بھی جائیں براستہ پکاڈلی جائیں۔ اس بہانے چلتے پھرتے خاصے رنگین نظارے دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔ پھر

ریستوران ' تھیٹر' نائٹ کلب اور سیروتفریح کے دوسرے ذرائع بھی یہاں دستیاب ہیں۔ سڑکوں پر سے گزرتے ہوئے بھی آپ یہ دیکھ سکتے ہیں۔ سینما گھروں پر پرکشش اوربعض اوقات قابل اعتراض تصاویر آراستہ ہوتی ہیں۔ کلبوں اور سامان نشاط کی دوسری دکانوں پر بھی نظروں کی ٹھنڈک پہنچانے کا سامان نظر آتا ہے۔ اس طرح آپ کسی بھی جگہ آتے جاتے مفت کی تفریح اور نظربازی کرلیتے ہیں۔ پہلے تو خان صاحب کی یہ مصلحت ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ آخر وہ ہر جگہ جانے کیلئے پکاڈلی سے ہی کیوں گزرنا چاہتے ہیں مگر رفتہ رفتہ بٹ صاحب پر ان کے ارادے واضح ہوگئے۔ بٹ صاحب نے دبی زبان سے ان پر کچھ ہوٹنگ تو ضرور کی لیکن اس منصوبے کی زیادہ مخالفت بھی نہیں کی۔ وہ بھی کہا کرتے تھے کہ اس بہانے ہم بہت سی شاپنگ اور ونڈوشاپنگ بھی کرلیتے ہیں لیکن اس بارے میں خان صاحب کا مشاہدہ یہ تھا کہ بٹ صاحب کی ونڈو شاپنگ دکانوں کے مال واسباب کو نہیں بلکہ سیلز گرلز اور خریدار خواتین کو دیکھنے تک محدود رہتی ہے۔ جہاں تک شاپنگ کا تعلق ہے وہ اس سلسلے میں عام طورپر اخبارات اور میگزینوں کی دکانوں اور کھوکھوں کے سامنے کھڑے پائے جاتے تھے۔ بٹ صاحب کو مطالعے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اخبارات پڑھنا وہ وقت کا زیاں سمجھتے تھے بلکہ وہ ان لوگوں کے بھی مخالف تھے جو بلاوجہ اخبارات پر اتنا روپیہ ضائع کردیتے ہیں۔ مگر ان کیلئے یہ خیالات اپنے ملک کی حد تک تھے۔ ملک سے باہر ہم نے اکثر انہیں اخبارات ورسائل کی دکانوں کے سامنے ہی کھڑے پایا ۔ ان دکانوں پر میگزینوں کے ڈھیر لگے ہوتے ہیں اور وہ تمام میگزین جن کی درآمد پاکستان میں ممنوع ہے' کھلے عام پڑے رہتے ہیں۔ خان صاحب کی ریسرچ یہ تھی کہ بٹ صاحب دراصل ان میگزینوں کی صرف تصویریں دیکھتے ہیں۔

"آپ کا کیا مطلب ہے؟" وہ ناراض ہوکر کہتے" کیا میں پڑھنا نہیں جانتا؟"

"مگر بھائی جان ۔یہ سب تو انگریزی زبان میں ہوتے ہیں۔"

"توپھر کیاہوا۔ میں انگلش میڈیم اسکول میں تو نہیں پڑھا مگر انگلش جانتا

ہوں۔"

"چھوڑویار۔ ابھی امتحان لے لیاتو فیل ہوجاؤگے۔ البتہ تصویریں دیکھنے کے لئے زبان جاننا ضروری نہیں ہوتا۔ آپ ہر زبان کے میگزین کی تصویریں بڑے اطمینان سے دیکھ سکتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ آپ صاحب تصویر کا نام نہیں پڑھ سکیں گے۔"

چنانچہ ہم اس روز بھی براستہ پکاڈلی اس عقبی گلی میں گئے جہاں ٹریول ایجنسی کا دفتر واقع تھا۔ اس ٹریول ایجنسی کے بارے میں ہم اس سے پہلے کچھ نہیں جانتے تھے مگر جب سے خان صاحب کے پاکستانی دوست کی زبانی یہ سنا تھا کہ اس ایجنسی میں صرف لڑکیاں کام کرتی ہیں' اس وقت سے وہ مصر تھے کہ ہمیں اپنی قومی ٹریول ایجنسی کو خدمت کا موقع دینا چاہیے۔

"ٹریول ایجنسیاں تو اور بھی ہیں" ہم نے کہا۔

"مگروہ پکاڈلی میں نہیں ہیں۔ دیکھیں نا پکاڈلی کے نام کا تو سننے والے پر بھی رعب پڑتا ہے۔ معمولی آدمی تو یہاں شاپنگ اوربکنگ نہیں کرتے۔"

ٹریول ایجنسی کا دفتر دوسری منزل پر تھا اور وہاں تک جانے کیلئے پتلی پتلی سیڑھیاں موجود تھیں۔ جب سیڑھیوں سے گزر کر مختصرہال کمرے میں پہنچے تو پاکستانی دوست کے بیان کی تصدیق بھی ہوگئی۔ کمرے میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک تمام میزوں پر حسینان فرنگ جلوہ گر تھیں اور ایجنسی کے مالکان کے معیار حسن کی داد دینی پڑتی تھی۔

خان صاحب اور بٹ صاحب یہ ماحول دیکھ کر خوش ہو گئے۔ ہم نے دبی زبان سے کہا۔"ان سے بات کرنے کی کوشش نہ کرنا۔"

"کیوں' کیا پابندی ہے؟"

"پابندی تو نہیں ہے مگر ان کی برطانوی لب ولہجے والی انگریزی آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گی اور آپ باقی وقت میں"آئی بیگ یورپارڈن"ہی کہتے رہیں گے۔"

دونوں حضرات نے ہمیں خونخوار نظروں سے گھورا مگر حقیقت یہ ہے کہ

اس وقت تک ان کی انگریزی صیقل نہیں ہوئی تھی۔ بولنا تو خیر جان جوکھوں کا کام تھا ہی، سمجھنا اس سے زیادہ مشکل کام تھا۔ انگریزوں کا لب ولہجہ امریکیوں سے مختلف ہوتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ الفاظ اور فقروں کے ٹکڑے کر رہے ہیں۔ آپ سمجھیں یا نہ سمجھیں، ان کی بلا سے۔

خان صاحب نے سرگوشی کی"بھائی آخر ان کے دفتر میں کوئی تو پاکستانی ہوگا؟"

ہم نے کہا"مالک کے سوا کوئی پاکستانی نہیں ہے۔"

"بس تو پھر ہم مالک سے ملیں گے۔ وہ بھی اپنے ہم وطنوں کو دیکھ کر خوش ہوجائے گا۔"

"ایکسکیوزمی سر" ایک دوشیزہ ہم سے مخاطب تھیں"میں آپ کی کیا خدمت کرسکتی ہوں۔" اب ظاہر ہے کہ ہم وہاں ٹکٹوں کے سلسلے میں ہی جاسکتے تھے اس لئے کسی اور خدمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا مگر یہ ان لوگوں کا مخاطب کرنے کا انداز ہے۔

ہم نے کہا"کیا ہم ایجنسی کے پروپرائٹر سے مل سکتے ہیں؟"

"آپ نے ان سے اپائنٹ منٹ لیا ہے؟"

"جی نہیں۔ آپ ہمارا یہ کارڈ ان تک پہنچا دیں، شکریہ۔"

وہ جب کرسی سے اٹھیں تو ایسا محسوس ہوا جیسے آفتاب طلوع ہورہا ہے اور پھر جب لہراتی ہوئی اونچی ایڑی کی جوتی کے طفیل کھٹ کھٹ کرتی ہوئی چلیں تو باقی کسر بھی پوری ہوگئی۔ یعنی وہ جو شاعر کہتے ہیں کہ قیامت آگئی تو درست ہی کہتے ہیں اور جن پاکستانی دوست نے اس ٹریول ایجنسی کا حوالہ دیا تھا، وہ بھی حق بجانب ہی تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اتنی مختصر سی جگہ میں اتنی بہت سی خوبصورت خواتین کا اجتماع بھی بجائے خود ایک تحقیقی کام کے مترادف تھا۔ اس اثنا میں ایک اور خاتون نے ہمیں بڑے اخلاق کے ساتھ سامنے رکھے ہوئے بیضوی صوفوں پر بیٹھنے کی دعوت دی ۔ ان صوفوں کو ہم درحقیقت ابھی تک دیکھ ہی نہیں پائے تھے۔ یا یہ کہئے کہ ابھی انہیں دیکھنے کی نوبت ہی نہیں آئی تھی۔ انہوں نے یاد دلایا تو

ہمیں بھی یاد آگیا اور ہم تینوں صوفوں پر براجمان ہوگئے۔ ایک اور خاتون نے کام کرتے ہوئے ہمیں کن انکھیوں سے دیکھا اور مسکرائیں بھی۔

خان صاحب بولے"یہ ہمیں بہت اہم شخصیت سمجھ رہی ہیں۔ ہم مالک سے ملنے جارہے ہیں ورنہ ٹکٹ بک کرانے والوں کی خدمت کیلئے تو یہ خواتین ہی کافی ہیں۔"

"بلکہ کافی سے زیادہ ہیں"بٹ صاحب نے لقمہ دیا۔

ہم نے کہا"بھائی، آپ کسی خوش فہمی کاشکار نہ ہوں۔ ان سب کو اب تک یہ معلوم ہوچکاہوگا کہ کوئی پاکستانی مسافر عملے کے لوگوں سے بات کرنا پسند نہیں کرتا۔ اسے کسرشان سمجھتا ہے۔ اس لئے وہ براہ راست مالک سے ملنے کی کوشش کرتا ہے۔"

اتنی دیر میں وہ قیامت بداماں خاتون سامنے والے دروازے سے برآمد ہوئیں اور مسکراتے ہوئے اطلاع دی کہ"آپ اندر جاکر ان سے مل سکتے ہیں۔"

پاکستانی پروپرائٹر خاصے شاندار آدمی تھے۔ باتونی بھی تھے اور خوش اخلاق بھی۔ ہم سے غائبانہ واقف تھے اس لئے فوراً" کافی کا آرڈر دے دیا۔ وہ بظاہر بالکل خالی اور بے کار نظر آرہے تھے مگر ہم نے اخلاقاً" ان سے کہا کہ آپ کو ڈسٹرب کرنے کی معذرت چاہتے ہیں مگر پردیس میں کسی پاکستانی سے ملنا بھی ایک سعادت سے کم نہیں ہے۔ وہ بولے"میرا بھی یہی حال ہے، مجھے پاکستانی دوستوں سے مل کر اور ان کی خدمت کرکے بے حد خوشی ہوتی ہے اور سنائیے!"

"اور سنائیے" کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ تکلف ترک کرکے حرف مدعا زبان پر لائیں۔ ہم فوراً" اصل موضوع پر آگئے۔انہیں بتایا کہ پی آئی اے کے مسافر ہیں اور واپسی پر کوئی ایسا روٹ چاہتے ہیں کہ جہاں سفر معطل کرکے چند روز ٹھہرسکیں۔ انہوں نے فوراً" اپنے سامنے پھیلے ہوئے چارٹ کا مطالعہ شروع کردیااور اس کے بعد مختلف راستے بتانے شروع کردیئے۔ کوئی براستہ استنبول تھا توکوئی یورپ کے کسی ملک سے گزرتا تھا۔ جب انہوں نے بتایا کہ ہم قاہرہ میں بھی رک سکتے ہیں تو خان صاحب نے فوراً" اس کی حمایت میں گردن ہلا دی۔

مالک کانام صدیقی یا صابری ٹائپ کاتھا۔ وہ بولے "میری مانئے تو استنبول کے راستے جائیے۔ استنبول بہت خوبصورت شہر ہے۔ مشرق اور مغرب کا سنگم ہے۔"

خان صاحب نے کہا"دیکھئے جناب' مغرب تو ہم نے خوب اچھی طرح دیکھ لیاہے۔ اب اس کی نقل دیکھنے کاکیا فائدہ ؟قاہرہ ایک تاریخی شہر ہے۔ عالم عرب کا مرکز ہے۔ میرے خیال میں تو یہ راستہ مناسب رہے گا۔"اس کے بعد انہوں نے تصدیق کیلئے ہماری طرف دیکھا۔ ہم نے بھی گردن ہلا دی۔بٹ صاحب نے بھی پرزور تائید کی۔ بعد میں اس کی وجہ یہ بتائی کہ سنا ہے کہ قاہرہ کے کلبوں میں بیلے ڈانس ہوتا ہے جو کسی اور جگہ دیکھنے میں نہیں آتا۔

پوچھا"بیلے ڈانس میں آپ کو کیا دلچسپی ہے؟"

بولے"سناہے کہ اس سے بہت اچھی ورزش ہوجاتی ہے اور پیٹ نہیں بڑھتا۔"

خان صاحب بولے"مگر محض ڈانس دیکھنے سے تو آپ کو کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ جب تک آپ خود بھی ڈانس نہ کریں اور اتنے مختصر سے قیام میں آپ بیلے ڈانس سیکھیں گے کیسے؟"

بولے" بھائی کچھ سمجھا کرو۔ قاہرہ میں جو دیکھیں گے' پاکستان میں جاکر اس کی مشق کرلیں گے۔"

صابری یا صدیقی صاحب نے ہمارے لئے براستہ قاہرہ بکنگ کرنے کی ہامی بھر لی اور ساتھ ہی یہ وضاحت بھی کردی کہ یہ قیام آپ کے اپنے خرچے پر ہوگا۔یہ نہ سوچئے گا کہ پی آئی اے والے آپ کومہمان رکھیں گے۔ اس طرح ہمارے سفر قاہرہ کا پروگرام طے ہوگیا۔ اس اثناء میں صدیقی صاحب نے ہمیں کافی کے ساتھ پیٹیز اور بسکٹ بھی منگا دیئے تھے لیکن ہمارا تو محض بہانہ تھا۔ وہ خود ہم تینوں سے زیادہ خوش خوراکی کا مظاہرہ کررہے تھے۔ ہماری حیرانی دیکھ کر بولے"دراصل میں لنچ نہیں کرتا۔ بس اسی طرح گزارہ کرلیتا ہوں۔"

اس کے بعد انہوں نے انٹرکام اٹھایا اور نہایت نستعلیق انگریزی میں کسی خاتون کو اندر آنے کی دعوت دی۔ اس بار جو خاتون اندر تشریف لائیں' وہ مختلف تھیں۔ صورت شکل اور شخصیت کے اعتبار سے وہ بھی کم نہ تھیں۔ لباس بھی دلکش تھا اور خوشبو بھی اچھی لگائی ہوئی تھی۔صابری صاحب نے انہیں مناسب ہدایات جاری کیں' اور یہ دریافت کرنے کیلئے کہاکہ اب ہمیں قاہرہ فلائٹ کب دستیاب ہوگی۔ قاہرہ سے کراچی کے لئے فلائٹ کب ملے گی وغیرہ وغیرہ۔ ان کی ہدایات سے زیادہ ہم لوگوں کی توجہ ان خاتون کی طرف تھی اس لئے پوری گفتگو نہ سن سکے۔

چند منٹ بعد وہ دوبارہ تمام تفصیلات کے ساتھ اندر تشریف لائیں۔ انہوں نے تمام ضروری معلومات ایک کاغذ پر درج کررکھی تھیں۔ یہ کاغذ انہوں نے صابری صاحب کے سامنے رکھ دیا جس کا مطالعہ کرنے کے بعد انہوں نے ہماری منظوری سے بکنگ کرا دی۔

پھرکہا"آپ لوگوں نے ہوٹل کی بکنگ تو کرائی ہی نہیں ہے اور یہ قاہرہ میں سیاحوں کا سیزن ہے۔"

ہم نے کہا "قاہرہ اتنا بڑاشہر ہے۔ آخر کوئی نہ کوئی ہوٹل تو مل ہی جائے گا۔"

بولے" اس گمان میں نہ رہئے۔ وہ جتنابڑا شہر ہے اس سے زیادہ سیاح وہاں جاتے ہیں۔ سوچ لیجئے۔ کہیں آپ کو زحمت نہ ہو۔"

ہم تو سارے یورپ میں ہوٹلوں کی بکنگ کرائے بغیر ہی گھومتے پھرے تھے اس لئے اس بات کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔

خان صاحب نے بڑے صوفیانہ اور فلسفیانہ انداز میں فرمایا"دیکھئے جناب' یہ تودانے پانی کا معاملہ ہے۔ اللہ نے ہماری قسمت میں قاہرہ کا دانہ پانی لکھ دیا ہے اسی لئے تو ہمیں وہاں بھیجنے کا بندوبست کردیا۔"

صابری صاحب اس شان درویشی سے خاصے مرعوب ہوئے' بولے"ارے صاحب۔ اللہ پر توکل کرنے والے ایسے لوگ آج کل ملتے کہاں ہیں؟مجھے آپ کے خیالات سن کر بے حد خوشی ہوئی ہے۔ میرے خیال میں اب ہمیں اس بات پر کافی

کی ایک ایک پیالی اور پی لینی چاہیے۔"

ہم نے کہا"کیا آپ کے دفتر میں چائے نہیں ملتی؟"

بولے"کیوں نہیں۔ آپ کہتے ہیں تو چائے منگا لیتے ہیں۔"

یہ کہہ کر انہوں نے پھر انٹرکام پر چائے اور لوازمات کا آرڈر دے دیا۔ جتنی دیر میں چائے آئی' ہم لوگ پاکستان کی باتیں کرتے رہے۔ صابری صاحب پاکستان کے بارے میں بہت کرید کرید کر پوچھتے رہے اور ہم بھی انہیں تازہ ترین حالات سے مطلع کرتے رہے کہ آخر ایک غریب الوطن پاکستانی ہیں۔

"آپ کو پاکستان گئے ہوئے کتناعرصہ ہوگیا؟" بٹ صاحب نے پوچھا۔

وہ بولے " ابھی دس دن پہلے واپس آیاہوں۔میں ہر دو تین ماہ بعد پاکستان کاچکر لگاتا رہتا ہوں۔"

ہم کچھ شرمندہ ہوگئے۔

چائے وہی خاتون لے کر آئیں جو سفر کاپروگرام لے کر آئی تھیں۔ ہم سب کیلئے ان کے پاس ایک دلکش مسکراہٹ تھی۔ چائے کے ساتھ بھی بسکٹ اورپنیر کی کافی مقدار موجود تھی۔ اس بار خان صاحب اور بٹ صاحب نے ذرا سا بھی تکلف نہ برتا اور خوب ہاتھ صاف کیا۔ بے چارے صابری صاحب کے حصے میں پنیر کے دو ٹکڑے اور ایک بسکٹ ہی آیا۔ اتنی دیر میں ہمارے ٹکٹ بھی آگئے تھے۔ ہم نے صابری صاحب کا بے حد شکریہ ادا کیا اور ان سے وعدہ کیا کہ آئندہ جب سفر کریں گے' ان ہی کی ایجنسی کی خدمات حاصل کریں گے۔

جب ہم رخصت ہونے لگے تو صابری صاحب نے کہا " اگر گنجائش ہوتو میرا کچھ سامان بھی ہمراہ رکھ لیں۔آپ لاہور پہنچ کر فون کریں گے تو میرے گھر والے خود ہی آکر لے جائیں گے۔"

سامان کا مسئلہ غیر ملکی سفر میں ہمیشہ تکلیف دہ ثابت ہوتا ہے۔ اول تو مسافر پہلے ہی لدے پھندے ہوتے ہیں۔ اس پر دوست احباب بھی تھوڑا تھوڑا سامان یہ کہہ کر حوالے کردیتے ہیں کہ "بہت تھوڑا سا ہے۔ آپ کو کیا فرق پڑتا ہے؟"

اب یہ بالکل نئے ملاقاتی بھی کچھ سامان ہمارے سپرد کرنا چاہتے تھے۔ ہم نے تجربات کے بعد یہ نچوڑ نکالا ہے کہ پاکستان سے باہر جاتے ہوئے اور وہاں سے واپس آتے ہوئے کسی کو اپنے سفر کے بارے میں نہ بتائیں ورنہ نتیجہ بھگتنے کے لئے تیار ہوجائیں۔ صابری صاحب نے ہمارے ساتھ اتنے خلوص کا مظاہرہ کیا تھا کہ انکار کرنا مناسب نہ لگا۔ ان کا یہ فیور کیا کم تھا کہ ہم نے ان سے ٹکٹ نہیں بنوائے تھے مگر انہوں نے بڑی خندہ پیشانی سے ہماری مدد کی تھی۔

ہماری رضا مندی پر انہوں نے اپنی میز کے نچلے حصے میں ہاتھ ڈالا اور ایک خاصا تندرست پیکٹ نکال کر ہمارے سامنے رکھ دیا۔ ایک تو پیکٹ خاصا بڑا تھا ۔ دوسرے وزن میں چار پانچ کلو سے کم نہ تھا۔

ہم نے جھجکتے ہوئے کہا" اتنے بڑے پیکٹ کیلئے تو ہمارے سوٹ کیسوں میں جگہ نہیں ہوگی۔"

مسکرا کر بولے"ارے صاحب آپ اسے ہاتھ میں اٹھالیجئے گا۔ ہلکا ساتوہے" ہماری پوزیشن یہ تھی کہ سوٹ کیسوں کے علاوہ ہاتھ میں اٹھانے والا سامان بھی کچھ کم نہ تھا' اب ظاہر ہے کہ ہمارے صرف دو ہاتھ تھے۔ ان ہاتھوں میں کوئی کتنا سامان اٹھا سکتا تھا لیکن صابری صاحب خاصے معقول آدمی ثابت ہوئے۔ شاید اس لئے کہ پندرہ بیس سال سے لندن میں قیام پذیر تھے۔ ہم لوگوں کے چہروں کے تاثرات دیکھے تو انہوں نے بلا تامل وہ پیکٹ اٹھاکر واپس رکھ لیا اور بولے"کوئی بات نہیں ہے۔ میرے پاس تو مسافر آتے ہی رہتے ہیں اور میں خود بھی پاکستان کا چکر لگاتا رہتاہوں۔"

ان کی اس معقولیت پسندی پرتو ہم واقعی ان کے گرویدہ ہوگئے۔ ان سے اجازت لینے کے بعد دفتر سے باہر نکل کر گلی میں پہنچے تو خان صاحب بولے"اس شخص کی دوباتیں قابل تعریف ہیں۔"

"وہ کیا؟"

"ایک تو اس کی سمجھ داری اور دوسرے اسٹاف کی لڑکیاں۔"

بٹ صاحب نے تبصرہ کیا"خاک سمجھ دار ہے۔ اللہ کے بندے نے

اسٹاف میں ایک بھی پاکستانی نہیں رکھا ہے۔ یہ ملک سے غداری نہیں تو اور کیا ہے؟؟"

لیجئے' اتنی سی بات پر بے چارے پر "غداری" کا الزام لگ گیا۔ دراصل ایک دوسرے کو غدار قرار دینے کے معاملے میں ہم پاکستانی کچھ زیادہ ہی کشادہ دل واقع ہوئے ہیں۔

تیسرے دن ہم ہیتھ رو ایرپورٹ پر پی آئی اے کی فلائٹ کا انتظار کررہے تھے۔ بٹ صاحب خاصے فکر مند تھے "سنیں 'وہاں کوئی خطرہ تو نہیں ہوگا؟"

"کیسا خطرہ؟"

"یہی فلسطینیوں کا۔ سنا ہے ان لوگوں کے ہنگامے جاری رہتے ہیں۔"

"آپ نے آج کا اخبار نہیں پڑھا؟"

"پڑھا تھا۔"

"اس میں مصر کے بارے میں کوئی خطرناک خبر تھی؟"

"نہیں۔"

"تو پھر پریشانی کی کیا بات ہے ' اللہ کا نام لو اور چل پڑو۔"

لاؤنج میں بیٹھے ہم سیر دیکھ رہے تھے ۔ بھانت بھانت کی بولیاں اور دیس دیس کے لوگ۔ یورپی ہوائی اڈے اس لحاظ سے تفریح گاہیں قرار دیئے جاسکتے ہیں کہ وہاں بیٹھ کر آپ بور نہیں ہوسکتے۔ خوب صورت چہرے' مختلف قسم کے لوگ اور ملبوسات' خوشبو سے مہکتی ہوئی خواتین' ہر کوئی اپنے اپنے مسائل میں کھویا ہوا۔ نظم وضبط بھی قابل تعریف ہوتا ہے۔ نہ شور' نہ ہنگامہ ۔

ایرپورٹ کے بیرونی لاؤنج میں بھی استقبال کرنے والوں اور الوداع کہنے والوں کے ہجوم نظر نہیں آتے اس لئے ماحول بہت خوشگوار ہوتا ہے۔

بٹ صاحب بار بار پوچھ رہے تھے کہ کیا قاہرہ میں ہماری ممی سے بھی ملاقات ہوگی؟

" ملاقات کا کیا مطلب! وہ کوئی زندہ لوگ تو نہیں ہیں۔ لاشیں ہیں لاشیں۔ جنہیں مسالہ وغیرہ لگا کر اس طرح محفوظ کیا گیا ہے کہ سالہا سال گزر جانے کے بعد

بھی وہ صحیح سلامت ہیں۔"

"یار بس کرو ۔ میں اب اتنا جاہل بھی نہیں ہوں۔ اصل ممی اور مصری ممی کا فرق جانتا ہوں۔"

ہمیں اس پر شفیق الرحمان کا لکھا ہوا ایک لطیفہ یاد آگیا۔ انہوں نے ایک صاحب کا تذکرہ لکھا تھا جو خود کو بہت زیادہ عالم فاضل ظاہر کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ ان کا مطالعہ اور معلومات بہت زیادہ ہیں۔ ایک بار وہ مصر کا دورہ کرکے آئے تو جھوٹ سچ بے شمار گپیں بھی گھڑ لائے۔

کسی نے پوچھا "ابوالہول کے بارے میں اپنے تاثرات بتایئے۔"

بولے" ان سے تو میری کئی بار ملاقات ہوئی۔ بہت بااخلاق بزرگ ہیں۔ ایک بار انہوں نے مجھے کھانے پر بھی بلایا تھا۔"

اب خدا جانے وہ واقعی مصر بھی گئے تھے یا محض رعب ڈال رہے تھے۔

جہاز کا سفر خاصا پرسکون اور خوشگوار گزرا ۔ پرواز بہت اچھی تھی۔ مسافر بھی برے نہیں تھے۔ زیادہ تعداد غیر ملکیوں کی تھی جن میں کچھ عرب بھی تھے۔ غیر ملکی فضائی کمپنیوں میں سفر کرنے کے بعد خان صاحب کو پی آئی اے کی ایر ہوسٹس بالکل پسند نہیں آرہی تھیں"یہ بھی کوئی لباس ہے' ایر ہوسٹس سے زیادہ کوئی گھریلو خاتون لگتی ہیں۔ یار' اگر گھر کا ماحول ہی دیکھنا ہوتو پھر ہوائی جہاز میں سفر کرنے کا کیا فائدہ؟"

بٹ صاحب نے کہا"فائدہ یہ ہے کہ ہوائی جہاز ہوا میں سفر کرتا ہے جبکہ گھر وہیں کا وہیں رہتا ہے اور پھر گھر میں عام طور پر ایک ہی خاتون ہوتی ہیں جبکہ یہاں چار چار موجود ہوتی ہیں۔"

"جس گھر میں چار بیویاں ہوتی ہیں وہاں گھر والا اتنے آرام سے بیٹھا ہوا نظر نہیں آتا جیسے کہ ہم یہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔"

کھانا جیسے ہی ختم ہوا' سونے کا اہتمام کردیا گیا۔ پہلے تو ہوائی جہاز والوں نے اسکرین لگادیئے اور فلم دکھانے کا بندوبست کردیا۔ اس کے بعد جہاز کی بیشتر روشنیاں بجھا دی گئیں۔ کچھ مسافر فلم دیکھنے میں مصروف ہوگئے۔ باقی سو گئے۔ فلم

خاصی بور تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ فلم دیکھنا چاہتے تھے کچھ دیر بعد انہوں نے بھی جماہیاں لینی شروع کردیں اور سوگئے۔ شاید پی آئی اے والوں کا مقصد بھی یہی تھا۔ خان صاحب نے بھی منہ کھول کھول کر چند جماہیاں لیں اور نیند کی آغوش میں کھوگئے۔ بٹ صاحب اس سے پہلے ہی خواب خرگوش کے مزے لینے میں مصروف تھے۔ ہماری مشکل یہ ہے کہ ہمیں فضائی سفر میں نیند نہیں آتی۔ پہلے تو مجبوراً" فلم دیکھتے رہے مگر وہ اتنی اکتا دینے والی تھی کہ پھر ایک میگزین کا مطالعہ شروع کردیا۔ کچھ دیر بعد فلم بھی ختم ہوگئی اور ہوائی جہاز میں بالکل سناٹا چھا گیا۔ پرواز بہت ہموار تھی۔ آس پاس نیم تاریکی تھی جس میں کرسیوں پر مختلف انداز میں سوئے ہوئے لوگ پرچھائیوں کی طرح نظر آرہے تھے۔ مکمل سکوت طاری تھا۔

ہم نے میگزین کی دلچسپ خبریں پہلے ہی پڑھ لی تھیں۔ اب وقت گزاری کیلئے وہ مضامین بھی پڑھ رہے تھے جن میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ یکایک ایک عجیب سی آواز کانوں میں آئی۔ پہلے بہت ہلکی تھی' بعد میں کچھ بڑھ گئی۔ ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ آواز کیسی ہے اور کہاں سے آرہی ہے؟ مگر جب غور سے کان لگاکر سنا تو معلوم ہوا کہ اگلی سیٹ پر تشریف فرما ایک صاحب خراٹے لے رہے تھے۔ پہلے تو سوچا کہ کچھ دیر بعد خود ہی چپ ہوجائیں گے مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے جوش وخروش میں اضافہ ہونے لگا' یہاں تک کہ یہ آواز ہمارے لئے ناقابل برداشت ہوگئی۔ ہم نے کرسی سے اٹھ کر سامنے جاکر "صاحب خراٹا" کو دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ ایک موٹے تازے عرب تھے اور نہایت بے جگری سے خراٹے لینے میں مصروف تھے جب چاروں طرف سناٹا ہو اور سب لوگ سوئے پڑے ہوں' ایسے میں خراٹوں کی کرخت اور بے سری آواز کانوں کو بہت ناگوار گزرتی ہے۔ برداشت نہ ہوسکا تو ہم نے اپنی سیٹ سے اٹھ کر ائرہوسٹس کو تلاش کرنا شروع کردیا۔ ایک جگہ وہ بھی مل گئیں مگر اس عالم میں کہ سب کی سب سو رہی تھیں۔ سوچا' انہیں جگائیں کیسے ۔ دوبارہ اپنی سیٹ پر گئے اور کال بیل دبائی مگر کوئی جاگتا ہوتا تو روشنی دیکھ کر آتا۔ وہاں تو سب گھوڑے بیچ کر سورہے تھے۔ ادھر خراٹوں کی آواز میں خوفناک حد تک اضافہ ہوگیا تھا۔ اس سے پہلے بھی ہم نے ہوائی سفر کئے تھے مگر کسی مسافر کے خراٹے لینے کا یہ پہلا واقعہ پیش آیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ اس شہر خموشاں کی خاموشی کو برباد کرنے والے صاحب کو کیوں کر خاموش کرایا جائے۔ جب صورتحال ناقابل برداشت ہوگئی تو ہم دوبارہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ائرہوسٹس کے پاس گئے۔ انہیں جگانے کیلئے کرسی کے ہینڈل کو بجایا پھر انہیں آہستہ آہستہ پکارا ۔ شکر ہے کہ وہ زیادہ گہری نیند میں نہیں تھیں۔ آنکھ کھول کر جب ہمیں اپنے نزدیک پایا تو وہ اچانک گھبرا سی گئیں۔

ہم نے معذرت کرتے ہوئے کہا"معاف کیجئے گا' آپ کی ضرورت پیش آگئی ہے۔"

وہ سنبھل کر بولیں"توپھر کال بیل استعمال کی ہوتی۔"

ہم نے انہیں کال بیل کی روشنی دکھائی اور کہا"آپ سوتے میں تو کال بیل نہیں دیکھ سکتی تھیں۔"

" اوہ 'سوری" وہ بالکل ہوشیار ہوگئیں"کہئے' کس چیز کی ضرورت ہے؟"

ہم نے کہا"ہمارے سامنے والی سیٹ پر ایک صاحب بہت زور زور سے خراٹے لے رہے ہیں جس سے ہماری نیند خراب ہورہی ہے۔"

"توپھر' آپ کیا چاہتے ہیں؟" انہوں نے پوچھا۔

"آپ ان کے خراٹے بند کرادیں۔ بہت مہربانی ہوگی۔"

انہوں نے ایک لمحہ سوچا پھر اٹھ کر کھڑی ہوگئیں۔ خاصی اسمارٹ خاتون تھیں۔ صورت شکل بھی مناسب تھی۔ "آیئے میرے ساتھ " انہوں نے کہا اور چل پڑیں۔ ہم ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگے یہاں تک کہ اپنی جگہ تک پہنچ گئے۔ وہ وہاں پہنچنے سے پیشتر ہی خراٹوں کی آواز سن چکی تھیں۔ ہم دونوں خراٹے لینے والے صاحب کے پاس جاکر کھڑے ہوگئے ۔ وہ خاصے موٹے آدمی تھے۔ اتنے کہ انہوں نے سیٹ بیلٹ بھی کھول رکھی تھی۔ ان کی آنکھیں بند تھیں مگر منہ کھلا ہوا تھا اور وہ بڑے زوروشور سے خراٹے لینے میں مصروف تھے۔

"اب کیا کریں؟" انہوں نے ہم سے پوچھا۔

ہم نے کہا"انہیں جگا کرخاموش کرائیں۔"

پہلے تو وہ ہچکچائیں کیونکہ آس پاس کے تمام مسافر اس شور کے باوجود بڑی گہری نیند سوئے ہوئے تھے مگر پھر ہمارے جوش دلانے پر انہوں نے جھک کر ان صاحب کو مخاطب کیا"سنئے مسٹر...... ذرا میری بات سنئے۔" مگر مسٹر کو ہوش نہ تھا۔ انہوں نے دوبارہ ان کے کان کے پاس منہ لے جاکر کہا" یااخی! ذرا میری بات سن لیجئے۔"

اخی پر کوئی اثر نہ ہوا۔ انہوں نے مجبور ہوکر ہمیں دیکھا' ہم نے کہا"اگر اجازت دیں تو ہم انہیں جگانے کی کوشش کریں؟"

وہ گھبرا گئیں"کیا کریں گے' ان کے کان میں پھریری ڈالیں گے؟"

"ارے نہیں۔"

"تو پھر پانی کا گلاس ان پر ڈالیں گے؟"

" بالکل نہیں ۔ بس ذرا ہوشیار کرنے کی کوشش کریں گے۔"

"کرلیجئے" وہ بیزاری سے بولیں۔

ہم نے ان کا کندھا چھوا اور بلند آواز میں کہا" ایکسکیوزی"

انہوں نے کوئی اثر نہ لیا تو ہم نے ان کا شانہ ہلایا۔ وہ اچانک چونک پڑے۔ آنکھیں کھول دیں اور گھبرا کرانگریزی میں بولے"کون ہے؟ کیا ہے؟"

شکر ہے کہ انہوں نے فلمی انداز میں یہ نہیں پوچھا کہ میں کہاں ہوں؟

ہم نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر ائرہوسٹس کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ خاتون کو دیکھ کر ان کے چہرے سے پریشانی اور ناراضگی کے تاثرات غائب ہوگئے۔ بہت نرم لہجے میں کہا "ہیلو!"

ائرہوسٹس نے جواب میں کہا"آپ کے خراٹے آس پاس کے لوگوں کو ڈسٹرب کررہے ہیں۔"

" توکیا مجھے سونے کی بھی اجازت نہیں ہے؟"

"شوق سے سوئیں مگر خراٹے لے کر دوسروں کی نیند تو خراب نہ کریں۔"

کہنے لگے"مس۔ مجھے آپ کی بات سن کر بہت حیرت ہوئی ہے۔ مجھے تو آج تک کسی نے نہیں بتایا کہ میں خراٹے لیتا ہوں۔"

"مگرمیں آج آپ کو بتا رہی ہوں کہ آپ بہت زورزور سے خراٹے لیتے ہیں۔"

"حیرت کی بات ہے۔ آپ کہتی ہیں تو مان لیتا ہوں۔ اب خراٹے نہیں لوں گا۔"

ائرہوسٹس نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ ہمیں مسکرا کر دیکھا اور اپنا مشن پورا کرنے کے بعد واپس چلی گئیں۔ وہ صاحب ائر ہوسٹس کو جاتے ہوئے دیکھتے رہے اور پھر اس کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی دوبارہ آنکھیں موند کر سوگئے۔ ہم نے ابھی میگزین کھولا ہی تھا کہ ان کے فلک شگاف خراٹے دوبارہ شروع ہوگئے۔ الٰہی کیا کریں؟ اس مصیبت سے کیوں کر چھٹکارا حاصل کریں؟ جب برداشت نہ ہوسکاتو دوبارہ ائرہوسٹس کے پاس پہنچ گئے"ہیلومس!" ہم نے آہستہ سے کہا۔

انہوں نے فوراً" آنکھیں کھول دیں پہلے تو حسب عادت مسکرائیں پھر ہمیں پہچانا تو سنجیدگی سے پوچھا"اب کیا بات ہے؟"

ہم نے کہا "وہی صاحب دوبارہ خراٹے لے رہے ہیں۔"

ائرہوسٹس نے ایک لمحہ سوچا پھر ہم سے کہا" دیکھئے جناب! آپ کی طرح وہ بھی مسافر ہیں۔ انہوں نے بھی ٹکٹ خریدا ہے۔ اب میں بار بار انہیں سونے سے تو نہیں روک سکتی ۔"

"مگر آپ انہیں خراٹے لینے سے تو روک سکتی ہیں۔"

"کوئی صورت نہیں ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ آپ اپنی سیٹ بدل لیں۔"

ہم نے انکار میں سر ہلایا اور کہا" ہمارے دو اور ساتھی بھی ہمارے ساتھ ہی بیٹھے ہیں اور سو رہے ہیں۔ہم انہیں چھوڑ کرنہیں جاسکتے۔"

انہوں نے مجبور ہوکر شانے ہلائے گویا ص جواب دے دیا۔ ہم واپس اپنی سیٹ پر پہنچے تو ان صاحب کے خراٹے پہلے سے زیادہ بے سرے اور بے ہنگم ہوگئے تھے۔ آخر ہم نے بٹ صاحب کو جگانا مناسب سمجھا۔ وہ فوراً" ہوشیار ہوگئے۔"کیابات ہے؟"

ہم نے انہیں صورت حال بتائی بلکہ سنوائی۔ انہوں نے اٹھ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ان موٹے صاحب کے برابر کی ایک سیٹ خالی تھی۔ بٹ صاحب نے ہمیں تسلی دی اور اٹھ کر ان کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گئے پھر انہوں نے انگڑائی کے لئے ہاتھ پھیلائے اور اپنی کہنی ان کے پہلو میں چبھودی ۔ وہ صاحب ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھے مگر بٹ صاحب کو سوتا دیکھ کر کچھ کہہ نہ سکے۔ اب یہ معمول شروع ہوگیا کہ جیسے ہی وہ خراٹے شروع کرتے ' بٹ صاحب کسی بہانے سے اپنی کہنی مار کر انہیں ہوشیار کردیتے۔ یہاں تک کہ وہ بیزار ہوکر اپنی سیٹ سے اٹھے اور جہاز کے پچھلے حصے میں خالی ایک سیٹ دیکھ کر وہاں تشریف فرما ہوگئے ۔ اس طرح ہم ان کے خراٹوں سے محفوظ ہوگئے۔

صبح ہوئی تو ہوائی جہاز میں بھی رونق نظر آنے لگی۔ لوگوں نے جماہیاں لینی شروع کردیں' باتیں کرنے لگے' روشنیاں جگمگانے لگیں۔ سارا ماحول ہی بدل گیا۔

ناشتہ پیش کرنے کیلئے ٹرالیاں لے کر ائرہوسٹس گھومتی پھرتی نظر آنے لگیں۔ رات والی ائرہوسٹ جب ہمارے پاس ناشتے کی ٹرالی لے کر آئی تو ہمارے سامنے ناشتے کی ٹرے رکھتے ہوئے اس نے پوچھا"آپ نے ان صاحب کو سیٹ بدلنے پر کیسے رضا مند کرلیا تھا؟"

پہلے تو ہم نے کہا"انہیں سوتے میں چلنے کی عادت بھی ہے۔ وہ خود ہی اٹھ کر چلے گئے تھے۔"

وہ بولی"بتائیے نا آپ نے انہیں کیسے منایا؟"

ہم نے کہا"کہنیاں مار مار کر۔"

وہ حیران رہ گئی" مگر آپ یہاں بیٹھ کر اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے مسافر کو کہنیاں کیسے مارسکتے ہیں؟"

ہم نے بٹ صاحب کی طرف اشارہ کیا جو اگلی سیٹ پر بے خبر سو رہے تھے اور کہا" ہمارے دوست نے اپنی سیٹ بدل کر یہ کارنامہ سرانجام دیا تھا۔"

وہ مسکراتی ہوئی چلی گئی۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ قاہرہ پہنچنے کا

اعلان کیا گیا۔ سب نے کارڈ وغیرہ پر کرنے شروع کردیئے۔ حسب معمول اعلان کیا جارہا تھا کہ جب تک جہاز کے انجن بند نہ ہوجائیں مسافر اپنی جگہ پر بیٹھے رہیں مگر جیسے ہی جہاز نے لینڈ کرنے کے بعد اپنی رفتار کم کی ایک ہڑبونگ سی مچ گئی۔ پہلے ہم سمجھتے تھے کہ شاید ہم پاکستانی ہی بدنظمی پھیلاتے ہیں مگر بعد میں ہم نے دیکھا کہ عموماً" سبھی مسافر ایسا کرتے ہیں کہ ہوائی جہاز رکنے سے پہلے ہی سیٹوں سے کھڑے ہوکر اپنا سامان سمیٹنا شروع کردیتے ہیں ۔ چنانچہ اس روز بھی ایسا ہی ہوا۔ ابھی لوگ اپنا سامان اکٹھا کرہی رہے تھے کہ وہی موٹے خراٹے لینے والے عرب بھی آن پہنچے۔ ان کا سامان ہمارے سر کے اوپر ہی تھا۔ انہوں نے آکر اپنے برابر والی سیٹ کو دیکھا جو اس وقت خالی تھی کیونکہ بٹ صاحب ناشتے کے بعد واپس اپنی سیٹ پر تشریف فرما ہوگئے تھے۔ ان صاحب کی سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر وہ کون شخص تھا جو رات کو ان کے پیٹ میں کہنیاں مار رہا تھا۔ خالی سیٹ کو دیکھ کر وہ سوچ میں پڑ گئے پھر شاید سوچا ہوگا کہ یہ بھی کوئی خواب تھا۔

2

قاہرہ کا ائرپورٹ خاصا خوب صورت اور ماڈرن ہے لیکن یورپ کے شہروں کے مقابلے والی بات نہیں تھی۔ رونق اور چہل پہل تو مسافروں کے دم سے تھی جن میں زیادہ تعداد غیر ملکی سیاحوں کی تھی۔ امیگریشن لاؤنج میں گئے تو کچھ پھیکا پھیکا سالگا۔ اس پر رہی سہی کسر عملے کے لوگوں نے پوری کردی۔ نہ تو ان کی وردیاں دلکش تھیں اور نہ ہی لوگ اسمارٹ تھے۔ عملے کے قریب قریب تمام تر ارکان مرد تھے۔

خان صاحب نے چاروں طرف جائزہ لیا اور بولے ”معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پردے کا رواج بہت زیادہ ہے۔“

”آپ نے کیسے جانا؟“

”دیکھتے نہیں ' ہرطرف مرد ہی مرد نظر آرہے ہیں۔ یہ لوگ تو شاید عورتوں کو بھرتی ہی نہیں کرتے۔“

ہم نے کہا”خان صاحب ! یورپ میں آپ کی عادتیں خاصی بگڑ گئی ہیں۔ یہ مشرق ہے۔ یہاں آپ کو قدم قدم پر خواتین جلوہ گر نظر نہیں آئیں گی۔“

بولے ”ہم نے تو سنا تھا کہ قاہرہ مغربی شہر ہے“ پھر ایک آہ بھری”مگر مغربی والی بات دیسی لوگوں میں کیسے پیدا ہوسکتی ہے۔“

ہم سب پاسپورٹ پر ٹھپا لگوانے کے لئے قطار میں کھڑے ہوگئے۔ امیگریشن افسروں کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ اس لئے کافی لمبی لمبی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ اس پر ان کی سست رفتاری نے رہی سہی کسر بھی پوری کردی تھی۔ اہلکاروں کا رویہ قریب قریب ویسا ہی تھا جیسا ہم نے پاکستان میں دیکھا تھا۔ ایک دو حضرات سگریٹ نوشی میں مصروف تھے اور پاسپورٹ دیکھنے سے زیادہ سگریٹ کے کش لگانے میں دلچسپی لے رہے تھے۔ آپس میں گپ شپ کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ اس لئے قطاریں بہت آہستہ آہستہ حرکت کررہی تھیں۔

خان صاحب بولے”بھائی انہوں نے توپاکستانیوں کو بھی مات کردیاہے۔ اتنی سستی سے تو ہم بھی کام نہیں کرتے۔“

بٹ صاحب کافی دیر سے چپ تھے اور گہری نظروں سے ائرپورٹ کی عمارت کا جائزہ لینے میں مصروف تھے۔یکایک بولے”قاہرہ اتنا تاریخی شہر ہے۔ یہاں کے فرعون ساری دنیا میں مشہور ہیں مگر ائرپورٹ کوئی خاص نہیں ہے۔“

ہم نے کہا”بٹ صاحب' یہ ائرپورٹ کسی فرعون نے نہیں بنوایاتھا۔ یہ کوئی تاریخی عمارت نہیں ہے۔فرعونوں کے زمانے میں گھوڑے اور رتھ چلا کرتے تھے۔ اس لئے وہ لوگ ائرپورٹ بنانے کے قائل نہیں تھے۔ کہنے لگے ” پھر بھی ۔ آخر یہ لوگ ان ہی فرعونوں کے جانشین ہیں ۔“

خان صاحب نے کہا ” کسی مصری کے سامنے ایسا نہ کہہ دینا ورنہ گولی مار دے گا۔ یہ سب مسلمان ہیں ۔ فرعونوں کا ذکر تو بس یہ سیاحوں کو بے وقوف بنانے کے لیے کرتے ہیں ۔“

قطار میں چیونٹی کی چال سے حرکت ہورہی تھی۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاکر ہم نے سوچاکہ کیوں نہ کرنسی تبدیل کرالی جائے۔ خان صاحب کوقطار میں چھوڑ کر ہم دونوں اس کھڑکی پر پہنچے جہاں کرنسی تبدیل کی جارہی تھی۔ یہاں بھی ایک خاصی لمبی قطار لگی ہوئی تھی۔ کاؤنٹر پر صرف ایک اونچے لمبے مصری تشریف فرما تھے۔ ان کے بال گھونگریالے تھے اور رنگ گہرا سانولا تھا۔ ویسے تو کلین شیو تھے مگر بہت باریک تلوار نمامونچھیں رکھی ہوئی تھیں۔ وہ بھی انتہائی سست رفتار اور

مرحل تھے۔ کئی منٹ گزر جانے کے بعد دوسرے صاحب کی باری آئی تھی مگر سب مسافر صابر وشاکر کھڑے ہوئے تھے۔ پہلے تو ہم نے سوچا کہ یہ پروگرام ہی ملتوی کردیں۔ کرنسی باہر سے تبدیل کرالیں گے مگر پھر خیال آیا کہ باہر نکل کر ٹیکسی وغیرہ کیلئے ضرورت پیش آئے گی تو کیا کریں گے؟ اس لئے صبر کیے کھڑے رہے۔ بیس پچیس منٹ بعد خدا خدا کرکے ہماری باری آئی۔ہم یورپ سے آرہے تھے ۔جہاں کرنسی تبدیل کرنے پر خواتین مامور ہوتی ہیں اور انتہائی خوش اخلاق اور لگاوٹ سے پیش آتی ہیں مگر یہاں صنف کرخت سے واسطہ پڑا اور وہ بھی صحیح معنوں میں کرخت۔ نہ تو وہ ہمیں دیکھ کر مسکرائے نہ ہی ہمیں خوشی آمدید کہا۔ ہمیں قدم قدم پر مغرب اور مشرق کے فرق کا شدید احساس ہونے لگاتھا۔ ہم ان کے سامنے جاکھڑے ہوئے ۔ پاسپورٹ ہمارے ہاتھ میں تھا اور پچاس ڈالر کا نوٹ بھی ہم نے اسکے ساتھ ہی تھام رکھا تھا ان کے سامنے پہنچے تو وہ ٹیلی فون پر کسی سے بات کرنے لگے۔ عربی زبان کی شیرینی نے دل خوش کردیا مگر جب گفتگو طویل ہوگئی تو بے چینی ہونے لگی۔

بٹ صاحب نے ہمارے کان میں کہا"یہ کب تک قرائت کرتا رہے گا۔ یہ کام دفتر میں بیٹھ کر تو نہیں کیا جاتا۔"

ہم نے کہا"بھائی یہ قرائت نہیں ہے عربی زبان ہے۔ یہ لوگ اسی لب ولہجے میں عربی بولتے ہیں۔"

ٹیلی فون سے فارغ ہوئے تو ان صاحب نے گھور کر ہمیں دیکھا جیسے کوئی پولیس والا ملزم کو دیکھتا ہے۔ چند لمحے یونہی گزر گئے ۔ جب وہ کچھ نہ بولے تو ہم نے اپنا پاسپورٹ اور پچاس ڈالر کا نوٹ ان کے سامنے رکھ دیا اورانگریزی میں عرض کی کہ یہ رقم تبدیل کردیجئے ۔ انہوں نے جھپٹ کر دونوں چیزیں ہمارے ہاتھ سے چھین لیں۔ پاسپورٹ پر ایک سرسری نظرڈالی پھر ہمیں دیکھا اور بولے "الباکستان!"

ہم نے کہا"یس پاکستان !" سوچا شاید ان کا جذبہ اسلامی جوش میں آجائے گا مگر انہوں نے اس کے بعد کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ رسیدی کاغذ پر ہم سے دستخط کرائے۔ پچاس ڈالر کے اکلوتے نوٹ پر باربار انگلیوں اور انگوٹھے کی مدد سے مسل کر دیکھا پھر اسے اونچا اٹھاکر بغور جائزہ لیا۔ شاید اندازہ لگا رہے تھے کہ نوٹ اصلی ہے یا جعلی۔ بہرحال جب مطمئن ہوگئے تو انہوں نے منہ سے ایک لفظ نکالے بغیر مصری کرنسی گن کر ہمارے سامنے رکھ دی ۔ اسے گننے میں بھی انہوں نے کافی وقت لگایا۔ بار بار اپنے انگوٹھے سے زبان لگاتے تھے اور پھرنوٹ گننے میں مصروف ہوجاتے تھے۔ قاہرہ جیسے بین الاقوامی ائر پورٹ پر یہ انداز ہمارے لئے خاصا حیران کن تھا۔ خدا خدا کرکے انہوں نے ہمیں فارغ کیا مگر منہ سے پھر بھی کچھ نہ بولے۔

ہمارے بعد بٹ صاحب کی باری تھی۔ انہوں نے ان کے سامنے پہنچتے ہی با آواز بلند"السلام علیکم" داغ دیا۔ جواب میں انہوں نے گھور کر بٹ صاحب کو دیکھا اور خاموشی سے ان کا پاسپورٹ کا معائنہ کرنے لگے۔

کافی دیرالٹ پلٹ کردیکھتے رہے پھر بولے " الباکستان!"

"یس۔ پاکستان" بٹ صاحب نے ان کی تصحیح کی مگر انہوں نے لفٹ دینا مناسب نہ سمجھا۔ ان کے نوٹ کو بھی انہوں نے خوب اچھی طرح مسل مسل کر اور تھوک لگا کر جانچا۔ اس کے بعد مصری نوٹوں کو گنتے وقت بھی یہی عمل دہراتے رہے۔ انہوں نے رسید ' پاسپورٹ اور رقم بٹ صاحب کے حوالے کردی مگر منہ سے پھر بھی کچھ نہ بولے۔

ہم واپس لوٹے تو بٹ صاحب بڑے برہم تھے"یہ شخص کتنا بداخلاق ہے۔یورپ میں عورتیں کتنی ہنس مکھ ہوتی ہیں۔"

ہم نے کہا "بھائی وہ یورپ ہے اور پھر عورت ' مرد کا فرق بھی تو پیش نظر رکھو۔"

کہنے لگے "یہاں تو سنا ہے کہ بہت سیاح آتے ہیں۔ کیا یہ سب کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتے ہیں؟"

ہم نے کہا"یہ تو اللہ ہی جانتا ہے۔ ہم بھی آپ کی طرح پہلی بار اس ملک میں آئے ہیں۔"

امیگریشن کی قطار میں پہنچے تو دیکھا کہ بالاخر خان صاحب کاؤنٹر کے نزدیک

پہنچ گئے تھے۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ سخت بیزار اور ناراض ہوجاتے مگر خلاف توقع کافی مطمئن اور خوش نظر آئے۔ ان کی خوش اخلاقی کے اسباب بھی سامنے ہی تھے۔ یہ چند یورپین خواتین تھیں جو خان صاحب کے آگے اور پیچھے قطار میں کھڑی ہوئی تھیں۔ہم دوبارہ جاکراپنی جگہ پر کھڑے ہوگئے۔

خان صاحب نے فوراً" ٹوکا"ہوں ہوں۔"

"کیا بات ہے ؟"

"آگے نہیں پیچھے جاؤ پیچھے" انہوں نے دبی زبان میں کہا۔

"مگر کیوں؟"

"یہ لڑکیاں برامانیں گی۔"

ہم نے کہا"پیچھے جائیں گے تو لڑکے برا مانیں گے۔"

یار سمجھا کرو۔ میری اچھی خاصی دوستی ہونے والی ہے۔ تم کام بگاڑنے آگئے۔"

ہم نے حیران ہوکرخان صاحب کو اورپھر اپنے سامنے قطار میں کھڑی خواتین کو دیکھا۔ ویسے وہ خوش شکل اور قابل دید تھیں مگر انہیں لڑکی کسی طورپر بھی نہیں کہاجاسکتا تھا۔ ہم خاں صاحب کی ناراضی کے پیش نظرچپ چاپ ان کے پیچھے جا کھڑے ہوئے اور ہمہ تن گوش ہوگئے کہ آخر خان صاحب "لڑکیوں" سے دوستی کس طرح کررہے ہیں۔ بٹ صاحب نے احتجاج کیا کہ ہم نے خان صاحب کی بات کیوں مان لی مگر ہم نے یہ کہہ کر انہیں تسلی دی کہ اگر ایک دوست کا کام بن رہا ہے تو ہمیں بگاڑنے کی کیا ضرورت ہے۔

"آپ اس شخص کو آوارہ کردیں گے۔ آدھا آوارہ تو وہ پہلے ہی ہوگیا ہے۔ ذرا سوچئے کہ ہم پاکستان واپس جاکر کیا منہ دکھائیں گے۔ ایک اچھا بھلا شریف آدمی ساتھ لے کر آئے تھے اور ایک بگڑا ہوا شخص واپس لے جائیں گے۔ یہ سب آپ کی حوصلہ افزائی کا نتیجہ ہے۔"

ہم جتنی دیر وہاں کھڑے رہے۔ خان صاحب کے سامنے کھڑی ہونے والی خواتین نے ایک بار بھی ان سے لگاوٹ کا اظہار نہیں کیا۔ البتہ جب قطار آگے

بڑھتی تھی تو وہ بھی فرش پر رکھے ہوئے سامان کو پیروں سے آگے کھسکا دیتی تھیں اور ایک آدھ بار مسکرا کرخان صاحب کی طرف دیکھ بھی لیتی تھیں۔ بے چارے خان صاحب سادگی میں' اسے محبت کی تمہید سمجھ بیٹھے تھے تو اس میں کسی کا کیا قصور؟

بٹ صاحب نے پیچھے سے ہمارے کان میں کہا"خان صاحب دراصل ففٹی پرسنٹ عشق کے قائل ہیں۔ یعنی ان کی طرف سے عشق صادق ہوتا ہے مگر دوسری جانب سے عشق ہویانہ ہو' انہیں کوئی پروا نہیں ہوتی۔"

اس کے بعد خان صاحب کا نام بھی ففٹی پرسنٹ رکھ دیاتھا اور کافی عرصے تک انہیں چھیڑتے رہے۔

خدا خدا کرکے خان صاحب کی باری آئی تو امیگریشن افسر نے انہیں بہت خشمگین نظروں سے دیکھا حالانکہ بظاہر اس کا کوئی سبب تو نہیں تھا پھر انہوں نے بڑی سست روی سے پاسپورٹ کے صفحات الٹے اور کسی سوچ میں گم ہوگئے۔ خدا جانے وہ کوئی فلسفی یا شاعر تھے یا مصر کے سبھی بیوروکریٹ ایسے ہوتے ہیں۔ انہوں نے خان صاحب سے چند سوالات کیئے پھر نہایت سلوموشن میں مہراٹھائی اور ان کے پاسپورٹ پر لگادی۔ اس طرح خان صاحب کی مشکل تو آسان ہوگئی۔ اب ہماری باری تھی۔ ہم نے پاسپورٹ ان کے سامنے رکھا تو انہوں نے کہا "الباکستان!؟"

ہم نے کہا"یس۔ پاکستان۔"

انہوں نے عربی نما انگریزی میں پوچھا"کس لئے آئے ہیں؟"

ہم نے کہا"سیاحت کیلئے۔"

وہ پھر سوچ میں گم ہوگئے۔ حالانکہ اس کی کوئی حاجت نہ تھی مگر جیسا کہ پہلے بتایاجاچکاہے کہ یہ ان کا مخصوص انداز یا عادت تھی۔ یا غالباً" جان بوجھ کر مسافروں کو تنگ کرنا چاہتے تھے ۔ پاسپورٹ کے صفحات انہوں نے بڑے آرام سے الٹے پھر پوچھا"ہاؤمنی اسٹے؟" مطلب یہ کہ کتنے دن قیام کروگے؟ ہم نے بتایا کہ چار پانچ دن کا ارادہ ہے۔ انہوں نے اس کے بعد مزید سوالات دریافت کرنے کیلئے اپنے دماغ پر زور ڈالا مگر پھر ارادہ بدل دیا اور پاسپورٹ پر مہرلگاکر ہمارے حوالے کردیا۔

ہمارے بعد بٹ صاحب کو بھی انہوں نے نمٹا دیا مگر ابھی قطار میں کچھ اور مسافر بھی کھڑے ہوئے تھے۔ ہم حیران تھے ایک ایسا ملک جسکی معیشت کا انحصار بہت حد تک سیاحت پر ہے وہاں سیاحوں سے ایسا سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ بعد میں ہمیں بتایا گیا کہ سیاحت مصر کی دوسری سب سے بڑی صنعت اور بڑا ذریعہ آمدنی ہے لیکن سیاحوں کی آؤبھگت اور سہولت کیلئے جو بندوبست اور اہتمام ہونا چاہیے وہ ہمیں کہیں نظر نہ آیا۔ اس کے باوجود اگر ہزاروں' لاکھوں سیاح مصر جاتے ہیں تو یہ اس ملک کی خوش نصیبی ہی قرار دی جاسکتی ہے یا پھر شاید کسی فقیر کی دعا کا اثر ہے۔

ایرپورٹ سے باہر نکلے تو دوپہر ہوچکی تھی۔ دھوپ میں تمازت تھی اور خاصی گرمی محسوس ہورہی تھی۔ چنانچہ کوٹ وغیرہ اتار کر کندھوں پر ڈال لئے۔ قاہرہ ایرپورٹ کی عمارت خاصی بڑی اور دلکش ہے مگر یہاں وہ ہجوم نظر آیا جو یورپ کے ہوائی اڈوں پر نظر آتا ہے۔ عمارت سے باہر آتے ہی بٹ صاحب نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور کہا"اہرام مصر کہاں ہیں؟"

ہم نے کہا"اہرام مصر کو سیاحوں کی سہولت کیلئے ایرپورٹ پر نہیں لایا جاتا۔ جو انہیں دیکھنا چاہتا ہے خود ہی ان کے پاس چلا جاتا ہے۔"

بٹ صاحب بولے "ہم نے تو سنا تھا کہ یہاں ہر طرف اہرام مصر بکھرے ہوئے ہیں۔"

ہم نے کہا"بکھرے تو ہوئے ہیں مگر سڑکوں ' بازاروں اور ایرپورٹ پر ان کے آنے پر پابندی عائد کردی گئی ہے۔ وہ بس صحرا ریگستان تک ہی محدود رہتے ہیں۔"

بٹ صاحب نے مایوسی سے منہ بنایا۔ سامنے ایک کشادہ میدان تھا اور خاصی چوڑی سڑک بل کھاتی ہوئی گزرتی نظر آرہی تھی۔

خان صاحب بولے "پتا نہیں' شہر یہاں سے کتنی دور ہے؟"

ہم نے کہا"آپ فکر مند کیوں ہوتے ہیں۔ پیدل تو جانا نہیں' ٹیکسی میں جائیں گے۔"

"مگر ٹیکسی والے سے کہیں گے کیا۔ ہم تو یہاں کسی ہوٹل کا نام بھی نہیں جانتے۔ بڑے اور مشہور ہوٹلوں میں قیام کرنے کا گردہ نہیں ہے۔"

اتنے میں ایک ٹیکسی ہمارے سامنے آکر رک گئی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے سوالیہ نظروں سے ہماری طرف دیکھا۔ وہ ادھیڑ عمر کا ایک افریقی تھا۔ مصر میں آپ کو ایسے لوگ کافی تعداد میں نظر آجاتے ہیں۔ ان کے بال بھی حبشیوں کی طرح گھنے اور گھونگر دار ہوتے ہیں اور کیوں نہ ہوں۔ آخر مصر بھی ایک افریقی ملک ہے۔ کھلی رنگت والے لوگوں کی تعداد یہاں بہت زیادہ نہیں ہے مگر جو لوگ خوش شکل ہیں' وہ بہت دلکش ہیں۔ عورتوں کا بھی یہی حال ہے۔

ہم ٹیکسی والے کے نزدیک گئے۔ کچھ دیر تک دونوں فریق خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ اس انتظار میں کہ گفتگو کی پہل دوسرا کرے ۔ آخر ہم نے ہار مان لی اور پوچھا" یوا سپیک انگلش؟"

انہوں نے گردن ہلاکر انکار کردیا' ہم نے کہا "اب کیا کریں؟"

خان صاحب بولے" کرنا کیا ہے ٹیکسی میں بیٹھ جائیں۔ ظاہر ہے کہ ہم ہوائی جہاز کے ذریعے آئے ہیں۔ سیاح ہیں' کسی نہ کسی ہوٹل میں تو لے ہی جائے گا۔"

تجویز معقول تھی۔ چنانچہ ہم نے ایسا ہی کیا۔ پہلے ڈکی کھولنے کااشارہ کیا گیا ۔ انہوں نے باامر مجبوری ٹیکسی سے اتر کر ڈکی کھولی اور ہمارے سوٹ کیس اس کے اندر رکھ دیئے۔ ہم تینوں ٹیکسی میں سوار ہوگئے تو ٹیکسی ڈرائیور بھی اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ اس کے بعد پھر ایک دوسرے کو دیکھنے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ظاہر ہے وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ ہماری منزل کون سی ہے؟

خان صاحب نے اردو میں فرمایا"بھائی ' کسی ہوٹل میں چلو مگر زیادہ مہنگا نہ ہو" اس کے پلے خاک بھی نہ پڑا ۔ بدستور ہمارا منہ تکتا رہا۔

بٹ صاحب بولے"بچپن میں بڑوں کا کہنا نہیں مانا تو آج یہ دن دیکھنا پڑ رہا ہے۔"

"کون سا کہنا؟"

بولے "اگر ترجمے کے ساتھ قرآن شریف پڑھ لیتے تو کم ازکم مطلب کے مطابق تو عربی بول ہی لیتے۔"

نکتہ واقعی قابل غور تھا مگر بدقسمتی سے بہت دیر ہوچکی تھی۔ اب اس سلسلے میں کچھ نہیں کیاجاسکتا تھا۔

ایک بار ڈرائیور نے انتہائی گاڑھی عربی میں ہم سے کچھ کہا اور ہم اس کا منہ تکتے رہ گئے۔ اس کے بعد تو یہی سلسلہ شروع ہوگیا۔ ایک بار ڈرائیور عربی میں کچھ کہتا اور دوسری بار ہم انگریزی یا اردو میں جواب دیتے۔ یہ بیت بازی شاید کچھ دیر اور جاری رہتی اگر ایک پولیس والا نہ آجاتا۔ وہ کافی دیر سے ٹیکسی کو ایک ہی جگہ کھڑا ہوا دیکھ رہا تھا۔ جب نہ رہا گیاتو وہ ٹیکسی ڈرائیور کے پاس چلا آیا۔ اب ان دونوں میں نہایت شیریں مقالی کا مقابلہ شروع ہوا۔

"کتنی پیاری اور میٹھی زبان ہے" خان صاحب نے کہا "کیوں نہ ہو۔ آخر قرآن شریف کی زبان ہے۔"

پولیس والا ٹیکسی ڈرائیور سے فارغ ہوکر ہماری طرف متوجہ ہوا اور ہمارے ساتھ بھی وہی سلوک روا رکھا۔ یعنی میٹھی اور گاڑھی عربی میں سوالات کرنے شروع کردیئے۔

ہم نے انگریزی میں کہا"ہم ٹورسٹ ہیں۔ عربی نہیں جانتے۔"

وہ انگریزی سے واقف تھا مگر صرف واجبی سی جانتا تھا۔ جواب میں بولا "عربی نہیں جانتے تو مصر کیوں آئے ہو؟"

لیجئے ' ملاحظہ فرمایئے انداز میزبانی۔ ظاہر ہے کہ مصر جانے کیلئے یہ شرط ہم نے پہلی بار ہی سنی تھی۔ ورنہ بے شمار لوگ مصر کا رخ ہی نہ کرتے یا پھر عربی کی ٹیوشن پڑھ کر وہاں کا قصد کرتے۔

ہم نے کہا" اب تو غلطی ہوگئی کہ آگئے۔ آپ ذرا ہماری مدد کردیں۔"

"بولو۔"

ہمیں کسی درمیانے درجے کے ہوٹل میں جانا ہے آپ ٹیکسی ڈرائیور کو سمجھا دیں۔"

"بکنگ ہے؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں۔"

اس نے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے "چچ چچ" کی آوازیں نکالیں پھر ٹیکسی ڈرائیور کو عربی زبان میں ہدایات دینے لگا۔ وہ سرہلاتا رہا اور ہماری طرف دیکھتا رہا۔

پولیس والے نے کہا"اب جاؤ۔ اللہ حافظ۔"

ٹیکسی تیزی سے چل پڑی ۔ سڑک کشادہ اور خوب صورت تھی مگر درخت اور سبزہ زیادہ نہ تھا۔ پام کے درخت کافی تعداد میں نظر آئے۔ کہیں کہیں کیکٹس کے پودے بھی تھے مگر زیادہ بہار کھجوروں کے درختوں کی تھی۔ پہلے غیر آباد علاقہ تھا۔ اس کے بعد آباد علاقہ شروع ہوگیا۔ مختلف سڑکوں سے گزرتے ہوئے ہم جانب منزل رواں تھے۔ سڑکوں پر ٹریفک کافی تھا مگر اتنا بھی نہیں کہ ٹریفک جام ہوجائے۔ یوں سمجھئے کہ ہم قاہرہ کے ڈاؤن ٹاؤن کی طرف جارہے تھے کیونکہ درمیانہ درجے کے ہوٹل وہیں دستیاب ہوسکتے تھے۔

قاہرہ کافی جدید شہر ہے۔ خوبصورت اور بلند عمارتیں' شاندار دکانیں' سڑکوں پر کاروں کی قطاریں ' ٹریفک بھی خاصے نظم وضبط کے ساتھ چل رہا تھا۔ روشنیوں پر سب رک جاتے تھے۔ کہیں کہیں اکا دکا گدھا گاڑی بھی نظر آئی جسے دیکھ کربہت دل خوش ہوا کہ ماڈرن ہوجانے کے باوجود مصریوں نے ماضی کی تہذیب سے اپنا رشتہ قائم رکھا ہے۔ فٹ پاتھوں پر ہر قسم کے لوگ گھوم رہے تھے سوٹ بوٹ پوش ۔ حضرات اسکرٹ اور مغربی لباس میں ملبوس خواتین۔ ان ہی میں جبہ پہنے ہوئے عام لوگ بھی نظر آئے' کچھ خواتین بھی سر سے پیر تک لباس میں لپٹی ہوئی نظر آئیں۔

ہماری ٹیکسی جیسے ہی بارونق علاقے میں پہنچی' ٹیکسی ڈرائیور کی زبان پر لگے قفل کھل گئے اور اس نے رواں تبصرہ شروع کردیا۔ وہ ہاتھ کے اشارے سے مختلف مقامات کی طرف اشارہ کرکے کچھ بتاتا بھی جارہا تھا۔ اس کی خوش الحانی میں کوئی شک نہیں تھا۔ اس کی گفتگو کا ایک لفظ بھی ہماری سمجھ میں نہیں آرہا تھا مگر ہم خاموشی سے اس کی عربی سن رہے تھے۔ ٹیکسی میں ایک عجیب سا ماحول قائم

ہوگیا تھا۔ شاید یہ نفسیاتی اثر تھا کہ ہم اس کی شیریں بیانی کو عربی زبان میں سن کر مرعوب سے ہوگئے تھے۔ اس نے عمارتوں اور سڑکوں کے بارے میں بھی بہت کچھ بتایاہوگا مگر ایک لفظ بھی ہمارے پلّے نہیں پڑا۔ ہم تو بس اس کی شیریں بیانی میں کھوئے ہوئے تھے۔

جب وہ رکا تو ہم سب بھی اس کے اثر سے باہر نکلے۔بٹ صاحب بولے "یوں لگتا ہے جیسے قرائت کررہاہے۔"

ہم نے کہا "مگر وہ باتیں کررہاتھا۔ ہمیں شہر کے بارے میں بتا رہاتھا۔"

"مگر آپ بھی تو مؤدب اور ہمہ تن گوش بیٹھے ہوئے تھے۔" انہوں نے کہا۔

"بھائی کیوں نہ ہوں۔ عربی ہمارے لیئے متبرک اور قابل احترام زبان ہے۔"

اس عرصے میں ٹیکسی چند مصروف سڑکوں سے گزر کر ایک جگہ رک گئی تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے ہمیں اشارے سے بتایا کہ سامنے دیکھو۔ وہاں ایک ہوٹل کا بورڈ چمک رہا تھا۔ ڈرائیور نے ہمارا سامان نکال کر باہر فٹ پاتھ پر رکھ دیا ۔ یہ ایک مصروف اور صاف ستھرا علاقہ تھا۔ ہر قسم اور ہر حلیے کے لوگ وہاں سے گزر رہے تھے۔ یہاں تک کہ ایک دو گدھاگاڑیاں بھی سامنے سے گزرگئیں۔

خان صاحب بولے"معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کے گدھے کافی سمجھ دار ہوتے ہیں۔"

"کیسے"

" آپ نے دیکھا نہیں کہ کسی گدھے کے ساتھ بھی "پخ" نہیں لگی ہوئی ہے ۔ ورنہ کراچی کے گدھوں کو تو یہ باور کرادیا جاتا کہ گاڑی کا سارا بوجھ تو دراصل پخ نے اٹھا رکھا ہے' وہ تو محض تفریحاً" ساتھ ہے۔"

ہم نے کہا " کراچی میں سارے گدھے اتنے گدھے نہیں ہوتے ۔ وہاں بھی ایسے سمجھ دار گدھے پائے جاتے ہیں جو پخ کے بغیر ہی کام چلا لیتے ہیں ۔" یہ کہہ کر ہم نے کن انکھیوں سے خان صاحب کی طرف دیکھا۔

وہ ناراض ہو کر بولے" آپ پخ کس کو کہہ رہے ہیں ' مجھے یا بٹ صاحب کو؟"

ہم نے کہا " یہ فیصلہ تو آپ ہی بہتر کر سکتے ہیں کہ دونوں میں سے گدھا کون ہے اور پخ کون ہے؟ بھائی برانہ ماننا۔ بات یہ ہے کہ ہم نے بھی آپ دونوں کو کبھی ایک دوسرے کے بغیر نہیں دیکھا۔"

بٹ صاحب تیزی سے پلٹے مگر اس سے پہلے ٹیکسی ڈرائیور ان دونوں کے درمیان حائل ہو گیا اور لگا عربی بگھارنے۔

" کرایہ مانگ رہاہے" بٹ صاحب نے کہا۔

"ظاہر ہے " خان صاحب بولے " ہم سے قرضہ تو نہیں مانگ سکتا۔"

اب سوال یہ تھا کہ اسے کیا کرایہ دیا جائے گا ۔ ہم نے کھڑکی سے اندر منہ ڈال کر جھانک کر دیکھامگر میٹر قسم کی کوئی چیز نظر نہیں آئی ۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ کرائے کا معاملہ کیوں کر حل کیا جائے ؟ ہم نے مدد کے لیے چاروں طرف دیکھا مگر کوئی ہم کو نظر نہیں آیامگر ہماری مشکل خود ٹیکسی ڈرائیورنے آسان کردی۔ وہ کافی مقدار میں عربی گھول کر ہمیں پلاتا رہا اور آخر میں اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں اٹھاکر دوبار ہماری آنکھوں کے سامنے گھمائیں اور پھر کہا "پونڈ" گویا وہ ہم سے بیس پونڈ کرایہ طلب کر رہاتھا۔

بٹ صاحب ناراض ہو گئے " ارے پاگل ہو گئے ہو۔ دماغ گھاس چرنے گیا ہے۔ کوئی لوٹ تو نہیں مچ رہی ہے۔ غضب خدا کا بیس پونڈ کرایہ۔ لاحول ولاقوۃ۔ "

ہم نے کہا"بٹ صاحب وہ انگریزی پونڈ نہیں مصری پونڈ مانگ رہا ہے۔"

بٹ صاحب نے فوراً" حساب لگانا شروع کردیا مگر پھر فیل ہوگئے۔ اس اثنا میں ۔ ۔ ۔ ٹیکسی ڈرائیور مسلسل بولتا رہا۔ اس کی شیریں بیانی اب ہماری سمع خراشی کرنے لگی تھی۔ اس کی آواز سن کر راہ چلتے لوگ بھی تماشا دیکھنے کے لیے رک کر کھڑے ہو گئے تھے ۔ سوٹ بوٹ والے تو صرف ایک نظر دیکھ کر گزر جاتے تھے مگر عباپوش حضرات یوں کھڑے ہوگئے تھے جیسے ابھی کوئی بازی گر اپنا تماشا دکھانا شروع

کر دے گا۔

ہم نے جیب سے بیس مصری پونڈ نکالے اور ٹیکسی ڈرائیور کے حوالے کردیئے۔ اس کا موڈ ایک دم تبدیل ہو گیا ۔ کہاں تو مارنے مرنے پر آمادہ نظر آرہا تھا اور کہاں یہ کہ مسکرانے لگا اور زبان میں ایک بار پھر شیرینی پیدا ہو گئی۔

" تشکر حبیبی" اس نے بڑے بڑے دانت نکال کر کہا اور ٹیکسی میں سوار ہو کر یہ جا،وہ جا۔ تماشا دیکھنے کے لیے جو مجمع اکٹھا ہو گیا تھا ' چند لمحے تو وہ منتظر رہا اور شاید یہ سمجھتا رہا کہ ابھی ہم جیب میں سے خرگوش نکالیں گے مگر پھر جب ہم نے اپنا سامان سمیٹنا شروع کر دیا تو سب نے مایوس ہو کر اپنی اپنی راہ لی ۔ ساتھ ہی وہ زیر لب کچھ بڑبڑا بھی رہے تھے۔

ہم نے کہا" خان صاحب ۔ یہ سب ہمیں عربی میں گالیاں دے رہے ہیں۔"

" وہ کیوں؟"

"ہم نے انہیں تماشا جو نہیں دکھایا۔"

بٹ صاحب اچانک جوش میں آگئے" یہ کیا گستاخی اور بے ادبی ہے ۔ آپ لوگ توبہ کریں ' اپنے کان پکڑیں۔ اللہ سے معافی مانگیں۔" ہم نے حیران ہو کر انہیں دیکھا اور پوچھا" مگر کس بات پر؟"

بولے" آپ نے اتنی بڑی بات کہہ دی ہے کہ وہ عربی میں گالیاں دے رہے ہوں گے۔ عربی ایک مقدس اور متبرک زبان ہے۔"

مگر بھائی صاحب گالیاں تو ہر زبان میں ہوتی ہیں۔ مگر ان کی زبان میں قرآن شریف جیسی مقدس کتاب موجود ہے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ اب وہ اپنی مرضی کے مطابق استعمال ہی نہیں کر سکتے۔"

بولے" وہ تو عرب ہیں ۔ کم از کم ہمیں تو عربی کا احترام کرنا چاہیے۔"

ہم نے کہا" بھائی غلطی ہو گئی۔ معاف کردو۔"

"یا حبیبی" ہمیں جس ہوٹل کے سامنے چھوڑ کر گئے تھے وہ ایک درمیانے درجے کاصاف ستھرا ہوٹل تھا۔ چند سیڑھیاں طے کرنے کے بعد ہوٹل کی لابی میں

داخل ہو جاتے تھے ۔ خان صاحب نے اندر پہنچتے ہی چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ ہر طرف مرد ہی مرد نظر آرہے تھے۔ کہنے لگے " ارے یہ تو مردانہ ہوٹل ہے۔"

" توکیا آپ کو زنانہ ہوٹل کی تلاش تھی؟ "

"نہیں بھئی۔ آخر صنف نازک کی بھی کوئی نمائندگی ہونی چاہیے۔"

ہم نے کہا "خان صاحب مہربانی فرما کر اب آپ یورپ کے ماحول کو بھولنا شروع کردیجئے ورنہ پاکستان پہنچتے تو آپ کا دماغ خراب ہوجائے گا۔"

"اور آپ کو گدو بندر پہنچانا پڑے گا" بٹ صاحب نے لقمہ دیا۔

استقبالیہ پر ایک چھوڑ تین تین حضرات برا جمان تھے مگر انگریزی ان میں سے صرف ایک ہی جانتے تھے اور جانتے ہی تھے' دوسروں کو سمجھا نہیں سکتے تھے ۔ انگریزی بھی وہ عربی لب ولہجے میں بولتے تھے اس لئے سمجھنا آسان تھا۔

ہم نے ان سے کمروں کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے صاف انکار کردیا۔ کوئی کمرہ خالی نہیں تھا۔

بٹ صاحب نے کہا" اتنا بڑا ہوٹل ہے ۔ آخر کوئی نہ کوئی کمرا تو خالی ہو گا۔"

ہم نے کہا" بھائی۔ یہ کمرے انہوں نے مسافروں کو کرائے پر دینے کے لیے ہی بنائے ہیں۔ خالی رکھنے کے لئے نہیں ۔بھلا انہیں جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"آپ نہیں جانتے۔ بعض لوگ عادتاً" جھوٹ بولتے ہیں۔"

مگرخان صاحب یہ اطلاع پاکر بہت خوش نظر آرہے تھے۔

" چلو اچھا ہوا۔ یہ ہوٹل ویسے بھی فضول سا ہے۔ کوئی اچھا سا ہوٹل تلاش کرتے ہیں۔"

"یہ قاہرہ ہے۔ بہت بڑا شہر ہے اور ہمارے لیے بالکل اجنبی ہے۔ یہاں کے راستوں سے واقف ہیں نہ زبان سے ۔ اتنی آسانی سے ہوٹل کیسے تلاش کریں گے؟"

بہرحال صبروشکر کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ ہوٹل سے باہر نکلے تو قاہرہ

کی سڑک ہمارے سامنے پھیلی ہوئی تھی۔ خاصا ہجوم تھا۔ لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ راہ گیروں اور موٹرکاروں کے علاوہ گدھا گاڑیوں کی بھی کمی نہیں تھی۔ اتنا بڑا غدار شہر تھا اور اس کے بیچوں بیچ ہم تین پردیسی حیران وپریشان اپنا سامان لیے کھڑے تھے۔ اگر ٹیکسی والے کو بلائیں بھی تو اس سے کیا کہیں؟ کوئی ہم زبان نہیں تھا جس سے حال دل بیان کرتے اور اپنی مشکل اس کے سامنے پیش کرتے۔

"وہ رہی ٹیکسی" خان صاحب نے ایک ٹیکسی دیکھ کر بے اختیار کہا۔

ہم نے بھی بے اختیار ہاتھ اٹھادیا۔ ٹیکسی ہمارے سامنے آخر رک گئی۔ ایک نوجوان لڑکا ٹیکسی ڈرائیور تھا۔ خاصا اسمارٹ اور خوش لباس تھا۔ سوچا یہ ضرور انگریزی سے واقف ہوگا۔ ہم اس کے پاس گئے اور پوچھا "یو اسپیک انگلش؟"

"یس سر" اس نے زور وشور سے سرہلا دیا۔

ہماری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہاتھا۔ آخر کار ہم نے قاہرہ میں ایک انگریزی داں تلاش کرہی لیاتھا۔

ہم نے انگریزی میں کہا "ہمیں ہوٹل کی تلاش ہے۔ زیادہ مہنگا نہ مگر اچھا ہو۔"

"ویری گڈ ویری گڈ" اس نے سرہلایا پھر باہر نکل کر ہمارا سامان ٹیکسی میں رکھوانے کے بعد دروازہ کھول کر ہمیں اندر بیٹھنے کی دعوت دی۔ خاصا مہذب آدمی نظر آرہاتھا اور ہمیں اس وقت قاہرہ میں ایک ایسے ہی شخص کی ضرورت تھی۔

ٹیکسی میں سوار ہوکر ہم نے اطمینان کی لمبی سانس لی اور سکون سے بیٹھ گئے۔ ایک بار پھر قاہرہ کی سڑکیں' عمارتیں اور بازار ہماری نظروں کے سامنے سے گزرنے لگے مگر اس بار ٹیکسی ڈرائیور نے گائیڈ کے فرائض سرانجام دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ ٹیکسی پندرہ منٹ تک چلنے کے بعد ایک جگہ رک گئی ٹیکسی ڈرائیور نے سامنے اشارہ کرتے ہوئے کہا

دیکھا تو واقعی ایک معقول ہوٹل سامنے تھا۔ جو ہم سب کو پسند آیا۔

ڈرائیور نے سامان نکال کر فٹ پاتھ پر رکھ دیا۔ اس ٹیکسی میں میٹر بھی لگا ہوا تھا مگر سب کچھ عربی میں لکھا ہوا تھا۔ بغور مطالعہ کیا مگر کچھ سمجھ نہیں آیا۔

ہم نے پوچھا "ہاؤمچ؟"

وہ ہمارا اناڑی پن بھانپ گیا' بولا "پچیس پونڈ۔"

کرایہ کچھ زیادہ لگا۔ ہمیں شش وپنج میں مبتلا دیکھا تو جھٹ سے اس نے کرائے کی رقم پر نظرثانی کردی "اوکے بیس پونڈ"

ہم نے بیس پونڈ اس کے حوالے کئے۔ بٹ صاحب ناراض ہوکر بولے "بھائی صاحب ایک تو آپ کو پیسے دینے کی بہت جلدی ہوتی ہے۔ کچھ دیر اور بات چیت کرتے تو دس پونڈ میں رضا مند ہوجاتا۔"

ہم نے کہا "اگلی بار یہ فرض آپ سرانجام دیجئے گا۔"

خان صاحب بھی حیران تھے' کہنے لگے" اس نے میٹر سے کم کرایہ کیوں وصول کیا؟"

ہم نے کہا "یاتومیٹر خراب ہوگا یا پھراس میں رقم کم درج ہوگی۔"

ٹیکسی ڈرائیور غائب ہوچکاتھا اور ہم سامان اٹھاکر ہوٹل کی جانب گامزن تھے۔ ایک باوردی چوکیدار ٹائپ کے آدمی نے فوراً ہماری مشکل آسان کردی۔ آگے بڑھ کر اس نے سامان ہمارے ہاتھ سے لے لیا اور پھراندر کی طرف منہ کرکے کسی کو پکارا۔ ایک باوردی لوڈر ٹرالی لے کر نمودار ہوگیا۔

"السلام علیکم" خان صاحب نے اس سے کہا۔

"وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔ مسلم ؟"

"الحمد اللہ ۔"

"پاکستانی" بٹ صاحب بھلا کیوں خاموش رہتے۔

لوڈر نے مسکرا کر سرہلایا اور ہمارا سامان لے کر اندر چل پڑا۔ ہم اس کی قیادت میں لابی کے اندر پہنچ گئے۔ یہ ہوٹل بہت بڑا نہیں تھا مگر خاصا دلکش اور شاندار تھا۔ سنگ مرمر کا فرش تھا۔ آرائش بھی اچھی تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ استقبالیہ پر دو مرد حضرات کے ساتھ دو خواتین بھی تشریف فرما تھیں جوخاصی اسمارٹ

اور خوش نظر تھیں سوائے اس کے کہ ان میں سے ایک قدرے موٹی تھیں۔

خان صاحب نے ایک طویل آہ بھری اور کہا" دیکھا۔ اب لگتا ہے کہ ہم قاہرہ میں آئے ہیں۔"

استقبالیہ پر انگریزی بولنے کا فریضہ موٹی خاتون نے ادا کیا۔ ہم نے انہیں اپنے بارے میں بتایا اور تین کمرے طلب کیے۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے معذرت کردی اور کہاکہ آپ کو صرف ایک کمرہ مل سکتا ہے۔ ڈبل بیڈ کے ساتھ اضافی بستر لگادیا جائے گا۔

"ٹھیک ہے" ہمارے کچھ کہنے سے پہلے ہی خان صاحب بول پڑے"کمرا لے لینا چاہیئے۔"

کرایہ دریافت کیاتو ہمارے ہوش اڑ گئے۔ اول تو کرایہ بہت زیادہ تھا۔ دوسرے یہ کہ ایک ہی کمرے کیلئے تو بہت ہی زیادہ تھا۔

ہم نے مسکراتی ہوئی خاتون سے کہا"یہ کرایہ تو بہت زیادہ ہے ۔ کیا اس میں کمی نہیں ہوسکتی؟"

وہ بولیں"ہمارے ہاں کرائے فکس ہوتے ہیں۔"

خان صاحب نے اس اثناء میں مغربی ماحول بھی دیکھ لیا تھا۔ عملے میں بھی خاصی تعداد میں خواتین کی تھی جو ادھر سے ادھر چل پھر رہی تھیں۔

ہم نے خان صاحب سے کہا"یہ تو بہت زیادہ مانگ رہی ہیں۔ ہمارا تو دیوالیہ نکل جائے گا۔"

بولے"بھائی آخر قاہرہ ہے۔ کوئی قصبہ یا گاؤں تو نہیں ہے۔"

ہم نے کہا"مگر اتنا کرایہ تو ہم نے یورپ کے ہوٹلوں میں بھی نہیں دیا۔"

بولے "یہاں منگائی زیادہ ہے اور پھر اپنا مسلمان ملک ہے۔"

بٹ صاحب کی رائے ان کے برعکس تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر یہ مسلمان ملک ہے تو ہم بھی تو مسلمان ہیں۔انہیں ہمارا کچھ لحاظ کرنا چاہیئے۔ اس اثناء میں استقبالیہ پر موجود سبھی لوگ ہمارے چہروں کو تکتے رہے۔ آخر ہم نے معذرت

پیش کردی اور رخصت ہونے کیلئے واپس مڑے۔

موٹی خاتون سے رہا نہ گیا۔ انہوں نے کہا "ایکسکیوزمی!" .... ہم دوبارہ ان کی طرف متوجہ ہوگئے۔

بولیں"آپ کہیں گے تو کرائے میں کمی بھی ہوسکتی ہے۔"

خان صاحب خوش ہوکر بولے۔"دیکھا۔ میں نہ کہتا تھا کہ یہ مسلمان ہیں۔ ہمارا ضرور خیال کریں گے۔"

خاتون نے کہا "آپ کیلئے کرایہ پانچ فیصد کم کردیں گے۔"

یہ بھی ہمارے لئے بہت زیادہ تھا۔ خان صاحب ہمیں گھورتے رہے مگر ہم واپس چل پڑے۔ لوڈر نے بڑے اخلاق سے ہمارا سامان ٹرالی پر رکھا اور ہوٹل سے باہر تک پہنچا دیا۔

بٹ صاحب بہت متاثر ہوئے' کہنے لگے"کتنے بااخلاق اور میزبان قسم کے لوگ ہیں۔ واقعی حاتم طائی اسی ملک کا رہنے والا ہوگا ورنہ اس بے چارے کو ہمارا سامان باہر پہنچانے کی کیا ضرورت تھی؟"

ہم نے دیکھا کہ لوڈر بدستور ٹرالی سے سامان رکھے ہوئے کھڑا تھا اور ہماری طرف دیکھ رہاتھا۔ باوردی چوکیدار بھی اس کے پاس ہی آکر کھڑا ہوگیا تھا اور دونوں حضرات مسکراتے ہوئے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ اب ہماری سمجھ میں آیا کہ ان کی مہمان نوازی اور خوش اخلاقی کا سبب کیاتھا۔ وہ دونوں حضرات "بخشش" کے طلب گار تھے۔ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق ہم نے چپکے سے جیب سے دو پونڈ نکالے اور ان دونوں میں تقسیم کردیئے۔ "تشکر السید" کہتے ہوئے لوڈر نے ہمارا سامان اتار کر فٹ پاتھ پر رکھا اور چلتا بنا۔

اب ایک بار پھر ہم اور قاہرہ کا عظیم الشان شہر۔

خان صاحب سخت ناراض تھے۔ "صابری صاحب نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ ہوٹل کی بکنگ کرائے بغیر ہمیں قاہرہ آنا ہی نہیں چاہیئے تھا۔ اب کیا کریں۔ فٹ پاتھ پر رہنا شروع کردیں؟"

ہم نے انہیں تسلی دی۔ حالانکہ پریشان ہم بھی کچھ کم نہ تھے۔"دیکھیے

خان صاحب ۔ بڑے شہروں میں بے شمار ہوٹل ہوتے ہیں اور ہر طرح کے ہوٹل ہوتے ہیں۔ کوئی بھی سیاح فٹ پاتھ پر زندگی نہیں بسر کرتا۔ ہر ایک کو سر چھپانے کی جگہ مل جاتی ہے۔"

انہوں نے گردن اٹھاکر آسمان کی طرف دیکھا اور بولے۔"ہمارے سر پر تو آسمان کے سوا کچھ نہیں ہے۔"

"سنو۔" ہم نے کہا۔ "ٹیکسی پر سوار ہونے کی بجائے ہم کچھ اور کیوں نہ کریں؟"

"مثلاً" گدھا گاڑی یا اونٹ گاڑی میں سفر کریں؟"

"نہیں ہم پیدل چلتے ہوئے ہوٹل تلاش کرتے ہیں۔ ہمارے سوٹ کیسوں میں پہیئے لگے ہوئے ہیں۔ آخر یہ کس دن کام آئیں گے؟"

یہ تجویز کسی کو پسند نہ آئی مگر کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ آہ سرد بھر کر ہمارے ساتھ چل پڑے۔ فٹ پاتھوں پر کافی رش تھا۔ ہر قسم کے عرب وہاں چلتے پھرتے نظر آرہے تھے۔ مغربی لباس والے ' مشرقی لباس والے ' فیشن ایبل اسکرٹ میں ملبوس خواتین ' لبے چغوں میں لپٹی ہوئی خواتین ' زیادہ تعداد غریب غربا کی تھی۔ بعض خواتین خوش وضع بھی تھیں مگر یہ محسوس کیا کہ دبلی پتلی خواتین برائے نام ہی تھیں۔ بعد میں اس خیال کی تصدیق بھی ہوگئی۔ یہاں کی لڑکیاں عموماً" گداز جسم ہوتی ہیں۔ اور لڑکپن سے جوانی کی منزل تک پہنچتے پہنچتے ہی موٹاپے کی طرف مائل ہو جاتی ہیں۔ خدا جانے یہ آب وہوا کا اثر ہے یا خوراک کا ؟

ہم جس سڑک سے گزر رہے تھے۔ یہ ایک معروف کاروباری علاقہ تھا۔ دکانوں کے شوروم سجے ہوئے تھے مگر وہ یورپ والی بات نہیں تھی۔ یہ بعد میں معلوم ہوا کہ فیشن ایبل علاقوں میں بہت شاندار اسٹور بھی تھے جہاں کا ماحول بھی مغربی تھا۔ یعنی سیلز گرلز موجود تھیں۔ سجاوٹ بھی بہت اچھی تھی۔ سڑک پر ٹریفک کافی تھا اور ظاہر ہے کہ اس کا یورپ سے موازنہ نہیں کیاجاسکتا تھا۔ البتہ یہ ضرور دیکھا کہ سگنل پر سرخ روشنی جلتے ہی تمام ٹریفک رک جاتاتھا اور جب تک سبز روشنی نہ ہو کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرتاتھا۔ ایک دوسرے سے آگے نکلنے کیلئے وہ بھاگ دوڑ اور گھبراہٹ بھی نظر نہ آئی جو ہمارے شہروں کا خاصہ ہے۔ ایک جگہ اس سڑک کا نام بھی لکھا ہوا نظر آگیا۔ یہ رشید پاشا روڈ تھی ۔ عربی اور انگریزی دونوں زبانوں میں اس کا نام لکھا ہوا تھا۔ انگریزی غالباً" سیاحوں کی سہولت کی خاطر لکھی گئی تھی۔

خان صاحب بولے"خدا کا شکر ہے کہ ہمیں اس سڑک کا نام تو پتا چلا۔ ورنہ ہم توگمنام راستوں پر ہی بھٹک رہے تھے۔"

راستے میں ہمیں چند ہوٹلوں کے بورڈ بھی نظر آئے اور ہم نے اندر جاکر مدعا بھی بیان کیا مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔ لگتاتھا جیسے ساری دنیا کو ہمارے قاہرہ جانے کی خبر پیشگی مل گئی ہے اور ان سب نے ہمارے پہنچنے سے پہلے وہاں کے تمام ہوٹلوں پر قبضہ جما لیا ہے۔ دھوپ میں تمازت تھی اور پیدل چلنے کی وجہ سے ہمیں گرمی سی لگ رہی تھی۔

خان صاحب خاصے بیزار نظر آرہے تھے۔" پتا نہیں قاہرہ آنے کا کیا شوق ہورہاتھا۔ آخر دنیا میں اور بھی ملک پڑے ہیں۔ استنبول کتنا اچھا شہر ہے۔ کیا حرج تھا اگر استنبول چلے جاتے۔" وہ آپ ہی آپ بڑبڑاتے رہے۔

ہم نے کہا۔"خان صاحب آپ اس بات کو اپنے اعصاب پر سوار نہ کیجئے۔ آس پاس کا نظارہ کیجئے ۔ ونڈو شاپنگ کیجئے۔ دیکھیے کتنی اچھی دکانیں ہیں۔

انہوں نے کوئی جواب دینا مناسب نہ سمجھا لیکن خوش قسمتی سے اسی وقت ایک نہایت فیشن ایبل اور طرحدار خاتون کھٹ کھٹ کرتی ہوئی ہمارے پاس سے گزریں اور سامنے والے اسٹور میں داخل ہوگئیں۔ وہ اسکرٹ اور بلاؤز میں ملبوس تھیں۔ اسمارٹ اور خوبصورت بھی تھیں ۔اتنی دیر کے بعد وہ پہلی خاتون تھیں جو ہم سب کو بھلی لگیں۔ یا شاید ہم بدحواسی میں دوسری خواتین پر قرار واقعی توجہ نہیں دے پائے تھے۔ ان کے بال تراشے ہوئے تھے اور وہ خالص مغربی انداز میں اچھل اچھل کر چل رہی تھیں۔ جس کی بناء پر ہر قدم پر ان کے بال بھی اچھل جاتے تھے۔ ناک نقشہ بہت سجل تھا۔ رنگ گوری سے قدرے کم۔ آنکھیں اور بال سیاہ تھے۔ مختصر یہ کہ مشرق ومغرب کا امتزاج تھیں اور مشرقی حسن کا چلتا پھرتا نمونہ

۔ سب سے قابل ذکر بات یہ تھی کہ خوشبو سے مہک رہی تھیں۔

خان صاحب نے انہیں سٹور میں جاتے ہوئے دیکھا تو یوں لگا جیسے ان کے قدم زمین نے پکڑ لئے ہیں۔ ایک دم انہوں نے بریک لگائے کیونکہ نظریں کسی اور طرف تھیں اس لئے سامنے سے آتے ہوئے ایک قد آور اور تنومند شخص سے ٹکرا گئے ۔ اس نے گھور کر دیکھا تو فوراً معذرت کرلی۔ وہ عربی میں کچھ کہتا ہوا آگے چلا گیا۔

بٹ صاحب نے کہا”خان صاحب یہ آپ کو گالیاں دے رہا ہے۔“

خان صاحب کا موڈ ایک دم فرحت بخش ہوگیاتھا ۔ بولے۔” کوئی بات نہیں عربی میں ہی تو گالیاں دے رہا ہے ۔ یہ سعادت بھی کچھ کم نہیں ہے ورنہ ہم تو آج تک اردو‘ انگریزی اور پنجابی میں ہی گالیاں سنتے رہے ہیں۔“

اس کے بعد انہوں نے ہم سے کہا” اس سٹور میں کافی کام کی چیزیں نظر آرہی ہیں کیوں نہ ہم بھی ایک جائزہ لے لیں۔“

بٹ صاحب بولے ۔”مگر اس سٹور میں ہوٹل نہیں ملے گا۔ ہمیں اس وقت ہوٹل کی ضرورت ہے“ خان صاحب نے انہیں گھورا تو کہنے لگے۔”میں جانتاہوں آپ بگڑ چکے ہیں۔ بہت زیادہ بگڑ چکے ہیں۔ اب آپ کا پاکستان میں گزارا نہیں ہوسکتا۔“

کچھ فاصلے پر فٹ پاتھ پر ایک ریستوران نظر آرہاتھا۔ یورپی ملکوں کے انداز میں چھوٹی چھوٹی میزیں اور کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ سروں پر رنگین چھاتوں کا سایہ تھا۔ فیصلہ ہوا کہ کیوں نہ کولڈ ڈرنکس پی کر سفر جاری رکھا جائے ۔ ہم نے اپنے اپنے سوٹ کیس ایک جانب کھڑے کردیے اور خود ایک میز کے گرد جاکر بیٹھ گئے۔ ایک ویٹر نے بڑے ادب سے آکرکہا”کیا خدمت کرسکتا ہوں؟“ انگریزی بالکل صحیح تھی۔ قاہرہ میں پہنچنے کے بعد ہم نے معقول انگریزی بولنے والا پہلا آدمی دیکھاتھا۔ اس کو دیکھ کر اور اس سے باتیں کرکے بالکل ویسی ہی خوشی ہوئی جیسی کہ پردیس میں کسی ہم زبان سے مل کر ہوتی ہے۔ اس نے کولڈ ڈرنکس کے تین گلاس ہمارے سامنے لاکر رکھ دیے اور پوچھا۔”ٹورسٹ ہیں؟“

”ہاں۔“

”لندن سے ۔“ بٹ صاحب نے فوراً حاضر جوابی کا مظاہرہ کیا۔

خان صاحب نے کہا۔” فی الحال ہم لندن سے آئے ہیں مگر ہم پاکستانی ہیں۔“

”مرحبا۔ بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر ۔ آپ ہمارے مسلم برادر ہیں۔“

جب اس نے رشتے داری نکال ہی لی تو ہم نے سوچا کہ کیوں نہ اس کے سامنے اپنی مشکل بیان کی جائے۔ ممکن ہے کام آسکے۔ چنانچہ ہم نے اسے بتایا کہ ہمیں ایک اچھے ہوٹل کی تلاش ہے جو زیادہ مہنگا نہ ہو۔

اس نے کہا ۔”ٹورسٹ سیزن ہے۔ ان دنوں قاہرہ کے سبھی چھوٹے بڑے ہوٹل بھرے رہتے ہیں مگر پھر بھی کہیں نہ کہیں جگہ تو نکل ہی آتی ہے۔“

”تم ہماری اس سلسلے میں مدد کرسکتے ہو؟“

بولا۔”میں تو شاید آپ کی مدد نہ کرسکوں مگر ایک شخص کو جانتا ہوں جو آپ کی یہ مشکل آسان کرسکتا ہے۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں؟“

”یہ صاحب آپ کی مدد کرسکتے ہیں۔“

”مگر وہ ہیں کہاں؟“

”وہ ٹائیلٹ میں گئے ہوئے ہیں۔ ابھی آجائیں گے۔ “ پھر کچھ سوچ کر بولا۔” مگرایک بات بتائیے ۔ آپ ان سے لڑائی جھگڑا تو شروع نہیں کردیں گے؟“

ہم نے حیران ہوکر دیکھا۔”بھئی ہمیں کیاضرورت ہے جھگڑنے کی؟“

دراصل وہ ایک انڈین ہیں اور میں نے سنا ہے کہ انڈیا اور پاکستان کے تعلقات اچھے نہیں ہیں۔“

ہم سوچ میں پڑ گئے‘ واقعی بات تو درست تھی۔ اس سے پہلے بیرون ملک ہمارا جتنے انڈین حضرات سے واسطہ پڑا تھا ان کے متعلق ہمارا تجربہ خوشگوار نہیں تھا ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انڈیا کے ہندو ملک سے باہر بھی تنگ دلی اور تعصب سے

باز نہیں آتے۔

ہمارے کچھ کہنے سے بیشتر ہی ریستوران کے اندر سے ایک صاحب برآمد ہوئے ۔ وہ بش شرٹ اور پتلون میں ملبوس تھے۔ کلین شیو تھے اور خاصے اسمارٹ نظر آرہے تھے۔ انہوں نے آتے ہی میز پر سے اپنا بیگ اٹھایا مگر ہم لوگوں پر نظر پڑی تو مسکراتے ہوئے ہمارے میز پر چلے آئے۔

"ہیلو؟"

آپ بھی برصغیر سے تعلق رکھتے ہیں؟" انہوں نے انگریزی میں پوچھا۔

ہم نے اردو میں جواب دیا۔ "جی ہاں ۔ہم پاکستانی ہیں۔"

" بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔" اس بار انہوں نے بھی اردو میں جواب دیا۔"مجھے یہاں آئے ہوئے ایک ماہ ہوگیا مگر پہلی بار کوئی اردو بولنے والا ملا ہے۔ ورنہ یہاں انگریزی بھی کام نہیں آتی۔"

ہم نے انہیں بیٹھنے کی دعوت دی ۔ "کیا پئیں گے؟"

"شکریہ۔ میں ناک تک بھرا ہوا ہوں۔" پھر برابر میں کھڑے ہوئے سوٹ کیس دیکھ کرپوچھا۔"آپ تو شاید آج ہی قاہرہ پہنچے ہیں؟"

"آپ نے بالکل درست اندازہ لگایا مگر ہوٹل کی بڑی مشکل ہے۔ ویٹر نے بتایا تھاکہ آپ اس سلسلے میں ہماری مدد کرسکتے ہیں؟"

وہ ہنسنے لگے ۔" یہ ہادی تو مجھے امرت دھارا سمجھتا ہے مگر ہوٹل کے معاملے میں ، میں آپ کے ضرور کام آسکتاہوں۔"

ہم نے خوش ہوکر ان کی طرف دیکھا۔

"میں جس ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہوں' وہ یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ وہاں آپ کو جگہ بھی مل جائے گی۔ اچھا ہوٹل ہے اور زیادہ منگا بھی نہیں ہے۔"

ہمارے دل کی مراد یوں برآئے گی' یہ ہمارے وہم وگمان میں بھی نہ تھا۔"تو پھر ہمیں اس کانام اور پتا بتادیجئے۔"

"ارے نہیں جناب' یہ تو میزبانی کے اصولوں کے خلاف ہے۔ سرکار میں خود آپ کو وہاں لے کر چلوں گا' میں وہیں جارہاہوں۔"

ہم فوراً" کرسیوں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ویٹر نے بل ہمارے سامنے رکھ دیا تھا۔ ہم نے دو پونڈ کے نوٹ میز پر رکھے اور ویٹر سے کہا۔"مسٹرہادی باقی چینج آپ رکھ لیجئے۔"

"آیئے چلیں۔" اُن صاحب نے بڑی بے تکلفی سے کہا "ہمیں دو ٹیکسیوں میں چلنا پڑے گا۔"

"دو ٹیکسیوں کی کیا ضرورت ہے ایک ہی کافی ہے۔"

"جی نہیں ' قاہرہ میں ٹیکسی ڈرائیورتین سے زیادہ مسافر نہیں بیٹھاتے ' یہ قانون ہے۔

ہمیں اپنا ملک یاد آگیا جہاں پورا پورا خاندان ایک موٹر رکشہ میں سما جاتا ہے۔

"یہاں کے ٹیکسی والے قانون کی سختی سے پابندی کرتے ہیں ۔ میں ٹیکسی منگاتا ہوں۔" یہ کہہ کر انہوں نے سامنے سے گزرنے والی ایک ٹیکسی کو اشارہ کیا۔ ٹیکسی ہمارے سامنے آکر ٹھہر گئی۔ انہوں نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا "الریاض ہوٹل ۔ الولید۔" اور ہماری طرف اشارہ کردیا۔

ٹیکسی والے نے سرہلایا اور باہر نکل کر ہمارا سامان ٹیکسی میں رکھ دیا۔ ہم بھی ٹیکسی میں لد گئے۔ ان صاحب نے کہا"آپ ہوٹل پہنچ کر میرا انتظار کیجئے ۔جیسے ہی دوسری ٹیکسی ملتی ہے' وہاں پہنچتا ہوں۔"

ہماری ٹیکسی حرکت میں آئی تو بٹ صاحب چپ نہ رہ سکے ۔"یہ آدمی نہیں فرشتہ ہے۔"

ہم نے کہا "آپ نے اس لباس اور حلیہ میں بھی پہچان لیا؟"

"واقعی بہت شریف آدمی ہے۔ انڈین ہے تو کیا ہوا۔ ہے تو مسلمان ۔"یہ خان صاحب تھے۔

"آپ کو کس نے بتایا کہ یہ مسلمان ہے؟" ہم نے پوچھا۔

" اس کی حرکتوں نے ۔ اعلی اخلاق اور جذبہ ہمدردی نے۔ فوراً" ہماری مدد کیلئے تیار ہوگیا۔ دراصل اسلام کا رشتہ دنیا کے تمام رشتوں سے زیادہ مضبوط اور

طاقتور ہے۔" وہ باقاعدہ تقریر کرنے کے موڈ میں آگئے تھے۔

ٹیکسی کئی سڑکوں سے گزرتی ہوئی ایک ایسے علاقے میں پہنچ گئی جو تجارتی نہیں بلکہ رہائشی نظر آرہاتھا۔ یہیں چند ہوٹل بھی نظر آئے۔ آخر کار ہماری ٹیکسی ایک بڑے سے گیٹ میں داخل ہوگئی۔ سامنے سفید رنگ کی ایک خوشنما عمارت نظر آرہی تھی۔ جس کے سامنے خاصا بڑا لان تھا۔ یہی ہوٹل الریاض تھا۔ عمارت کے سامنے ستونوں والا ایک وسیع برآمدہ تھا۔ جس میں کافی چہل پہل نظر آرہی تھی۔ آرام دہ کرسیوں پر کچھ خواتین حضرات بیٹھے گپ شپ میں مصروف تھے اور سب کے سب یورپین تھے۔

"اب ملی ہے مطلب کی جگہ۔"خان صاحب نے خوش ہوکر کہا۔ انہیں سفید چمڑی والوں کو دیکھ کر اتنی خوشی ہوئی تھی جتنی کے بچھڑے ہوئے عزیزوں سے مل کر ہوتی ہے۔ بٹ صاحب کا کہنا بالکل درست تھا۔خان صاحب کافی بگڑ چکے تھے۔

ٹیکسی والے نے ہم سے بائیس پاؤنڈ طلب کیے۔ زبان تو عربی تھی مگر رقم اس نے انگریزی میں بتائی تھی۔ اس لئے سامان باہر رکھتے ہی ایک وردی پوش لوڈر ٹرالی لیے ہوئے کسی طرف سے برآمد ہوا۔مسکرا کر ہمیں سلام کیا اور ہمارا سامان ٹرالی میں لاد کر بڑے اخلاق سے انگریزی میں کہا"میرے ساتھ آئیے۔"

وہ نہ بھی کہتا تو ہم اپنے سامان کی خاطراس کے پیچھے پیچھے ہی جاتے۔ چند سیڑھیاں طے کرکے برآمدے میں پہنچ گئے۔جبکہ وہ ایک اور راستے سے ہمارا سامان لے کر آگیا۔ اس کا ارادہ اندر استقبالیہ میں جانے کا تھا مگر ہم نے اسے روک دیا اور کہاکہ ہمیں کسی کا انتظار ہے۔

"ویری ویل سر۔" وہ ٹرالی ایک طرف رکھ کر رخصت ہوگیا۔ برآمدہ خاصا کشادہ اور آرام دہ تھا۔ گول گول سفید ستونوں کی وجہ سے اس کی شان کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ ہم نے سامنے رکھی ہوئی آرام دہ کرسیوں پر جگہ سنبھالی اور ماحول کا جائزہ لینے لگے۔ برآمدے میں موجود سبھی مسافر یورپین تھے۔ ان کے سامنے بیئراور شراب کے گلاس رکھے ہوئے اور وہ گپ شپ میں مصروف تھے۔

"اب پتا چل رہا ہے کہ ہم قاہرہ میں آئے ہیں۔" خان صاحب نے مطمئن ہوکر کہا۔ اتنی دیر میں ایک اور ٹیکسی سامنے آکر رک گئی اور اس میں سے ہمارے محسن برآمد ہوئے۔

"ارے آپ لوگ یہاں کیوں بیٹھ گئے؟"

"آپ کے انتظار میں۔"

"بہت نوازش۔ آیئے آپ کی بکنگ کا بندوبست کریں۔"

ہمارے اٹھتے ہی لوڈر پھر کہیں سے چراغ الہ دین کے جن کی طرح نمودار ہوگیا۔

استقبالیہ پر پہنچے تو جی خوش ہوگیا۔ نہایت خوشگوار ماحول تھا۔ اس لحاظ سے کہ خواتین کی تعداد مرد حضرات سے زیادہ تھی۔ آرائش اور رکھ رکھاؤ بھی اچھا تھا۔ لابی میں خاصی رونق تھی۔ زیادہ تعداد یوروپین لوگوں کی ہی تھی۔ حیرت اس بات پر ہوئی کہ اس اعلی معیار کے باوجود کرایہ نہایت معقول تھا اور یہ سب کچھ ہمیں اتفاقاً ہی دستیاب ہوگیاتھا۔

چیک ان ہونے کے بعد پہلے تو ہم اپنے کمروں میں گئے۔ کمرے خاصے آرام دہ اور سلیقے سے سجے ہوئے تھے۔ ہمارے مہربان نے بتایا کہ ان کا کمرہ ۶۲۸۰ بھی اسی گیلری میں واقع ہے۔ پھرپوچھا۔"آپ کا پروگرام کیا ہے؟آرام کریں گے یا گھومنے کا ارادہ ہے؟"

ہم نے کہا۔"آرام کرنے کا تووقت ہی نہیں ہے۔بس ذرا تازہ دم ہوکر باہر نکلیں گے۔"

بولے"میں آپ کو لابی میں ملوں گا۔"

نہا دھوکر لباس تبدیل کرنے کے بعد ہم لوگ لابی میں پہنچے تو وہ ہم سب سے

پہلے وہاں موجود تھے۔ کہنے لگے۔"یہاں کا موسم ایسا ہے کہ دن میں کم ازکم دو بار نہانا ضروری ہے۔" وہ خود بھی غسل کرکے کپڑے تبدیل کرکے آئے تھے۔

ہم نے کہا۔"کتنے حیرت کی بات ہے کہ اب تک ہم لوگوں کا آپس میں تعارف بھی نہیں ہوا ہے۔ ہمیں صرف اتنا معلوم ہے کہ آپ کا تعلق انڈیا سے ہے۔"

کہنے لگے۔"اور آپ شاید پاکستان سے آئے ہیں؟"

"خوب پہچانا آپ نے ۔" اس کے بعد ہم نے اپنا اور اپنے ساتھیوں کا ان سے تعارف کرایا۔

انہوں نے سب سے مصافحہ کیا پھر بولے۔"میرا نام راجندر ناتھ ہے۔"

ہم پر تو جیسے بجلی گرگئی۔ ایک ہندوستانی اور وہ بھی ہندو اس قدر ہمدرد اور کارآمد رہا۔ ہمیں اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ یہی حال خان صاحب اور بٹ صاحب کا بھی تھا۔خان صاحب تو اپنے طورپر فیصلہ کرہی چکے تھے کہ وہ لازماً" مسلمان ہوں گے۔ کسی ہندو سے وہ ایسے حسن سلوک کی توقع بھی نہیں کرسکتے تھے۔

"آپ لوگ تو ٹورسٹ ہیں مگر میں یہاں کاروبار کے سلسلے میں آیا ہوں۔ ایک ماہ سے یہاں ٹھہرا ہوا ہوں ۔ ہوسکتا ہے کہ دو تین ہفتے اور لگ جائیں۔"

پہلے تو انہوں نے ہمیں یہ مشورہ دیا کہ ہمیں کون کون سی جگہیں دیکھنی چاہئیں اور اس کے لئے موزوں ترین طریقہ کیا ہوگا ۔ اس کے بعد بولے"میں اتوار کے علاوہ دن کے وقت آپ کا ساتھ نہ دے سکوں گا۔ شام کو اگر چاہیں گے تو ضرور آپ کے ساتھ وقت گزارنا پسند کروں گا۔"

اسی وقت استقبالیہ کی طرف سے ایک سٹیورٹ تیزی سے ہمارے پاس آئے اور راجندر ناتھ کو مخاطب کرکے بولے۔"السید آپ کیلئے فون کال ہے۔"

راجندر ناتھ نے ہم سے معذرت کی اور فون سننے چلے گئے۔

خان صاحب حیرت سے دیکھتے رہے پھر بولے۔"آپ نے سنا جو میں نے سنا؟"

"ہاں وہ راجندر ناتھ کو السید کہہ رہا تھا۔"

"لاحول ولا قوۃ ۔" بٹ صاحب سخت ناراض نظر آرہے تھے۔"ان مصریوں کو کیا ہوگیا ہے۔ ایک ہندو کو سادات میں شامل کردیا!"

ہم نے کہا۔"ناراض ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں سید مسٹر کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ان کا یہی طریقہ ہے۔"

"نہایت بے ہودہ طریقہ ہے۔ مجھے یہ شخص برا لگنے لگا ہے۔"

ہم نے کہا"یہ تو بہت ناانصافی ہے۔ اس میں راجندر ناتھ بے چارے کا کیا قصور ہے اور پھر اس نے ہمارے ساتھ کتنا اچھا برتاؤ کیا ہے۔ ایسا انڈین ہم نے پہلی بار دیکھا ہے جو پاکستانیوں سے نفرت نہیں کرتا۔"

بٹ صاحب کے کچھ بولنے سے پہلے راجندر ناتھ واپس آگئے اور معذرت کرنے کے بعد بولے۔"مجھے ایک ضروری میٹنگ کیلئے جانا ہوگا۔ اس لئے اجازت چاہتا ہوں ۔ شام کو سات بجے میں اپنے کمرے ہی میں رہوں گا۔اگر آپ پسند فرمائیں تو ضرور تشریف لائیں۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے رخصت ہوگئے۔

ہم نے کہا۔" ایک بات تو ماننی پڑے گی ۔ وہ سید ہے یا نہیں مگر اردو کتنی اچھی بولتا ہے۔"

"بلند بااخلاق بھی کتنا ہے؟"

"اچھا اب تعریفیں رہنے دو۔ کہیں چلو گے بھی یا یہیں بیٹھے اس کے قصیدے پڑھتے رہو گے!" بٹ صاحب ابھی تک اس صدمے پر قابو نہیں پاسکے تھے۔

راجندر ناتھ نے بتایا تھا کہ اہرام دیکھنے کیلئے اب وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ البتہ شہر کی سیر کرنے کیلئے یہ اچھا موقع ہے۔ اہرام کیلئے تو پورا ایک دن مخصوص کرنا ہوگا۔ اسی طرح قاہرہ کے دوسرے تاریخی مقامات اور یادگاریں دیکھنے کیلئے بھی کم ازکم ایک دن درکار ہوگا۔ شامیں شہر کی رونق دیکھنے میں یا نائٹ کلبوں میں رقص وموسیقی سے لطف اندوز ہونے میں صرف کی جاسکتی ہیں۔

بٹ صاحب بولے۔" میں سب سے پہلے دریائے نیل دیکھنا چاہتا ہوں۔"

یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ ہمیں ابھی تک دریائے نیل کے نزدیک سے گزرنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ حالانکہ یہ دریا شہر کے درمیان سے گزرتا ہے اور قاہرہ میں گھومتے ہوئے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ آپ بار بار دریائے نیل کو عبور نہ کریں۔

دریائے نیل پر چھ پل ہیں جو دریا کے دونوں کناروں کی آبادیوں کو ملاتے ہیں۔ ان پلوں پر دن رات آمدورفت جاری رہتی ہے۔

"دریائے نیل دیکھنا تو کچھ مشکل نہیں ہے۔ ہم ابھی چل کر دیکھ لیتے ہیں۔"

کہنے لگے۔"مجھے وہ جگہ دیکھنی ہے جہاں فرعون اپنے لشکر سمیت ڈوب گیا تھا۔"

خان صاحب بولے"یار کبھی عقل کی بات بھی کرلیا کرو۔ فرعون قاہرہ میں تو نہیں رہتا تھا۔ وہ جگہ بہت دور ہوگی۔"

"پھر ہمیں اسی جگہ چلنا چاہئے۔" بٹ صاحب نے کہا۔ "ہمیں اپنی سیر کا آغاز ایک نیک کام سے کرنا چاہئے۔ کیوں کیا خیال ہے؟"

ہم نے کہا۔"اچھا یہاں سے تو باہر نکلو۔ آپ کیلئے دریائے نیل ہوٹل میں تو نہیں آئے گا۔"

ٹیکسی بہت آسانی سے مل گئی۔ قاہرہ میں کم ازکم ٹیکسیوں کی کمی نظر نہیں آئی۔ ہر جگہ اور ہروقت دستیاب ہوجاتی ہے۔ عام طورپر ٹیکسی والے کوئی نخرہ نہیں کرتے اور نہ ہی کرائے پر جھگڑا کرتے ہیں۔اول تو زیادہ تر ٹیکسیاں میٹر کے مطابق چلتی ہیں۔اگر میٹر نہ ہو تب بھی معقول کرائے پر راضی ہوجاتے ہیں۔

ٹیکسی میں بیٹھتے ہی ایک انتہائی شیریں آواز نے ہمارا استقبال کیا۔ یہ آواز ٹیکسی میں لگے ریڈیو سے آرہی تھی اور مصر کی مقبول ترین مغنیہ ام کلثوم کی آواز تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور نغمہ سن کر باقاعدہ جھوم رہا تھا۔ پہلے تو ہم سمجھے کہ شاید کسی خاص بول پر جھوم رہاہے مگر جب اس پر وجد کا عالم مسلسل طاری رہا تو خان صاحب نے پریشان ہو کر کہا۔"کہیں وجد کے عالم میں یہ حادثہ نہ کردے۔ اسے روکنے کی کوئی ترکیب کرنی چاہئے۔"

مگر یہ مسئلہ خود ٹیکسی ڈرائیور نے حل کردیا۔ اس نے ریڈیو کی آواز قدرے کم کی اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں دریافت کیا۔"پاشا کہاں تشریف لے جائیں گے؟"

ہم نے کہا"الجزیرہ چلیں گے۔"

"الجزیرہ کس جگہ؟" اس نے پوچھا۔یہ ہمیں بعد میں معلوم ہوا کہ الجزیرہ قاہرہ کا سب سے بارونق اور خوبصورت علاقہ ہے اور میلوں تک پھیلا ہوا ہے۔ بڑے بڑے ہوٹل ، تجارتی دفاتر، شاپنگ سینٹرز اور اہم مقامات اس علاقے میں ہی واقع ہیں۔

ہم نے کہا۔"ہوٹل شیرٹن چلیں۔"

یہ ہم نے محض اندازے سے ہی کہا تھا کیونکہ راجندر ناتھ کے کہنے کے مطابق تمام بڑے بڑے ہوٹل اسی علاقے میں واقع تھے۔

ٹیکسی والے نے سرہلایا، موسیقی کی آواز بلند کردی اور دوبارہ جھومنا شروع کردیا۔ یہ محض اتفاق ہی تھا کہ ہمیں قاہرہ میں جو پہلی دو ٹیکسیاں ملی تھیں ان کے ڈرائیوروں کو موسیقی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ورنہ اس کے بعد ہم نے جتنی بھی ٹیکسیوں میں سفر کیا سبھی موسیقی سنتے اور جھومتے ہوئے پایا۔ مصریوں کو موسیقی کا بہت شوق ہے۔ چھوٹے بڑے، عورت مرد، امیر غریب سبھی کو موسیقی کے دلدادہ ہیں اور ہر وقت موسیقی سننا چاہتے ہیں۔ ام کلثوم مصر کی محبوب ترین گلوکارہ ہے۔ مصر ہی کیا، اسے دنیائے عرب کی سب سے مقبول آواز کہنا زیادہ بہتر ہوگا۔ شہروں کے عالیشان مکانوں سے لے کر بدوؤں کے خیموں تک ام کلثوم کے نغمے بڑے ذوق وشوق سے سنے جاتے ہیں۔ مصر میں ام کلثوم کو وی آئی پی کی حیثیت حاصل ہے۔ بادشاہ ، صدر مملکت، سبھی اس کا احترام کرتے رہے اور اس کے پرستاروں میں شامل رہے۔ سنا ہے کہ شاہ فاروق بھی ام کلثوم کے پرستاروں میں شامل رہے۔ انقلاب کے بعد جب جمال عبدالناصر مصر کے صدر بنے تو وہ بھی ام کلثوم کے شیدائی تھے ۔ ام کلثوم کا گانا سننے کیلئے وہ بذات خود موسیقی کے پروگراموں میں بھی چلے جاتے تھے۔ ام کلثوم کو عرب دنیا کی بے تاج ملکہ کہا جاتا تھا۔ وہ جب بھی کوئی نیا نغمہ پیش کرنے کا اعلان کرتی تھیں تو دنیائے عرب کے مختلف گوشوں سے شائقین اور پرستار ہوائی جہاز چارٹر کرکے قاہرہ پہنچ جاتے تھے۔ان کے ہر نئے نغمے کی پبلسٹی صرف روزنامہ "الاہرام" میں ہوتی تھی۔ انقلاب کی سالگرہ کے موقع پر بھی بطور خاص ایک نیا نغمہ پیش کرتی تھیں اور صدر جمال الناصر بھی ان کا نغمہ سننے کے لئے تھیٹر میں پہنچ جاتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے جس سے ام کلثوم کی شخصیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک بار ام کلثوم

کے اسٹیج پر جانے سے پہلے صدر جمال ناصر تھیٹر میں تشریف فرما ہو چکے تھے اور انہوں
نے یہ فرمائش کی کہ پہلے ان کا پسندیدہ نغمہ "ہلادی بلادی' میرے وطن" گایا جائے۔
صدر کے اسٹاف نے فوراً" یہ فرمائش آرکسٹرا والوں تک پہنچا دی اور آرکسٹرا نے اس
نغمے کی دھنیں بجانی شروع کر دیں۔ ام کلثوم اسٹیج پر آئیں تو انہوں نے آرکسٹرا کو
خاموش ہونے کا اشارہ کیا اور مائیکرو فون پر سامعین سے خطاب کرتے ہوئے
کہا۔"جمال ناصر ہمارے رئیس ہیں۔ میں ان کا احترام کرتی ہوں ۔ یہ میری عزت
افزائی ہے کہ وہ یہاں تشریف فرما ہیں مگر اس وقت وہ نیچے ہال میں بیٹھے ہیں اور میں
اونچے سٹیج پر ہوں۔ کسی کو مجھے یہ حکم دینے کی جرات نہیں ہو سکتی کہ یہ گاؤ اور یہ نہ
گاؤ۔"

سارے ہال میں سناٹا چھا گیا پھر جمال ناصر نے تالیاں بجا کر اس اعلان کا خیر
مقدم کیا اور سبھی تالیاں بجانے لگے۔ ام کلثوم نے محفل میں وہی نغمہ سنایا جو اس
موقع کیلئے تیار کیا گیا تھا۔ اس سے ام کلثوم کے اثر و رسوخ اور مقبولیت کا اندازہ لگایا
جا سکتا ہے۔ عام مصری تو ام کلثوم کے نغموں کے عاشق تھے اور اس کی آواز سن سن کر
نہیں تھکتے تھے مگر دوسرے گلوکاروں اور موسیقاروں کی قدر و منزلت بھی بہت زیادہ تھی
مگر ہم نے جتنے بھی نغمے سنے ہمیں تو دھن اور گائیکی کے اعتبار سے سبھی ایک جیسے
لگے۔ مصریوں کیلئے موسیقی صحیح معنوں میں روحانی غذا کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے
بغیر وہ نہیں رہ سکتے۔ عام گھروں سے بھی دن رات موسیقی کی دھنیں سنائی دیتی ہیں اور
کئی لوگ گلوکاروں کی آواز میں آواز ملا کر خود بھی گاتے ہیں۔

الجزیرہ کا علاقہ دور ہی سے نظر آ گیا۔ اس کو قاہرہ کا دل کہا جائے تو غلط نہ
ہوگا۔ خوبصورت فلک بوس عمارتیں فخر سے سر اٹھائے کھڑی تھیں اور دور ہی سے نظر
آ رہی تھیں ۔ یہ دن کا وقت تھا ۔ رات کے وقت یہ سارا علاقہ روشنیوں کا سمندر
معلوم ہوتا ہے۔ سڑکیں کشادہ' روشن اور ماڈرن ہیں ۔ فلائی اوور بھی نظر آئے پھر ہم
ایک پل پر سے گزرے ۔ ٹیکسی ڈرائیور نے بتایا کہ اب ہم لوگ دریائے نیل کے پل
سے گزر رہے ہیں۔ ہم سب نے بے تابی سے باہر جھانکا اور اس تاریخی دریا کو دیکھنے کی
کوشش کی مگر سخت مایوسی ہوئی۔ دریائے نیل کے دونوں کنارے پختہ تھے مگر دریا برائے

نام ہی تھا۔ پانی کم تھا اور شفاف بھی نہیں تھا' نہ ہی چوڑائی زیادہ تھی۔ پل بھر میں
ٹیکسی نے پل عبور کر لیا۔

"کمال ہے" بٹ صاحب نے کہا۔"ایسا ہوتا ہے دریائے نیل جس کی اتنی
شہرت ہے۔"

ہم نے کہا "بٹ صاحب ۔ آپ بلاوجہ غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں۔ دریائے
نیل بہت عظیم دریا ہے۔ مصر کی معیشت اور زراعت کا انحصار اسی پر ہے۔ اسے مصر
کی شہ رگ کہا جاتا ہے۔ موقع ملا تو آپ کو نیل کی اصل شکل و صورت بھی دکھا دیں
گے؟"

کشادہ سڑکوں پر ٹریفک کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ کاریں بڑے سلیقے سے قطاروں
میں چل رہی تھیں۔ بسیں بھی نظم و ضبط کے ساتھ رواں دواں تھیں۔ البتہ اس سڑک
پر ہمیں کوئی گدھا گاڑی نظر نہیں آئی۔

بٹ صاحب دور کی کوڑی لائے۔"شاید اس سڑک پر گدھوں کا داخلہ بند
ہے!"

خان صاحب سنجیدگی سے بولے ۔"آپ ذرا سر نیچا کر کے بیٹھ جائیں تاکہ
باہر سے نظر نہ آئیں۔"

بٹ صاحب پہلے تو نہیں سمجھے مگر پھر بے ساختہ ہنس پڑے ۔

ایک جگہ ٹیکسی ڈرائیور نے گاڑی روک دی اور کہا۔"یا اخی ہوٹل
شیرٹن۔"

سامنے شیرٹن کی بلند و بالا اور شاندار عمارت نظر آ رہی تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور کو
فارغ کرنے کے بعد سوال یہ تھا کہ اب کہاں جائیں؟

"سب سے پہلے تو شیرٹن کے اندر جائیں۔ آخر ہم اتنی دور سے شیرٹن کا پتا
بتا کر یہاں پہنچے ہیں۔ کم از کم چائے یا کافی کا ایک ایک کپ تو پی لینا چاہئے۔"

شیرٹن کی رونق اور آرائش دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی اور ہر طرف غیر
ملکیوں کی ریل پیل تھی۔ ایک جانب کرنسی تبدیل کرنے کیلئے کاؤنٹر تھا جس کے پیچھے
ایک گندمی رنگ کی خوش وضع خاتون بیٹھی مسکرا رہی تھیں۔ انہیں دیکھتے ہی خان

صاحب کو فوراً" کرنسی تبدیل کرنے کی ضرورت پیش آگئی۔ واپس آکر انہوں نے اطلاع دی کہ وہ لڑکی تو انگریزوں کی طرح انگریزی بولتی ہے۔ ظاہر ہے شیرٹن جیسے ہوٹل میں انگریزی بولنے اور سمجھنے والوں کی بھلا کیا کمی ہو سکتی تھی۔ یہاں چائے اگرچہ خاصی مہنگی تھی مگر اچھی تھی۔

خان صاحب نے کہا۔"پیسے تو ہم نے دراصل رونق دیکھنے کے ادا کیے ہیں۔ چائے تو مفت میں ملی ہے۔"

اس ماحول کو دیکھ کر قاہرہ کی اہمیت کا احساس ہوا۔ ہوٹل سے باہر نکلے تو ہر طرف قاہرہ کا حسن و جمال بکھرا ہوا تھا۔ سڑکیں' فٹ پاتھ' بازار' دکانیں' دفاتر' ہوٹل' رہائشی عمارتیں سبھی یوروپین انداز کی تھیں۔ صاف ستھری اور بہت منظم سڑکوں پر ٹریفک بڑے قاعدے قانون کے ساتھ چل رہا تھا۔ بعد کے تجربات اور مشاہدات سے اس بات کی تصدیق ہوگئی کہ قاہرہ میں قانون کی پابندی کی جاتی ہے اور قانون سب کیلئے یکساں ہے۔ بہر صورت اس کا بول بالا ہے۔ ایک بار عالمی ادارہ صحت نے آب زم زم کا تجزیہ کرنے کے بعد یہ فیصلہ صادر کیا تھا کہ آب زم زم صحت کیلئے مضر ہے۔ چنانچہ مصری حکومت نے زم زم کے داخلے پر کڑی پابندی لگا رکھی تھی اور حجاج کرام کی واپسی پر آب زم زم کو حاجی کیمپ میں انڈیل دیا جاتا تھا۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ قانون نافذ کرنے کے سلسلے میں حکومت کس قدر مستعد تھی۔ کہتے ہیں ایک بار صدر ایوب نے جمال ناصر کو اپنے مخصوص اور پسندیدہ آموں کا تحفہ بھیجا۔ اس زمانے میں مصری حکام نے آموں کی درآمد پر پابندی عائد کررکھی تھی۔ کسٹم کے حکام نے آموں کے تحفے کو ائرپورٹ پر روک لیا تو ایک سفارتی ہنگامہ کھڑا ہوگیا۔ یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ ایک غیر ملکی صدر نے بطور خاص مصر کے صدر کے لئے آموں کا تحفہ بھیجا تھا۔ مصری صدر نے بالآخر اس مسئلے کا قانونی حل تلاش کرلیا۔ وہ یہ تھا کہ محکمہ زراعت کا ایک افسر اور سفارت خانے کے ایک افسر ساتھ جائے گا آموں کے دانے گن کر صدارتی محل میں بھیجے گئے۔ جمال ناصر اور ان کے ساتھیوں نے ایوب خان کے بھیجے ہوئے لذیذ اور خوشبودار آموں کی ضیافت اڑائی اور آموں کی گٹھلیاں گن کر واپس کردی گئیں۔ جنہیں زراعت کے حکام کے سامنے جلاکر راکھ کردیا گیا۔ قاہرہ میں

ٹریفک کا نظم اور قانون کی پاسداری دیکھ کر ہمیں بہت رشک آیا۔ یورپ کے بعد کسی مشرقی ملک کے شہر میں جانے کا یہ پہلا اتفاق تھا اور اس معاملے میں ہم نے اسے اپنے ملک کے مقابلے میں بدرجہا بہتر پایا۔ اس زمانے میں تو ہمارے یہاں پھر بھی ٹریفک میں کوئی نظم وضبط اور سلیقہ تھا۔ آج کل تو یوں لگتا ہے کہ جیسے کوئی قانون ہی نہیں ہے اور ٹریفک ہی پر کیا منحصر ہے۔ دوسرے قوانین کی کون سی پابندی کی جاتی ہے مگر یہ ایک الگ دکھ بھری کہانی ہے۔

3

الجزیرہ کے علاقے میں ہم پیدل ہی گھومتے رہے۔ غیر ملکیوں کی تعداد ہر جگہ بہت زیادہ نظر آئی۔ مصری مرد اور عورتیں بھی ماڈرن ہی تھے لیکن سیدھے سادے لباسوں میں عام لوگ اور خواص بھی نظر آجاتے تھے۔ اسٹور سامان سے بھرے ہوئے تھے اور ان میں غیر ملکی اشیاء کے علاوہ ملکی مصنوعات بھی تھیں جو معقول قیمتوں پر دستیاب تھیں۔ ہم تینوں نے ایک ایک مصری جوتا خریدا۔ بٹ صاحب کو ایک قمیص بھی پسند آئی مگر اس کی قیمت بہت زیادہ تھی۔

بولے ”مہنگی ہے تو کیا ہوا۔ مصر کی یادگار رہے گی۔ پہنیں گے تو لوگوں کو پتا چل جائے گا کہ یہ بھی مصر گئے تھے۔“

ہم نے کہا”مگر لوگوں کو پتا کیسے چلے گا۔ کیا آپ قمیص کے اوپر یہ عبارت لکھوائیں گے یہ قمیص مصری ہے اور قاہرہ میں خریدی گئی تھی؟؟“

مگر بٹ صاحب نے وہ قمیص خرید لی۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ اسی وقت اسے زیب تن فرمالیں لیکن ہوٹل واپس پہنچتے ہی انہوں نے فوراً قمیص اتار کر مصری قمیص پہن لی۔

خرید و فروخت کے معاملے میں مصریوں کا حال عجیب ہے۔ مول تول اور بھاؤ

تاؤ کے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا۔ عام دکانوں پر تو خیر بھاؤ تاؤ کرنا عجیب نہیں لگتا مگر حیرت تو اسوقت ہوتی ہے جب بڑے اسٹوروں پر فیشنل ایبل سیل گرلز بھی اسی کام میں مصروف نظر آتی ہیں۔ ان کی گفتگو کا آغاز اس بات سے ہوتا ہے کہ ’ دیکھیے آپ کیلئے رعایت ہے‘

کچھ دیر تو خان صاحب چپ رہے پھر کہنے لگے۔”یار ہم پہلی بار قاہرہ آئے ہیں اور ان سے بھی ساری زندگی میں ہماری پہلی ملاقات ہو رہی ہے۔ اس کے باوجود یہ ہمارے لیے خاص رعایت کیوں کر رہے ہیں؟؟“

”ہمیں بے وقوف بنا رہے ہیں۔“ بٹ صاحب نے کہا۔

مگر ان بے چاروں کو یہ معلوم نہیں تھا کہ مول تول کے میدان میں پاکستانی بھی کسی سے کم نہیں ہیں۔

مصری بہت باتونی ہوتے ہیں اور خاص طور پر سیاحوں کو اپنی چرب زبانی سے بہت متاثر کرتے ہیں۔ ایک صاحب نے لطیفہ سنایا کہ ایک جگہ بس والا مسافروں کو متوجہ کرنے کے لئے آواز لگا رہا تھا۔”السعدیہ .... چار پونڈ مگر آپ کیلئے صرف دو پونڈ۔“

دوسرا بس والا اس سے بھی دو قدم آگے تھا۔ وہ مسافروں کو متوجہ کرنے کیلئے آواز لگا رہا تھا۔” یا اخی السعدیہ تیس میل مگر آپ کیلئے بیس میل۔“

لطیفہ یہ ہے کہ بہت سے مسافر اس آواز سے متاثر ہو کر بس میں سوار بھی ہو رہے تھے کہ چلو۔ دس میل کی بچت تو ہوگی۔

ہم بڑی سڑکوں سے گزر کر چھوٹی سڑکوں اور گلیوں میں بھی چلے گئے۔ قاہرہ کے قدیم شہر میں اتنی پتلی پتلی گلیاں بھی ہیں جن میں سے ایک موٹا تازہ آدمی بھی ترچھا ہو کر ہی گزر سکتا ہے۔ بٹ صاحب تو ان گلیوں میں جانے کیلئے تڑپ اٹھے مگر ہمارے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ شہر کا ہر علاقہ اور چپہ چپہ دیکھتے۔ ویسے خان صاحب بھی ان گلیوں میں جانے کیلئے خاصے بے تاب تھے۔

”مگر وہاں جاکر فائدہ کیا ہوگا؟؟“

بولے۔”بھائی سامنے سے آنے والوں کو آپ سے ٹکرا کر گزرنا پڑے گا۔

خاصا رومینٹک ماحول ہوگا۔"

ویسے ان کا خیال کچھ غلط بھی نہ تھا۔ ہم نے دیکھا کہ وہاں عورتیں شرم وحیا کے معاملے میں ہماری خواتین سے مختلف ہیں۔ اپنا اپنا طریقہ اور معیار ہے۔ وہ جن باتوں کو غیر ضروری سمجھتی ہیں ہمارے معاشرے میں انہیں بہت معیوب سمجھا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر آپ کسی عورت سے ٹکرا جائیں تو وہ آپ کو نہ تو گھورے گی' نہ ڈانٹے گی اور نہ کہے گی کہ کیا تمہارے گھر میں ماں بیٹیاں نہیں ہیں۔ بلکہ بڑے اطمینان سے گزر کر چلی جائے گی اور یہ فیشن ایبل اور ماڈرن عورتوں تک محدود نہیں۔ عام عورتیں بھی ان باتوں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتیں ۔ خدا جانے یہ ان کا مزاج ہے یا ان کے معاشرے میں ایسی باتوں کو قابل اعتراض نہیں سمجھا جاتا؟

قاہرہ کے فیشن ایبل اور جدید علاقوں کو چھوڑ کر پرانے علاقوں میں قدیم ماحول نظر آتا ہے۔

عورتوں اور مردوں کے ملبوسات' دکانوں کی سجاوٹ' مکانوں کی بناوٹ' سبھی کچھ دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے پرانے زمانے میں پہنچ گئے ہیں۔ پرانے شہر کے بعض مکانوں پر مکہ ' مدینہ کے نظارے دیکھ کر ہمیں بہت حیرت ہوئی ۔ معلوم ہوا کہ جو لوگ حج کر آتے وہ اپنے مکانوں کی دیواروں پر مقامات مقدسہ کے مناظر پینٹ کردیتے ہیں۔ یوں سمجھئے کہ عام لوگوں میں حاجی کی یہی پہچان ہے۔

فیشن ایبل علاقوں میں کافی ہاؤس موجود ہیں اور بہت ماڈرن اور شاندار ہیں مگر قاہرہ کے قہوہ خانے بھی بہت مشہور ہیں۔ یہاں کافی کے بدلے عربی قہوہ پیش کیا جاتا ہے۔ چاہیں تو کافی اور چائے بھی مل جائے گی مگر جب ہم نے پہلی بار چائے منگائی تو کانوں کو ہاتھ لگایا کہ آئندہ قاہرہ میں کبھی چائے نہیں پئیں گے۔ اس قدر بدمزہ' پھیکی اور ہلکے رنگ کی چائے کوشش کے باوجود نہیں بنائی جاسکتی۔ یہ تو مصریوں کا کمال ہے کہ ایسی چائے بنا لیتے ہیں۔

ایں سعادت بزور بازو نیست

ایک قہوہ خانہ کو دیکھا تو بٹ صاحب مچل گئے کہ قہوہ پئیں گے۔ ان کی ضد پوری کرنے کیلئے نوہ خانے میں پہنچ گئے۔ یہ متوسط طبقے کا علاقہ تھا اور قہوہ خانہ کا

ماحول بھی خالص مصری تھا۔ لکڑی کی میزیں اور کرسیاں جن پر لوگ عربی لباس پہنے بیٹھے باتوں میں مصروف تھے۔ عربی ایک شیریں زبان ہے اور جب عربوں کی زبان سے سنیں تو اس کی شیرینی دوبالا ہوجاتی ہے۔ شروع شروع میں تو یہ بھی ہوا کہ ان کی گفتگو کانوں میں پڑی تو ہم باادب ہوگئے۔ بعد میں خیال آیا کہ بھائی یہ تو ان لوگوں کی مادری زبان ہے۔ ہمارے لئے تو عربی قرآن شریف تک ہی محدود ہے۔

قاہرہ کے قہوہ خانوں میں لوگ صرف قہوہ نوش کرنے نہیں آتے بلکہ باہمی تبادلہ خیال کیلئے بھی انہیں بیٹھک کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

قاہرہ کے قہوہ خانوں میں مخصوص قسم کے لوگ آتے ہیں ۔ مثلاً" طالب علموں کا قہوہ خانہ الگ ہے۔ دانش وروں کا الگ ہے۔ فنکاروں اور صحافیوں کی بیٹھک کے لئے دوسرے قہوہ خانے مخصوص ہیں۔ گونگے بہروں کے قہوہ خانے بھی ہوتے ہیں جہاں صرف گونگے بہرے ہی جاتے ہیں۔ ہم جس قہوہ خانے میں داخل ہوئے بعد میں پتا چلا کہ یہ گونگوں اور بہروں کے لئے مخصوص ہے۔ ہم نے اس بات پر بالکل توجہ نہیں دی کہ قہوہ خانے میں بالکل خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ حالانکہ کافی حضرات وہاں موجود تھے ۔ کچھ دیر بعد ویٹر صاحب تشریف لے آئے۔ یہ بھی عبا پہنے ہوئے تھے اور سر پر ایک نوکدار ٹوپی تھی۔ ان کے ایک ہاتھ میں ٹرے تھی دوسرے ہاتھ میں انہوں نے ہمارے سامنے پہنچتے ہی اشارے کرنے شروع کردیے۔ ہم نے حیران ہوکر انہیں دیکھا۔ ہماری خاموشی پر انہوں نے حلق سے ایک آواز نکالی اور پھر ہاتھ سے اشارے شروع کردیئے۔

"اسے کیا ہوگیا ہے؟" خان صاحب نے ہم سے پوچھا۔ "یہ اس طرح حرکتیں کیوں کررہا ہے؟"

ہم نے کہا۔"بھائی صاحب' ہم بھی اس سے پہلی دفعہ ملے ہیں۔ اس کے بارے میں جتنا آپ جانتے ہیں ہم بھی اتنا ہی جانتے ہیں۔"

بٹ صاحب نے سب سے پہلے اس راز کو سمجھا۔ کہنے لگے۔ "یہ گونگا ہے۔ ہم سے آڈر مانگ رہا ہے۔"

" تمہیں کیسے معلوم ہوا؟" خان صاحب نے جھلا کر بولے "تم نجومی کب

سے بن گئے؟"

بٹ صاحب نے کہا۔"آپ ذرا اپنے ارد گرد دیکھ لیجئے۔ پھر آپ کو خود ہی پتا چل جائے گا۔"

آس پاس نظر دوڑائی تو بٹ صاحب کی دانائی کی داد دینی پڑی۔ ہر میز پر بیٹھے ہوئے حضرات اشاروں سے گفتگو کرنے میں مصروف تھے۔

"چلو بھائی۔ کسی اور قہوہ خانے میں چلتے ہیں۔"بٹ صاحب نے مشورہ دیا۔

"یار تمہیں تو صرف قہوہ ہی پینا ہے۔ ہم یہاں باتیں کرنے تو نہیں آئے ہیں۔"

بات یہ بھی معقول تھی اس لئے ہم نے ویٹر کو اشارے سے بتایا کہ تین عدد قہوہ لے کر آؤ۔ وہ اب تک ہماری خاموشی کو ہماری بے اعتنائی پر محمول کررہاتھا اور خاصا ناراض نظر آرہاتھا۔ ہمارا آرڈر لے کر خاموشی سے چلاگیا۔ اب ہم نے ذرا تفصیل سے قہوہ خانے کا جائزہ لیا۔ یہ کافی بڑا ہال تھا۔ ایک طرف چند میزوں پر باقاعدہ تاش کی بازی جمی ہوئی تھی۔ یہ ہمیں بعد میں معلوم ہوا کہ قہوہ خانوں میں کھیلوں کا بھی بندوبست ہوتا ہے اور بہت سے لوگ محض کھیلنے کے لئے قہوہ خانے میں جاتے ہیں۔

ویٹر تین پیالوں میں بھاپ اڑاتا ہوا قہوہ لے کر آیا اور ہماری میز پر رکھ کر رخصت ہوگیا۔ قہوہ خاصا گہرے رنگ کا تھا اور جب ایک گھونٹ لیا تو پتا چلا کہ بالکل پھیکا ہے۔ چنانچہ ویٹر کو اپنی طرف متوجہ کرانے کیلئے اشارے شروع کردیے مگر اس کی ہم پر نظر نہیں پڑی۔ وہ دوسری میزوں پر مصروف تھا۔

ہم نے کہا" یہ بیرہ تو بہرہ ہے اس لئے ہماری بات نہیں سنے گا۔ وہ سامنے کونے والی میز پر جو صاحب بیٹھے ہیں وہ شاید مینجر یامالک ہیں۔ ان سے جاکر چینی کی فرمائش کرنی چاہئے۔"

خان صاحب فوراً" اس خدمت کیلئے تیار ہوگئے۔مالک یا مینجر وہ جو بھی تھا' خاصا موٹا تازہ تھا۔ وہ کلین شیو تھا سر بھی بالکل چکناتھا۔گنجے کے سر پر بھی کچھ بال تو ہوتے ہیں مگر ان صاحب کی چندیا پر قسم کھانے کیلئے ایک بال بھی نہیں تھا۔بٹ صاحب کا خیال تھا کہ شاید یہ داڑھی مونچھوں کے ساتھ سر کا بھی شیو کرتا ہے۔

خان صاحب نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور پھر باتوں کے اشاروں سے ان صاحب کو یہ بتانے کی کوشش کی کہ ہمیں چینی کی ضرورت ہے۔ پہلے تو انہوں نے ان کے سامنے میز پر رکھا ہوا ایک خالی پیالہ اٹھایا اور پھر چاروں طرف نظر دوڑائی مگر کوئی چمچہ نظر نہیں آیا تو مجبوراً" انہوں نے ہاتھ کے اشاروں سے پیالے میں چینی ڈال کر چمچہ ہلانے کا اشارہ کیا۔وہ پہلے تو بہت غور سے دیکھتا رہا پھر اس کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہوئے۔ خان صاحب جو حرکتیں کررہے تھے ان سے مطلب تو واضح نہیں ہوتا تھا البتہ یوں لگ رہاتھا جیسے وہ کامیڈی کررہے ہیں۔

مصری نے پریشانی سے اپنی صفاچٹ سر پرہاتھ پھیرا اور پھر دونوں ہاتھوں کے اشارے سے انہیں روک دیا۔ خان صاحب نے اشارے بازی بند کردی۔

مصری نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں پوچھا"سم تھنگ یو وانٹ؟"

خان صاحب اسے بولتا ہوا سن کر حیران رہ گئے اور اس کی انگریزی نے تو انہیں بالکل بوکھلا دیا۔

"یس" ان کے منہ سے بمشکل آواز نکلی۔

"وہاٹ؟"

"چینی" ان کے منہ سے بے ساختہ نکلا پھر بولے "شوگر۔"

مصری نے ایک دراز کھول کر اس میں سے چینی دان نکالا اور خان صاحب کے حوالے کردیا۔

"تشکر یا اخی" خان صاحب نے حلق سے آواز نکالی اور چینی دان لے کر چلے آئے۔

"حد ہوگئی ۔ یہ تو بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔ خواہ مخواہ لوگوں کو بے وقوف بنارہاہے۔"

بٹ صاحب نے کہا"بے وقوف وہ نہیں بنا رہا آپ خود ہی بن رہے ہیں۔"

"اگر یہ گونگا بہرہ نہیں تو پھر گونگوں کے لئے قہوہ خانہ کیوں کھولا ہے؟ یہ تو سراسر دھوکے بازی ہے۔"

چینی ڈالنے کے باوجود قہوہ کی تلخی کم نہ ہوئی۔ ہم تینوں نے دوائی سمجھ کر یہ

قہوہ نوش کیا اور عہد کیا کہ آئندہ جب تک قاہرہ میں رہیں گے بھول کر بھی قہوہ طلب نہیں کریں گے۔

شام ہونے لگی تھی اور اس دوران میں ہم نہ جانے کہاں کہاں گھومتے رہے تھے اور تھک بھی گئے تھے۔ موسم بہت زیادہ گرم تو نہ تھا لیکن پیدل چلنے سے گرمی کا احساس ہو رہا تھا اور کچھ پسینہ بھی آرہا تھا۔ طے پایا کہ اب واپس چلنا چاہئے۔ ہم نے دیکھا تھا کہ قاہرہ میں ٹرام بھی چلتی ہے اور بسیں بھی دوڑتی پھرتی ہیں مگر جب تفصیلی معلومات حاصل نہ ہوں ٹرام یا بس میں کسی اجنبی شہر میں سفر نہیں کیا جاسکتا اس لئے ٹیکسی کے ذریعے واپسی کا فیصلہ کیا۔ ٹیکسیوں کی قاہرہ میں کمی نہیں ہے اور جس جگہ ہم کھڑے تھے وہاں تو ہر قسم کی سواری دستیاب تھی۔ یہاں تک کہ گدھا گاڑی بھی ایک گلی میں سے نکلتی ہوئی نظر آگئی۔

بٹ صاحب نے بے اختیار کہا "وہ دیکھو۔ وہ دیکھو گدھا گاڑی!"

خان صاحب بڑی سنجیدگی سے بولے "بٹ صاحب، آپ نے پہلے کبھی گدھا گاڑی نہیں دیکھی یا ہم نے نہیں دیکھی؟ یہ مصری ہمارے متعلق کیا رائے قائم کریں گے؟"

بولے "ہماری باتیں سمجھیں گے تو کوئی رائے قائم کریں گے نا۔ آپ اطمینان رکھئے۔ یہ لوگ اردو نہیں سمجھتے۔"

"آپ واپسی پر کہیں گدھا گاڑی میں سفر کرنے کا ارادہ تو نہیں رکھتے؟"

کہنے لگے "میں اتنا گدھا بھی نہیں ہوں، اگر گدھا گاڑی میں بیٹھ گئے تو کل صبح اپنے ہوٹل پہنچیں گے۔"

خان صاحب نے تسلی دیتے ہوئے کہا "آپ فکر نہ کریں۔ آپ کا گدھا گاڑی کی سواری کا شوق بھی پورا کرادیں گے انشاء اللہ۔"

ٹیکسی والا رک گیا تھا اور باری باری ہم تینوں کی صورت دیکھ رہا تھا۔

"بھائی اسے کچھ بتاؤ کہاں جانا ہے؟"

"کس طرح بتائیں۔ یہ تو اردو جانتا ہی نہیں اور ہم عربی سے ناواقف ہیں۔"

"کم از کم ہوٹل کا نام تو بتادو۔"

"اور اگر اس نے پتا پوچھ لیا تو کیا کریں گے؟"

ٹیکسی ڈرائیور ایک نوجوان آدمی تھا۔ خاصا اسمارٹ اور خوش مزاج بھی نظر آرہا تھا۔ ہماری گفتگو اطمینان سے سنتا رہا پھر انگریزی میں بولا "سر میں آپ کی کچھ مدد کرسکتا ہوں۔"

ہم نے حیران ہو کر اسے "تم انگریزی جانتے ہو؟"

"جی۔ میں فرنچ بھی جانتا ہوں۔"

خان صاحب بولے "اس قدر پڑھا لکھا، عالم فاضل آدمی ٹیکسی چلا رہا ہے۔ کتنے افسوس کا مقام ہے۔"

ہم نے اس سے پوچھا "تم اعلی تعلیم یافتہ ہو؟"

بولا "جی نہیں۔ میں نے تو کبھی اسکول کی شکل بھی نہیں دیکھی۔"

ہماری حیرت میں اضافہ ہوگیا "مگر یہ انگریزی اور فرنچ۔"

وہ ہنسنے لگا "جناب، قاہرہ میں بے شمار ٹورسٹ آتے ہیں۔ مجھے یہاں ٹیکسی چلاتے ہوئے دو سال ہوچکے ہیں۔ بس مسافروں کے ساتھ بات چیت کر کے بولنا آگیا ہے۔ لکھ پڑھ نہیں سکتا۔"

"یار، کتنا ذہین لڑکا ہے" خان صاحب نے مرعوب ہو کر کہا۔

"مگر اسے یہ تو بتادو کہاں جانا ہے ورنہ یہیں کھڑے کھڑے دس پاؤنڈ کا بل بن جائے گا۔"

ہم نے اسے اپنے ہوٹل کا نام بتایا اور پوچھا "اس کا پتا جانتے ہو؟"

"سر۔ دو سال سے قاہرہ میں ٹیکسی چلا رہا ہوں، سب کچھ جانتا ہوں۔"

خاں صاحب اس کی ذہانت سے کچھ اور مرعوب ہوگئے۔

واپسی پر چھٹ پٹا ہوگیا تھا۔ سورج غروب ہونے والا تھا۔ چند سڑکوں سے گزر کر ہم ایک کشادہ سڑک پر پہنچ گئے۔ سڑکوں کی روشنیاں بھی جل چکی تھیں اور بے حد بھلی لگ رہی تھیں۔ یکایک ٹیکسی نے ایک موڑ کاٹا اور ایک انتہائی حسین منظر

ہماری آنکھوں کے سامنے گزر گیا۔ سڑک قدرے بل کھاتی ہوئی ایک کشادہ پل کی بلندی کی طرف جارہی تھی اور درمیان میں دریائے نیل بہہ رہاتھا۔ اس جگہ دریا کا پاٹ خوب چوڑا تھا۔ اور پہلی بار ہم پر دریائے نیل کا حسن اجاگر ہوا تھا۔ سڑکوں اور آس پاس کی عمارتوں کی جگمگاتی ہوئی روشنیوں نے عجیب رومانی سماں پیدا کردیا تھا۔ پس منظر میں آسمان پر شفق پھوٹی ہوئی نظر آرہی تھی۔ قاہرہ کا حسن وجمال پوری آب وتاب کے ساتھ ہماری نگاہوں کے سامنے تھا۔

ٹیکسی ڈرائیور نے کہا"سر۔ قاہرہ میں دریائے نیل کو عبور کرنے کیلئے چھ پل ہیں اس پل کو "اکتوبر برج" کہتے ہیں اور یہ سب سے خوبصورت پل ہے۔"

ہم تینوں دم بخود بیٹھے اس افسانوی منظر کو دیکھ رہے تھے۔ اس سے پہلے ہم قاہرہ کے جدید اور قدیم علاقوں کو دیکھ چکے تھے اور رفتہ رفتہ ہم پر یہ حقیقت واضح ہونے لگی تھی کہ آخر قاہرہ کی ساری دنیا میں اتنی دھوم کیوں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے تاریخی یادگاروں ' قدیم محلات' عظیم الشان مساجد اور شاندار گرجا گھروں سے قطع نظر قاہرہ بذات خود ایک متنوع اور دل میں اتر جانے والا شہر ہے۔ اہرام کی تو بات ہی الگ ہے مگر یہ قاہرہ کا حصہ نہیں ہیں بلکہ اس کی حدود کے باہر واقع ہیں۔

"آپ ٹورسٹ ہیں سر؟" ٹیکسی والے کی آواز نے ہمیں چونکا دیا۔

"ہاں۔"

"کہاں سے آئے ہیں؟"

"پاکستان سے۔"

"اوہ ۔پاکستان ۔ علی بھٹو!" اس نے بلند آوازاور پرجوش آواز میں کہا۔

"علی بھٹو کو جانتے ہو؟" ہم نے پوچھا۔

اس نے اثبات میں سرہلایا"بہت بڑا آدمی ہے۔ مسلمان ہے۔"

اس زمانے میں ہم نے قاہرہ میں مختلف جگہوں پر بھٹو صاحب کا تذکرہ سنا۔ مصری انہیں "علی بھٹو" کے نام سے پکارتے تھے اور ان کا نام محبت اور احترام کے ساتھ لیا کرتے تھے۔ ایک چھوٹے سے دکاندار سے ہم نے صابن خریدا اور جب اس کے پوچھنے پر بتایا کہ ہم پاکستان سے آئے ہیں تو اس نے بھی پرجوش انداز میں نعرہ لگایا "پاکستان ' علی بھٹو" اور ہم سے قیمت لینے سے انکار کردیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب بھٹو صاحب اپنے پورے عروج پر تھے اور پاکستان سے باہر ان کی بہت قدرومنزلت تھی۔ خاص طور پر ..... اسلامی ملکوں میں وہ ایک ایسے مسلمان انقلابی کی حیثیت سے جانے جاتے تھے جو"ایٹم بم" بنا رہاتھا۔ اس وقت تک پاکستان کے ایٹم بم کا اتنا چرچا نہیں ہواتھا مگر اسلامی ملکوں میں یہ تصور عام تھا کہ پاکستان ایٹم بم بنارہاہے اور ایٹمی ٹیکنالوجی دوسرے مسلمان ملکوں کو بھی فراہم کرے گا۔ رات بھیگ چکی تھی اور قاہرہ روشنیوں کے سمندر میں ڈوبا ہواتھا۔ اس وقت ہمیں اندازہ ہوا کہ قاہرہ کو ایک ہزار ایک روشنیوں کا شہر کیوں کہاجاتاہے۔قاہرہ کی عظمت اور خوبصورتی ہم پر اجاگر ہونی شروع ہوگئی تھی حالانکہ اس وقت تک ہم نے نہ تو تاریخی یادگاریں دیکھی تھیں اور نہ ہی اہرام مصر کا نظارہ کیا تھا۔

یہ وہ شہر ہے جسے دنیا کے قدیم ترین شہروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ مصر کی تاریخ پانچ ہزار سال سے بھی زیادہ پرانی ہے اور اس ملک نے بہت سے ادوار اور کئی تہذیبوں اور حکمرانوں کا عروج وزوال دیکھا ہے۔ مصر سے وابستہ داستانیں آج بھی کتابوں کی زینت ہیں۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں قلوپطرہ نے اپنے حسن کا جادو جگایا تھا اور سارے عالم کو دیوانہ کردیا تھا۔ یونانی ' رومن' کرسچن اور مسلمان ترکوں نے اس علاقے پر طویل حکمرانی کی اور ہر ایک نے اپنی تہذیب اور معاشرت کا عکس چھوڑا۔ قدیم ترین تاریخ پر نظر کریں تو وہ فرعونوں کی بادشاہی کا دور تھا جو اپنے آپ کو"خدا" تصور کرتے تھے مگر فانی انسانوں کی طرح خاک میں مل گئے۔ یہ اور بات ہے کہ انہوں نے اپنی بے شمار لافانی یادگاریں زمین کے سینے پر نقش کردیں جو آج بھی ساری دنیا کو حیران اور مہر بہ لب کردیتی ہیں۔

لگ بھگ چھ سوسال پہلے ماہر علوم اور عظیم عرب مؤرخ ابن خلدون نے ان الفاظ میں قاہرہ کا تذکرہ کیا تھا۔

"ایک مسافر نے مجھے بتایا کہ انسان آنکھوں سے جو کچھ دیکھتا ہے تخیل اس سے کہیں زیادہ حسین ہوتا ہے لیکن قاہرہ کو دیکھ کر یہ بات غلط ثابت ہوجاتی ہے کیونکہ

وہ انسانی تخیل سے بھی زیادہ حسین اور پرشوکت ہے۔"

ابن خلدون کو یہ سن کر قاہرہ دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہوا اور اس نے اس شہر کو جیسا پایا وہ اس کی توقعات کے مطابق تھا۔ اس نے اپنی یاد داشتوں میں لکھا۔

"قاہرہ کائنات کا حسین ترین شہر اور دنیا کا باغ ہے۔ یہ انسانی ذہن کے ارتقا کا عملی ثبوت ہے۔ بادشاہوں کا تاج ہے۔ یہ شہر محلات اور شاندار عمارتوں سے بھرا ہوا ہے۔ عملی درسگاہیں اور مدرسے یہاں بکھرے پڑے ہیں۔ یہ چاند ستاروں سے بھی زیادہ روشن اور حسین ہے۔"

۱۳۸۲ اور ۱۵۱۷ء کے درمیانی عرصے میں "الف لیلیٰ" کی داستان قلم بند کی گئی تھی۔ اس میں بغداد کے حوالے سے بہت سی کہانیاں موجود ہیں لیکن ماہرین کا کہنا ہے کہ ان داستانوں میں قاہرہ کا ماحول پیش کیا گیا ہے۔ الف لیلیٰ کی داستان میں ایک کردار کی زبان سے یہ فقرہ کہلوایا گیا ہے۔ "جس شخص نے قاہرہ نہیں دیکھا اس نے دنیا نہیں دیکھی۔ وہاں کی زمین سونا ہے' دریائے نیل ایک عجوبہ ہے۔ وہاں کی سیاہ چشم حسینائیں جنت کی حوریں ہیں ۔ وہاں کے مکانات محلات سے زیادہ شاندار ہیں ۔ وہاں کی ہوا شفاف اور نرم ہے۔ جس میں خوشبو رچی ہوئی ہے۔ واقعی قاہرہ ایسا ہی شہر ہے کیونکہ وہ دنیا کی ماں ہے ۔"

ان الفاظ کو لکھے ہوئے صدیاں گزر چکی ہیں۔ زمانے کے انقلابات کے ساتھ ساتھ قاہرہ میں بھی تبدیلیاں آچکی ہیں۔ قاہرہ کے محلات اجڑ چکے ہیں۔ دریائے نیل کی شکل وصورت تبدیل ہوگئی ہے مگر قاہرہ آج بھی دنیائے عرب کا دل ہے۔ گزشتہ دہائیوں میں قاہرہ کافی تیزی سے بدلا ہے۔ قدیم محلات اور عمارتوں کی جگہ سربفلک عمارتیں آسمان کی طرف سر اٹھائے کھڑی نظر آتی ہیں۔ اس شہر کی اہمیت اور قدروقیمت اب پہلے سے کہیں زیادہ ہوگئی ہیں۔ ۱۹۶۰ء میں مصر کی ساٹھ فیصد آبادی دیہات میں رہا کرتی تھی اور آٹھ میں سے ایک مصری قاہرہ کا شہری تھا۔ اس وقت قاہرہ کی آبادی ۳۵ لاکھ تھی مگر اب حالات بہت بدل چکے ہیں' ہر تین میں سے ایک مصری قاہرہ کا باشندہ ہے اور اسکی آبادی ڈیڑھ کروڑ کے لگ بھگ ہوگئی ہے۔ آبادی کے اعتبار سے یہ افریقہ' مشرقی وسطی اور دنیائے عرب کا سب سے بڑا شہر ہے۔ قاہرہ کو عرب القاہرہ

کہتے ہیں۔ انگریزی میں اسے "کائرو" کہا جاتا ہے مگر خود قاہرہ کے رہنے والے اس شہر کو "مصر" کے نام سے پکارتے ہیں۔

ٹیکسی ڈرائیور ہم سے پوچھ رہا تھا" آپ کو مصر کیسا لگا؟"

ہم نے کہا"ہم لوگوں نے تو ابھی قاہرہ بھی پوری طرح نہیں دیکھا۔ مصر کے بارے میں کیا کہہ سکتے ہیں؟"

وہ ہنسنے لگا' بولا "ہم قاہرہ کے باسی اس شہر کو مصر کہتے ہیں۔"

"ہم نے جتنا بھی دیکھا ہے آپ کا مصر ہمیں بہت اچھا لگا ہے۔"

"تشکر حبیبی" وہ خوش ہوگیا۔ ہر قدیم شہر کے باشندے کی طرح اسے بھی اپنے شہر سے پیار تھا اور وہ اس پر فخر کرتا تھا۔

قاہرہ کا حسن اور روشنیوں کی بہار دیکھتے ہوئے ہم ہوٹل پہنچ گئے۔ ٹیکسی کا کرایہ تیس پاؤنڈ بنا تھا۔ خان صاحب بولے"اس سے بھاؤ تاؤ کرکے کچھ کم کرالوں ؟"

خان صاحب نے مایوسی سے منہ بنایا اور چپ ہو رہے۔ خاموشی سے تیس پاؤنڈ نکال کر اس کے حوالے کیے۔

"اللہ حافظ یا اخی" اس نے کہا اور قاہرہ کی ٹریفک میں گم ہوگیا۔

استقبالیہ سے چابیاں وصول کرکے ہم نے اپنے اپنے کمرے کی راہ لی۔ غسل کرکے تازہ دم ہوئے اور خان صاحب کے کمرے میں جمع ہو کر چائے پینے کا ارادہ کیا۔

کمرے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو ہم حیران ہوگئے۔ قاہرہ میں ہمیں ٹیلی فون کرنے والا کون ہوگا؟ بٹ صاحب نے کہا"استقبالیہ والی لڑکی نے فون کیا ہوگا۔"

خان صاحب نے جھپٹ کر فون اٹھایا۔ دوسری طرف سے سید راجندر ناتھ بول رہے تھے۔

"آپ لوگ واپس آگئے؟"

"بس کچھ دیر پہلے ہی پہنچے ہیں اور غسل کرکے فریش ہوگئے ہیں۔"

"کیا پروگرام ہے ۔ گھومنے چلنا ہے یا آرام کریں گے؟"

خان صاحب نے ہم دونوں سے مشورہ کیا " بھائی آرام کرنے کا کیا سوال

ہے۔ ہم قاہرہ دیکھنے آئے ہیں 'آرام کرنے نہیں۔"

"تو پھر دس منٹ میں لابی میں پہنچ جائیں۔"

خان صاحب اتنے بے تاب تھے کہ فوراً" ہی اٹھ کھڑے ہوئے ۔ لابی میں استقبالیہ پر جو خاتون تشریف فرما تھیں انہیں خان صاحب نے اظہار پسندیدگی سے نوازا تھا ۔ ان سے اگرچہ بات چیت زیادہ نہیں ہوئی تھی لیکن دور دور سے مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا اور خان صاحب اسی پر مطمئن تھے۔

بٹ صاحب نے انہیں چھیڑا بھی اور کہا" خان صاحب ! آپ کو اگر یہ خاتون پسند ہیں تو ان سے بات چیت کیوں نہیں کرتے؟"

انہوں نے بٹ صاحب کو بہت ڈانٹا" بھائی تم تو یورپ کی ہوا کھا کر بے شرم ہو گئے ہو۔ یہ مغرب نہیں مشرق ہے۔ یہاں کی عورتوں کی آنکھوں میں شرم و حیا ہوتی ہے ' یہ گوریوں کی طرح دل کھلی نہیں ہوتیں۔"

پھر بھی۔ بات کرنے میں تو کوئی حرج نہیں ہے ۔ وہ کوئی باپردہ عورت تو نہیں ۔ اسکرٹ اور بلاؤم پہن کر سج بن کر استقبالیہ پر بیٹھتی ہے۔"

لابی میں راجندر صاحب ٹھیک دس منٹ بعد تشریف لے آئے جس سے اندازہ ہوا کہ وقت کے بہت پابند ہیں۔ ہم نے انہیں سارے دن کے سرگشت کی تفصیل سنائی ۔ مسئلہ یہ تھا کہ اب رات کو کہاں جائیں؟

"سینما" بٹ صاحب نے فوراً" تجویز پیش کی "کوئی فلم دیکھتے ہیں۔"

"عربی فلم تمہاری کیا سمجھ میں آئے گی ؟"

"انگریزی فلم بھی دیکھ سکتے ہیں" بٹ صاحب نے اصرار کیا۔

"رہنے دو یار۔ تمہاری کیا سمجھ میں آئے گی ۔ہم تو ترجمہ کر کر کے تھک جائیں گے۔"

راجندر ناتھ نے فوراً" مشورہ دیا"یہاں انڈین فلمیں بھی چل رہی ہیں۔ چاہیں تو کوئی انڈین فلم دیکھ لیجیے۔"

بٹ صاحب کی رگ حب الوطنی پھڑک اٹھی "دیکھئے جناب۔ اگر آئندہ ایسی

بات کی تو ہمارے تعلقات ختم ہو جائیں گے۔

راجندر ناتھ نے حیران ہو کر بٹ صاحب کو دیکھا" کیا میں نے کوئی غلط بات کہہ دی؟"

بٹ صاحب کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا مگر وہ اپنے غصے کو ضبط کرنے کی کوشش کر رہے تھے ۔" راجندر صاحب 'ہم اتنی دور سے انڈین فلمیں دیکھنے کے لیے قاہرہ نہیں آئے ہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ میں انڈین فلم کسی قیمت پر بھی نہیں دیکھ سکتا۔"

"مگر کیوں؟ آپ کو اچھی نہیں لگتیں؟"

"اچھی لگنے کی بات نہیں ہے ۔ بات اصول کی ہے۔ آپ مجھے بتائیے کہ کیا آپ کو فلمیں دیکھنے کا شوق ہے؟"

"زیادہ تو نہیں مگر دیکھ لیتا ہوں۔"

"آپ نے اب تک کتنی پاکستانی فلمیں دیکھی ہیں؟"

بٹ صاحب نے پوچھا۔

وہ کچھ سوچنے لگے پھر بولے "کبھی اتفاق نہیں ہوا۔"

بٹ صاحب نے کہا"معاف کیجئے راجندر صاحب۔یہ اتفاق کی بات نہیں ہے ۔ سوچ کی بات ہے آپ ساری دنیا گھومتے پھرتے ہیں فلمیں بھی دیکھتے ہیں مگر آپ نے کبھی پاکستانی فلم نہیں دیکھی اور آپ چاہتے ہیں کہ پاکستانی انڈین فلمیں دیکھا کریں 'آخر کیوں؟"

راجندر ناتھ کچھ سٹپٹا گئے کہنے لگے " آپ تو اسے کسی اور طرف لے گئے۔ دیکھئے نا فلم تو آرٹ ہے اس میں سیاست کہاں آجاتی ہے۔ فلم انڈین ہو یا پاکستانی۔ فلم ہی ہوتی ہے۔"

بٹ صاحب اب پورے جلال میں آگئے تھے بولے" راجندر صاحب یہ باتیں سن سن کر ہمارے کان پک گئے ہیں۔ ہم پاکستانیوں کو آپ آرٹ کے نام پر غیر متعصب ہونے کو کہتے ہیں مگر خود کٹر متعصب ہیں۔ ہم ابھی انگلستان سے ہو کر آئے ہیں۔ وہاں پاکستانی انڈین فلمیں بہت شوق سے دیکھتے ہیں۔ اسے آپ آرٹ کی خدمت

کہتے ہیں مگر مجھے سارے انگلستان میں قسم کھانے کو ایک انڈین ایسا نہیں ملا جو پاکستانی فلم دیکھتا ہو۔ وہ لوگ تو کیسٹ پر پاکستانی گانے بھی نہیں سنتے۔ دوسروں کو تو آپ روشن خیال ہونے کی نصیحت کرتے ہیں مگر خود اتنے تنگ دل کیوں ہیں۔ آپ لوگ ہم پاکستانیوں کو باتوں سے بہلا کر بے وقوف کیوں بناتے ہیں؟" بٹ صاحب کی گفتگو باقاعدہ تقریر کی صورت اختیار کرگئی تھی اور وہ حسب معمول جذباتی ہوگئے تھے۔ ان کی آواز کانپنے لگی تھی اور آنکھیں سرخ ہورہی تھیں۔

راجندر ناتھ نے پریشان ہوکر بٹ صاحب کو دیکھا اور پھر دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہوگئے۔ بولے " بٹ جی۔ اگر آپ کو تکلیف پہنچی ہے تو مجھے معاف کردیں۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ آپ یقین کیجئے ہمارے گھرانے میں تعصب اور تنگ دلی کا نام ونشان نہیں ہے ہم نہ پاکستان سے نفرت کرتے ہیں اور نہ پاکستانیوں کو برا کہتے ہیں۔ آپ نے جو باتیں کی ہیں وہ بالکل سچی ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں انجانے میں ایک غلط راستے پر چل رہا تھا۔ اس اندازے سے پہلے میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا اور نہ ہی کسی نے اس طرح کی کھلے لفظوں میں مجھے اس غلطی کا احساس دلایا تھا۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے کم از کم دو درجن پاکستانی فلمیں ضرور دیکھوں گا اور اپنے انڈین دوستوں کو بھی یہی مشورہ دوں گا۔"

بٹ صاحب کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا بولے " راجندر ناتھ جی۔ آپ بہت اچھے آدمی ہیں۔ ہمیں باہر کے ملکوں میں اب تک جتنے بھی انڈین ملے ہیں آپ ان سب سے مختلف ہیں۔ میں نے تو صرف اپنے جذبات آپ کو بتائے تھے۔ آپ اگر انہیں صحیح سمجھتے ہیں تو مجھے بہت خوشی ہے۔ آیئے ہاتھ ملائیں تاکہ دل صاف ہوجائیں۔"

لیجئے صاحب۔ پل بھر میں ان دونوں کے درمیان صلح صفائی بھی ہوگئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ راجندر ناتھ جیسا انڈین ہم نے پہلی بار دیکھا تھا جس نے ہم پاکستانیوں سے کھلے دل سے ملاقات کی تھی اور سیاست کو بیچ میں لانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

خان صاحب نے کہا" راجندر صاحب۔ آپ ذرا مسلمانوں کی فراخ دلی دیکھئے

کہ انہوں نے آپ کو ایک منٹ میں سید بنا دیا ہے حالانکہ سید مسلمانوں کے لئے سب سے زیادہ احترام کے قابل ہوتے ہیں اور کوشش کے باوجود ہر مسلمان سید نہیں بن سکتا۔ ہمیں تو آپ پر رشک آرہاہے کہ جو کام ہم پاکستان میں رہ کر ساری زندگی نہیں کرپائے وہ آپ نے قاہرہ میں پہنچتے ہی کرلیا۔"

ماحول کی شگفتگی پیدا ہوئی تو شام کے پروگرام بنانے کی طرف توجہ دی گئی۔

دنیا بھر میں اس وقت مصر کے "بیلے ڈانس" کی شہرت تھی۔ اس کا ایسا فیشن چل پڑا تھا کہ یورپ میں بھی کلبوں میں "بیلے ڈانس" کا رواج ہوگیاتھا اور مغربی رقاصائیں بھی بیلے ڈانس کا مظاہرہ کیا کرتی تھیں۔

"کیا خیال ہے" سید راجندر ناتھ نے کہا"کسی کلب میں چل کر بیلے ڈانس نہ دیکھیں۔ یہ یہاں کی خاص سوغات ہے اور اصلی بیلے ڈانس تو مصر کی رقاصائیں ہی کرتی ہیں۔یورپ والے تو ان کی بھونڈی نقل اتارتے ہیں۔"

ہم ذرا ہچکچائے کیونکہ کسی زمانہ میں کراچی کے نائٹ کلبوں میں بھی بیلے ڈانس کا چرچا تھا مگر اس کے بارے میں شریفوں کی رائے کچھ اچھی نہیں تھی۔

راجندر ناتھ ہماری ہچکچاہٹ سمجھ گئے' بولے" آپ یہ نہ سمجھیں کہ وہاں کوئی بے ہودگی ہوتی ہے۔ یورپ کے کلبوں میں پیش کیئے جانے والے بیلے ڈانس اور مصری بیلے ڈانس میں بہت فرق ہے۔ یہ تو آرٹ ہے۔ لوگ اپنی فیملی کے ساتھ ناچ دیکھنے آتے ہیں۔"

خان صاحب خاموش نہ رہ سکے' بولے "آپ ہمیں اتنا شریف بھی نہ سمجھیں ۔ ہم نے پیرس کے نائٹ کلبوں کے ڈانس بھی دیکھے ہیں۔ بیلے ڈانس دیکھ لیں گے تو کون سی قیامت آجائے گی۔"

بٹ تو قاہرہ آئے ہی بیلے ڈانس کی خاطر تھے۔

شارع الاہرام قاہرہ کی بہت لمبی اور مشہور سڑک ہے۔ یہ وہ سڑک ہے جو اہرام کی طرف جاتی ہے لیکن شہر سے گزرتی ہے تو اپنے دامن میں بے شمار دلچسپیاں سمیٹے ہوئے ۔ کہیں یہ تجارتی مرکز کی صورت اختیار کرلیتی ہے ۔ کہیں سربفلک

عمارتیں اس پر نظر آتی ہیں' کہیں رہائشی فیشن ایبل علاقے ہیں۔ اسی سڑک پر قاہرہ کے مشہور نائٹ کلب بھی موجود ہیں۔ اس اعتبار سے آپ شارع الاہرام کے اس حصے کو نیویارک کے ففتھ ایونیو سے مشابہت دے سکتے ہیں۔

راجندر ناتھ ہمیں شارع الاہرام لے گئے ۔ رات کے وقت قاہرہ کا حسن دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ سڑکیں' دکانیں' عمارتیں سبھی' روشنی سے جگمگاتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ قطار درقطار نائٹ کلب موجود ہیں اور ان کی جلتی بجھتی اور جگمگاتی ہوئی رنگین روشنیاں ایک عجیب سماں پیدا کردیتی ہیں۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس علاقے میں جرائم پیشہ لوگوں کا وجود نہیں ہے۔ حالانکہ یورپ اور امریکا کے شہروں میں ایسے علاقے مجرموں کے اڈے بن جاتے ہیں۔

ہم ٹیکسی سے اتر کرفٹ پاتھ پر چلنے لگے۔ ہرطرف چہل پہل اور رونق تھی۔ مغربی سیاحوں کی بہتات تھی۔ جس کی وجہ سے ماحول کی رنگینی میں کچھ اور اضافہ ہوگیاتھا۔ خوش حال اور خوش لباس مصری بھی بہت بڑی تعداد میں موجود تھے۔ فٹ پاتھ پر بے فکروں کی ٹولیاں گھوم رہی تھیں۔ ماڈرن مصری خواتین بھی لباس اور میک اپ کے معاملے میں مغربی خواتین سے کم نہیں ہیں اور ایسے مقامات پر ان کی کافی تعداد نظر آجاتی ہے۔ ہم جس نائٹ کلب میں داخل ہوئے تو اس کانام غالباً "الحدید" تھا نمایاں حروف میں زبان کے علاوہ انگریزی میں نائٹ کلب کا نام لکھا ہوا تھا کا نام لکھا ہواتھا۔ سنگ سیاہ سے بنی ہوئی چند سیڑھیاں چڑھنے کے بعد اس کلب میں داخل ہونا پڑتا تھا۔ اس کے اندرقدم رکھا تو طبیعت خوش ہوگئی۔ نہایت صاف شفاف اور خوب صورت جگہ تھی۔ لابی میں سرخ رنگ کے چمکدار اور چکنے پتھروں کا فرش بہت بھلا لگتاتھا۔ یہ اتنا چکنا تھاکہ سنبھل سنبھل کرقدم رکھنے پڑتے تھے ورنہ پھسلنے کا خطرہ تھا۔ ہم تو بہت پھونک پھونک کر قدم رکھ رہے تھے۔ مگر خواتین کو دیکھاکہ اونچی ایڑی کی جوتیاں پہن کر تیزی سے کھٹ کھٹ کرتی جارہی ہیں۔ کیا مجال جو پھسل جائیں۔ ہم نے اس طرف خان صاحب کی توجہ دلائی تو بولے "پھسلنے کافرض صرف مرد ہی ادا کرتے ہیں۔عورتیں اس معاملے میں بہت محتاط ہوتی ہیں۔"

خان صاحب کا یہ ذو معنی فقرہ بہت اچھا لگا مگر بٹ صاحب کہاں چپ رہنے والے تھے' کہنے لگے" مگر جب عورت پھسلتی ہے تو پھر پھسلتی ہی چلی جاتی ہے۔ کسی جگہ بھی نہیں رکتی۔"

○☆○

کلب ایک وسیع وعریض ہال میں تھا۔ درمیان میں اسٹیج کیلئے کئی بلند چبوترہ نہیں تھا۔صرف ایک کشادہ جگہ خالی چھوڑ دی گئی تھی۔ چاروں طرف کرسیاں اور میزیں لگی ہوئی تھیں اور ان کے درمیان بھی خالی جگہیں تھیں۔ اس کا سبب بھی کچھ دیر بعد ہمیں معلوم ہوگیا۔ رقاصائیں ڈانس کرتے ہوئے اسٹیج سے گزر کر دیکھنے والوں تک بھی پہنچ جاتی تھیں اور یہ خالی جگہیں اسی مقصد کیلئے رکھی گئی تھیں۔

ہم چاروں نے ایک اچھی سی جگہ پر میز پر قبضہ جمالیا۔ابھی کلب میں زیادہ لوگ موجود نہیں تھے۔ اس لئے ہمیں اپنی پسند کی ٹیبل دستیاب ہوگئی۔ کچھ اور لوگ بھی موجود تھے جن میں مغربی سیاحوں کے علاوہ مصری بھی تھے ۔ ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ مصری اپنی بیگمات کے ہمراہ نائٹ کلبوں میں براجمان تھے۔ ہمارے ملک میں توکوئی اپنی بیگم کے ہمراہ نائٹ کلب کے سامنے سے گزرتے ہوئے بھی گریز کرے گا مگر قاہرہ میں ہم نے اس کے برعکس معاملہ دیکھا۔ لوگ پورے خاندان کے ساتھ نائٹ کلب میں پہنچ جاتے ہیں۔ ان میں بیویاں' نوجوان لڑکے لڑکیاں اور بچے بھی شامل ہوتے ہیں۔ ہمارے لئے یہ ایک انوکھی سی بات تھی۔

ہمارے برابر والی میز پر بھی ایک مصری خاندان موجودتھا ۔ ادھیڑ عمر کا مرد' ان کی خوبصورت بیوی جو دیکھنے میں جوان ہی نظر آتی تھیں۔ سترہ اٹھارہ سال کی عمر کا ایک لڑکا اور اس سے ایک آدھ سال بڑی نوجوان دوشیزہ ۔ کچھ دیر بعد ایک اور مصری خاندان بھی آخر ان کے برابر والی میز پر فردکش ہوگیا۔ یہ دونوں غالباً آپس میں

شناسا تھے۔ کچھ دیر بعد ان کے قہقہوں کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ عرب ہنسنے میں بخل سے کام نہیں لیتے۔ دل کھول کر اور قہقہہ مار کر ہنستے ہیں۔ خواتین بھی بلند آواز میں کھل کھلا کر ہنسنے کو معیوب نہیں سمجھتیں ۔ اپنا اپنا رواج ہے۔

مجموعی طور پر قاہرہ کے لوگوں کو ہم نے خوش مزاج اور خوش ذوق پایا۔ لطیفہ گوئی اور لطیفہ سازی عام ہے۔ ان میں خوبی یہ ہے کہ خود اپنا مذاق بھی اڑاتے ہیں اور اس پر دل کھول کر ہنستے ہیں ۔ نائٹ کلب کے باہر ہماری ایک نوجوان مصری ابن حسن سے ملاقات ہوگئی۔ تو وہ ہمیں اپنے ساتھ ایک کافی ہاؤس میں لے گئے۔ کافی ہاؤس اور قہوہ خانے کا فرق تو آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ بس یوں سمجھئے جیسے ہمارے ہاں تندروی ہوٹل اور اچھے ہوٹل مڑیں فرق ہوتا ہے۔ یہی فرق قہوہ خانے اور کافی ہاؤس میں بھی ہوتا ہے۔ یعنی دیسی اور بدیسی کا فرق ہے۔

ابن حسن ایک تعلیم یافتہ نوجوان تھے۔ انگریزی بہت اچھی بولتے تھے کیونکہ لندن میں تعلیم حاصل کی تھی۔ یہ ایک روشن خیال نوجوان تھے۔ بات بات پر قہقہہ مار کر ہنستے تھے۔ انہیں انگریزی اور عربی کے بے شمار لطیفے یاد تھے اور لطیفہ سنا کر خود ہی زور زور سے ہنستے تھے۔ انہیں دیکھ کر ہمیں ابراہیم جلیس یاد آگئے۔ ان کا بھی کم وبیش یہی انداز تھا کہ بات سے بات نکال کر لطیفہ پیدا کرتے تھے اور پھر زور زور سے قہقہہ مار کر ہنستے تھے۔

ابن حسن نے ہم سے پوچھا کہ آپ کو قاہرہ کیسا لگا؟

ہم نے کہا" بہت خوبصورت ۔"

"اور لوگ ؟"

"لوگ بھی بہت اچھے اور خوش اخلاق ہیں۔"

بولے" یہ نہ کہئے۔ میں نے بھی دنیا کے بہت سے ملک دیکھے ہیں مگر سچ تو یہ ہے کہ ہنسنے ہنسانے اور لطیفہ بازی میں جو کمال قاہرہ کے لوگوں کو حاصل ہے وہ کہیں اور دیکھنے کو نہیں ملا۔ یہاں کے لوگ ہر طرح کے لطیفے بنالیتے ہیں۔سیاسی ' معاشرتی ' تجارتی' یہاں تک کہ اپنے قومی معاملات پر بھی لطیفہ سازی سے باز نہیں آتے پھر مثال کے طور پر انہوں نے عرب واسرائیل کی جنگ کے بارے میں ایک لطیفہ سنایا۔ جب سرائیلیوں نے تیزی سے پیش قدمی کرکے عربوں کے علاقوں پر قبضہ کرلیاتو کسی غیر ملکی نے مصری خواتین سے پوچھا" اگر اسرائیلی یہاں بھی آگئے تو آپ کا کیا بنے گا؟"

بولیں "بننا کیا ہے۔ ہم یہودیوں سے شادی کرلیں گے۔"

جنگل کے زمانے میں بھی لطیفے گھڑے جاتے تھے۔خاص طور پر صدر جمال ناصر کے بارے میں ہر روز ایک نیا لطیفہ بنایا جاتا تھا۔ خفیہ ادارے ان کی باقاعدہ رپورٹ صاحب صدر کو پہنچاتے تھے وہ بھی دل کھول کر ان پر ہنستے اور اکثر اپنی تقریروں میں اس مذاق کو دہرا دیتے تھے۔

ابن حسن نے اسی زمانے کا ایک اور لطیفہ بھی سنایا۔

اسرائیلیوں نے نہر سوئز پر مورچے بنا لیے تو ایک دن مصری کمانڈر نے ہاٹ لائن پر صدر کو اطلاع دی کہ یہودیوں نے اپنی فوج کو دو بریگیڈ کی کمک بھیجی ہے۔

صدر نے تسلی دیتے ہوئے کہا"فکر نہ کرو۔ میں چار بریگیڈ بھیج رہاہوں۔"

کچھ دنوں بعد کمانڈر نے بوکھلا کر اطلاع دی "یار ئیس۔اسرائیل نے فضائیہ کے مزید دو اسکواڈر بھیج دیے ہیں۔"

رئیس نے جواب دیا" فکر کی بات نہیں ہے۔میں چار اسکواڈر بھیج دوں گا"

دوسرے دن کمانڈر نے پریشانی کے عالم میں پھر فون کیا اور صدر کو بتایا کہ " اسرائیل نے اس محاذ کی کمان پر موشے دایان کو بھیجا ہے۔"

صدر نے اطمینان سے جواب دیا"فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں فوری طور پر طٰہٰ حسین کو محاذ پر بھیج رہاہوں ۔(طٰہٰ حسین مصر کے عظیم دانشور اور اہل قلم تھے مگر نابینا تھے)

معاہدہ تاشقند کے بعد بھارتی وزیراعظم شاستری اچانک فوت ہوگئے تھے۔ مصریوں نے اس پر بھی ایک لطیفہ بنالیاتھا۔ وہ یہ تھا کہ صدر ایوب خان نے معاہدہ کرنے کے بعد شاستری جی کو اتنی گرم جوشی سے گلے لگایا کہ ان کا دل پچک گیا اور وہ فوت ہوگئے۔

ابن حسن نے ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بارے میں ایک اور لطیفہ بھی سنایا۔ وہ یہ

تھا کہ جب جنگ کا آغاز ہوا اور عربوں کو پسپائی ہونے لگی تو یہ بات اللہ میاں کے نوٹس میں لائی گئی کہ کفار مسلمانوں پر غالب آرہے ہیں۔ اللہ میاں نے حکم دیا کہ کچھ فرشتوں کو بھیجا جائے تاکہ وہ عربوں کی حوصلہ افزائی کریں۔

دوبارہ اطلاع آئی کہ فرشتوں کی حوصلہ افزائی کے باوجود عرب ہزیمت اٹھا رہے ہیں۔

اللہ میاں نے اس بار کچھ فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ بذات خود جاکر عربوں کی امداد کریں مگر عربوں نے باتوں میں لگا کر فرشتوں کو بھی اپنے جیسا بنالیا۔

اللہ میاں کے حضور میں صورت حال پیش کی گئی تو انہوں نے فرمایا" میں تو ہدایت ہی دے سکتا ہوں ورنہ تو سبھی میرے بندے ہیں۔ عرب تو شاید یہ چاہتے ہیں کہ میں خود تلوار لے کر ان کی طرف سے لڑنے پہنچ جاؤں۔ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو۔"

اب ذرا نائٹ کلبوں کا احوال سن لیجئے ' نائٹ کلب میں لوگوں کی آمد کا سلسلہ جاری تھا۔ خواتین وحضرات جوق در جوق آرہے تھے۔ ہر ایک کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور میز پر بیٹھنے کے بعد سب لوگ باتوں میں مصروف ہوجاتے تھے۔ ہم نے اور بھی ملکوں کے نائٹ کلب دیکھے ہیں مگر ایسا بے تکلف اور گھریلو قسم کا ماحول کہیں اور دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔

بٹ صاحب کچھ دیر آس پاس کا نظارہ دیکھتے رہے پھر بولے" یہ نائٹ کلب ہے یا شادی بیاہ کی کوئی تقریب ؟"

" نہ یہاں دولہا ہے ' نہ دلہن۔ آپ کو شادی کی تقریب کیوں یاد آگئی؟"

" اس لئے کہ شادی کی محفلوں میں ہی مہمان یوں اکٹھے ہوکر بیٹھتے ہیں اور ہنستے بولتے ہیں۔ ہم نے پیرس میں جو نائٹ کلب دیکھا تھا وہاں تو پروگرام شروع ہونے سے پہلے یوں لگ رہا تھا جیسے سب لوگ تعزیت کرنے آئے ہیں۔"

مشرق اور مغرب کا یہی فرق ہے۔ مغرب میں شادی کی تقریب پر بھی سوگواری کا ماحول طاری رہتا ہے اور مشرق میں سوگواری کے موقعے پر بھی گپ شپ کا ماحول ہوتا ہے۔

ہمارے اطراف میں بیٹھے ہوئے لوگ خالص عربی میں گفتگو کررہے تھے۔ اب تو ہمیں عادت سی پڑگئی تھی ورنہ شروع شروع میں کسی کو عربی بولتے سنتے تو ایک عجیب تقدس کا احساس ہوتا تھا اور ہم مئودب ہوجاتے تھے یعنی رفتہ رفتہ ہمیں یقین آگیا کہ یہ حضرات وخواتین دراصل گپ شپ کررہے ہیں۔ قرآن شریف کی تلاوت نہیں کررہے۔

خان صاحب بار بار گھڑی دیکھ رہے تھے۔ سید راجندر سے کہنے لگے" آپ تو کہتے تھے کہ ڈانس آٹھ بجے شروع ہوگا۔ اب تو ساڑھے آٹھ بج چکے ہیں اور ڈانسر کا دور دور تک پتا نہیں ہے۔"

وہ بولے" بھائی صاحب' وہ ڈانسر ہے۔ وقت کی زیادہ پابند نہیں ہے۔ ویسے بھی زیادہ دیر سے ڈانس شروع ہوتو زیادہ دیکھنے والے اکٹھے ہوجاتے ہیں۔"

وقت کی پابندی کا ہم نے یہ مظاہرہ دیکھا کہ ڈانسر تو نوبجے کے قریب تشریف لائیں مگر ان کا رقص دیکھنے کے شوقین اس کے بعد بھی بہت دیر تک آتے رہے۔

رقاصہ نے سامنے سے رقص گاہ میں آنے کے بجائے اسی راستے سے قدم رنجہ فرمایا۔ جدھر سے تماشائی آرہے تھے۔ ہوا یہ کہ ان کی آمد سے پہلے ہال میں کھلبلی سی مچ گئی۔ سب نے باتیں بند کردیں اور مڑمڑ کر پیچھے کی جانب دیکھنا شروع کردیا۔ ہم حیران کہ اچانک کیا واقعہ پیش آگیا۔ کہیں کوئی حادثہ نہ ہوگیا ہو مگر پھر میوزک کے چھناکے سنائی دینے لگے اور اس کے بعد رقاصہ دلنواز ہال میں داخل ہوئیں۔ رقاصہ نے پشواز نما لباس زیب تن کر رکھا تھا جس کی آستینیں نہیں تھیں۔ اور پیٹ کا کافی حصہ بھی عریاں تھا۔ اس کے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ دراز قد' کھلتا ہوا گندمی رنگ' سیاہ بڑی بڑی آنکھیں اور متناسب جسم۔ رقاصہ کے ہاتھ میں دف تھے جسے وہ چلتے ہوئے اپنی ران پر مارتی جارہی تھی اور موسیقی کے یہ چھناکے اس ڈفلی یا دف کی وجہ سے پیدا ہورہے تھے۔ رقاصہ کے اندر آتے ہی ہر طرف زندگی کے آثار پیدا ہوگئے اور تماشائیوں کی جانب سے تحسین وآفرین کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ رقاصہ نے مسکرا کر سب کی طرف دیکھا اور بڑے دلکش انداز میں کورنش بجالائی۔ اس کے بعد وہ اس کھلی جگہ پر پہنچ گئی جو رقص کے لئے مخصوص کی گئی تھی۔ حاضرین نے پرجوش

انداز میں تالیاں بجا کر کر رقاصہ کا خیرمقدم کیا۔ اس نے ہلکے ہلکے ڈفلی کو اپنی ٹانگوں پر مارنے کا سلسلہ کچھ تیز کردیا اور اس کے بعد اس کی ٹانگوں میں حرکت پیدا ہوگئی۔ ہال کے ایک جانب بیٹھے ہوئے سازندوں نے آرکسٹرا بجانا شروع کردیا۔ اور ایک دلکش موسیقی نے سارے ہال کو اپنے سحر میں جکڑ لیا۔ رقاصہ حرکت میں آگئی اور اس نے رفتہ رفتہ رقص کو تیز تر کردیا۔

یہ رقص بیلے ڈانس اس لیے کہلاتا ہے کہ اس میں رقاصہ اپنی کمر اور کولہوں کو لہراتی اور بل دیتی رہتی ہے۔ برصغیر کے کلاسیکی رقص میں عام طور پر تمام جسم حرکت میں رہتا ہے۔ زیادہ استعمال ٹانگوں اور ہاتھوں کا ہوتا ہے۔ گردن کے ساتھ ساتھ آنکھیں بھی حرکت کرتی رہتی ہیں نرت کے ذریعے چہرے کے تاثرات کا بھی اظہار کیا جاتا ہے۔ اور کمر اور کولہوں کو مسلسل حرکت دی جاتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ رقص بے حد دلفریب تھا۔ عربی موسیقی کی صداؤں پر رقاصہ نے اپنے جسم کا جادو جگا رکھا تھا اور سب دیکھنے والے مسحور ہو کر دیکھ رہے تھے۔ ہمارے معاشرتی معیار کے تحت اگرچہ اسے فحاشی کا نام تو نہیں دیا جاسکتا تھا لیکن جسم کی نمائش کے اعتبار سے اسے سیکسی قرار دیا جاسکتا ہے۔ کم ازکم ہماری خواتین ایسی محفل میں شرکت کرنا پسند نہ کرتیں مگر یہاں پر یہ منظر تھا کہ حاضرین محفل پر ایک والہانہ کیفیت طاری تھی۔ مرد' عورتیں' بچے سبھی اس رقص کے جادو میں کھوئے ہوئے تھے اور رہ رہ کر تحسین و آفرین کی صدائیں بلند کر رہے تھے۔ کافی دیر تک یہ سحر طاری رہا اور پھر اچانک موسیقی کی آواز بند ہوگئی اور اسکے ساتھ ہی رقص بھی تھم گیا تالیوں کے شور سے پورا ہال گونج اٹھا۔ رقاصہ نے جھک جھک کر سب کا شکریہ ادا کیا اور پھر کچھ دیر توقف کے بعد دوسرا رقص شروع کردیا۔ اس طرح رقص کا یہ سلسلہ کافی دیر تک جاری رہا۔ ہمیں تو سارے رقص ایک جیسے ہی معلوم ہوئے۔ خدا جانے یہ ہماری کم علمی تھی یا بدذوقی۔ موسیقی میں بھی یکسانیت محسوس ہوئی لیکن موسیقی کا ردھم قیامت خیز تھا اور اس رقاصہ کے لچکیلے جسم کے ہچکولے اور ہلکورے ایسے مدوجزر پیدا کر رہے تھے کہ ایک لمحے کے لئے بھی نگاہیں ہٹانے کا یارا نہ تھا۔ جب رقاصہ نے نغمہ چھیڑا تو حاضرین نے بھی ہم آواز ہو کر گانا شروع کردیا۔ رقاصہ نے رقص گاہ کی مخصوص جگہ کو چھوڑ کر قدم باہر نکلے اور حاضرین کے درمیان میں گھومنا اور لہرانا شروع کردیا۔ تماشائیوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ وہ لطف وانبساط کی ایک نئی دنیا میں پہنچ گئے تھے۔ رقاصہ ان سب کے درمیان میں بجلی کی مانند چمک رہی تھی' کڑک رہی تھی اور لہرا رہی تھی اور وہ بے محابہ داد دے رہے تھے۔ سارے ہال کا چکر کاٹ کر وہ دوبارہ اپنی مخصوص جگہ پر پہنچ گئی اور پھر ایک دم موسیقی کے رکتے ہی رقص بھی بند ہوگیا۔

یہ بیلے ڈانس اگر ہماری کسی فلم میں دکھایا جاتا تو لباس اور جسم کی حرکتوں کے باعث یقیناً قابل سنسر ٹھہرتا لیکن قاہرہ کے اس نائٹ کلب میں اس رات مصری اپنے خاندانوں سمیت اس سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ یہ ان کے کلچر کا ایک حصہ اور روایت ہے۔ اس رقص کی ایک نمایاں بات ہمیں یہ محسوس ہوئی کہ اگر رقص کی حرکات وسکنات میں ہیجان انگیزی تھی تو موسیقی میں ایک پاکیزہ نغمگی کا تاثر تھا۔ شاید ان دونوں کے امتزاج نے ہی اس رقص کو مجموعی طور پر سب کیلئے قابل قبول بنادیا تھا۔

رقص کا سلسلہ دو ڈھائی گھنٹے تک جاری رہا جس کے بعد رقاصہ اسی طرح دف اپنی ٹانگوں پر مارتی اور مسکراتی ہوئی رخصت ہوگئی۔

ہم نائٹ کلب سے باہر نکلے تو شارع الاہرام پر ٹریفک اور روشنیوں کا اژدہام تھا۔ زندگی سے بھرپور قاہرہ حدنگاہ تک ہمارے سامنے پھیلا ہوا تھا ابن حسن نے ہمیں بتایا تھا کہ یہ مصریوں کا مخصوص رقص ہے اور اس ملک میں مغنیوں اور رقاصاؤں کی بہت قدرومنزلت ہے۔ بڑے بڑے لوگ رقص دیکھنے کیلئے رقص گاہوں میں جاتے ہیں۔ مصر کے والی شاہ فاروق تو اکثر اچانک' کسی پیشگی اطلاع کے بغیر رقص سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔ مصر میں بڑے لوگوں کے گھروں میں مجرے کرانے کی روایت نہیں ہے اور نہ ہی رقاصاؤں کو پیشہ ور ناچنے والیاں سمجھ کر نفرت وحقارت سے دیکھا جاتا ہے۔ آرٹ کی قدر دانی کے لحاظ سے یہ مغربی معاشرے کے ہم پلہ ہے۔

4

قاہرہ میں نائٹ کلبوں کی کمی نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ جس شہر میں ہر سال لاکھوں سیاح آتے ہوں گے وہاں سیاحوں کی دلچسپی اور وابستگی کے تمام اسباب بھی فراہم کرنے پڑتے ہیں۔ مصر میں آنے والے سیاحوں میں زیادہ تر مغرب سے آنے والے ہوتے ہیں اس لئے ان کو خوش کرنے کیلئے حکومت اور محکمہ سیاحت کی جانب سے کوشش کی جاتی ہے کہ تمام لوازمات ان کے سامنے پیش کیئے جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ قاہرہ کے فیشن ایبل اور جدید علاقوں پر کسی مغربی ملک کا گمان گزرتا ہے۔ شاندار اور فلک بوس ہوٹل ' ریستوران ' آسٹورز ' شو روم ' تفریح گاہیں' نائٹ کلب اور ہوٹلوں میں مغربی رقص و سرور کا مناسب اہتمام ' شراب وشباب کی فراوانی یہ سب کچھ وہاں موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مسائل کے باوجود یہاں سیاحوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ نائٹ کلب یہاں ہر قسم کے ہیں۔ ایسے بھی ہیں جیسے پیرس اور لندن میں پائے جاتے ہیں اور خالص عربی انداز کے نائٹ کلب بھی بہت بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ مغربی ٹائپ کے نائٹ کلبوں میں عام طور پر وہ بیہودگی اور فحاشی دیکھنے میں نہیں آتی جو مغرب کا خاصہ ہے۔ عربی نغمات کی دھنوں پر رقاصائیں بیلے ڈانس کا مظاہرہ کرتی ہیں اور یہ اہل مصر کی خوبی تصور کی جاتی ہے۔

"اس میں کیا کمال ہے!" بٹ صاحب نے بیلے ڈانس دیکھنے کے بعد تبصرہ فرمایا۔" بس پیٹ کو اور کولہوں کوہلائے جاؤ اور بل دیتے رہو۔"

ہم نے کہا۔" ذرا آپ بھی دو منٹ کیلئے ہمیں یہ آسان کام کرکے دکھا دیں تو مان جائیں۔"

بولے "بھئی انہیں تو بچپن ہی سے عادت ہوتی ہے۔"

"ویسے یہ بات تو ہے۔" خان صاحب نے گرہ لگائی۔"اس رقص کا زیادہ زور پیٹ پر ہوتاہے۔"

" اس میں کیا شک ہے۔ دنیا میں بیشتر کام انسان پیٹ کی خاطر ہی کرتا ہے۔"

بیلے ڈانس کو آپ چاہے جو بھی کہہ لیجئے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ انتہائی دلکش اور ہیجان خیز رقص ہوتا ہے۔ رقاصائیں نظرفریب اور متناسب الاعضا ہوتی ہیں اور جوش ملیح آبادی کے کہنے کے مطابق اعضا کی شاعری پیش کرتی ہیں۔ اعضا کے تناسب کا جہاں تک تعلق ہے اس سلسلے میں مصریوں کا اپنا معیار ہے جو مغربی معیار سے قدرے مختلف ہوتا ہے۔ اہل مغرب تو پتلی کمر' لمبی ٹانگوں اور ہلکے پھلکے جسم کو متناسب قرار دیتے ہیں لیکن مصریوں کا اس سلسلے میں معیار ہی مختلف ہے۔ مصری رقاصائیں گداز جسم ہوتی ہیں۔ آپ انہیں موٹاپے کی طرف مائل بھی قرار دے سکتے ہیں۔ لیکن ان کا اپنا حسن اور دلکشی ہے۔ سانولے' کھلتے ہوئے گندمی رنگوں کی ملاحت بھی کچھ اور ہوتی ہے۔ اس پر سیاہ آنکھیں اور سیاہ بالوں کا اپنا علیحدہ حسن ہوتا ہے۔ ہم مشرق والے تو صرف گورا رنگ ہی حسن کا معیار قراردیتے ہیں مگر یورپ والوں کیلئے یہ گندمی چہرے اور سانولے جسم ہی حسن ودلکشی کانمونہ ہیں۔

قاہرہ دوسری عالمگیر جنگ کے زمانے ہی میں اہل مغرب میں شہرت حاصل کرچکا تھا جب برطانوی فوجی تعطیلات منانے کیلئے یہاں آتے تھے اور میدان جنگ کی صعوبتوں کی تھکن اتارنے کیلئے عیش وعشرت میں ڈوب جاتے تھے۔ ملک میں غربت عام تھی۔ اس لیئے یہ آسان ذریعہ آمدنی بہت جلد مقبول عام ہوگیا پھر یہ کہ آمدنی بھی معقول تھی اس طرح یہ بدعت یہاں جڑ پکڑ گئی۔ جنگ تو ختم ہوگئی مگر اپنے جراثیم چھوڑ گئی۔ پہلے فوجی چھٹیاں منانے کے لئے آیا کرتے تھے' بعد میں سیاحوں کے ریلے شروع ہوگئے۔ حکومت نے بھی سیاحت کو صنعت کا درجہ دے دیا اور یوں قاہرہ اور آس پاس کے شہر سیاحوں کی آماجگاہ بن گئے۔ جہاں تک تاریخی عمارتوں اور یادگاروں کا تعلق ہے اس معاملے میں یہ علاقہ مالا مال ہے۔ سب سے بڑھ کر تو اہرام مصر ہیں جنہیں دنیا کے عجائبات میں شمار کیاجاتاہے۔ اس کے بعد دوسرے آثار اور یادگاریں بھی

کچھ کم نہیں ہیں۔ مصر کی تہذیب انتہائی قدیم ہے۔ فرعونوں سے لے کر رومیوں' بازنطینیوں اور ترکوں تک یہاں طویل عرصے حکومت کی ہے اور ہر ایک نے اپنے نقوش چھوڑے ہیں۔ روم کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہاں قدم قدم پر قدیم تہذیب کے آثار اور یادگاریں موجود ہیں۔ کوئی اینٹ بھی اٹھاؤ تو اس کے نیچے سے کوئی تاریخی یادگار نکل آئے گی مگر ہمارے خیال میں مصر کو روم پر فوقیت حاصل ہے۔ یہاں تو ریت کا ذرہ ذرہ قدیم نشانیوں کا امین ہے۔ اب تک ریگستانوں اور صحراؤں کا سینہ چیر کر بے شمار عمارتیں اور یادگاریں دریافت کی جاچکی ہیں۔ اہرام بھی کسی زمانے میں ریت کے اندر ہی دفن تھے۔ بعد میں جب کھدائی کا سلسلہ شروع ہوا اور ماہرین آثار قدیمہ نے اس علاقے کا رخ کیا تو زمین نے اپنے اندر کے پوشیدہ خزانے اگل دیئے۔ فراعنہ اپنی قبریں ریگستانوں میں زمین کے اندر ہی تعمیر کرتے تھے اور اپنے تمام زر و جواہر یادگاروں کے ساتھ ان مقبروں میں دفن کردیئے جاتے تھے۔ زمین کے اوپر ریت کے تودے ان کو ڈھانپ دیا کرتے تھے لیکن چور ڈاکو تو ہرزمانے میں موجود رہے ہیں۔ یہ لوگ زمین کھود کر مقبروں میں دفن دولت نکال لیا کرتے تھے۔ بے شمار مدفن قزاقوں اور چوروں کی دست برد کا شکار ہوگئے۔ اس کے باوجود جدید تہذیب نے جب ان لعل وگہر کی طرف توجہ دی تو پھر بھی بیش قیمت نوادارات مقبروں میں پائے گئے جنہیں حفاظت سے رکھ لیاگیا۔ کچھ تو ان ہی مقبروں کی زینت ہیں اور بہت سے نوادارات اور فرعونوں کی لاشیں عجائب گھروں میں محفوظ کرلی گئی ہیں - ہزار ہا سال قبل مصر کے ہنر مندوں اور سائنس دانوں نے ایسے کیمیکل دریافت کر لیے تھے جن کی مدد سے انسانی جسم صحیح حالت میں رہ سکتے تھے - یہ بھی اس سرزمین کاایک عجوبہ ہی سمجھ لیجئے - ان لاشوں کو "ممی" کہا جاتا ہے اور انہیں دیکھ کر نہ صرف عقل حیران رہ جاتی ہے بلکہ عبرت بھی حاصل ہوتی ہے - یہ ان لوگوں کے اجسام ہیں جو مطلق العنان فرماں روا تھے اور خود کو "خدا" کہا کرتے تھے۔ مگر فانی انسانوں کی طرح موت کا شکار ہوگئے اور آج دنیا کے لئے تماشہ بنے ہوئے ہیں۔ اس زمانے کے فرعونوں نے اس بات کا کبھی تصور بھی نہیں کیا ہوگا کہ ایک وقت آئے گا جب وہ نگاہ عالم کیلئے دلچسپی اور حیرت کا سامان بن جائیں گے۔ ان کی دائمی زندگی کی خواہش تو کس حد تک پوری ہوگئی مگر کسی صورت میں؟ رہے نام اللہ کا۔

اس رات ہم کافی دیر تک قاہرہ کی سڑکوں پر گھومتے رہے۔ روشنیوں کی جگمگاہٹ' انسانوں کی چہل پہل' مختلف چہروں کی رنگا رنگی اور سب سے بڑھ کر ان علاقوں میں حسن مغرب کی فراوانی نے بٹ صاحب اور خان صاحب کو شکایت کا موقع فراہم نہیں کیا۔ فٹ پاتھ کے ریستوران قاہرہ کے فیشن ایبل علاقوں میں بھی پائے جاتے ہیں اور رونق بھی خوب ہوتی ہے لیکن ریستوران کا مصری انداز نمایاں ہے۔ خاتون ویٹریس کی جگہ مرد ویٹر نظر آتے ہیں جو ٹوٹی پھوٹی انگریزی بھی جانتے ہیں اور بخشش لینے کے لالچ میں اس کا استعمال بھی بڑی فراخ دلی سے کرتے ہیں۔ لیکن عام طورپر ان کی انگریزی کا وہی عالم ہے کہ اپنا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے پھر بھی آپ کی بات سمجھ لیتے ہیں اور اپنا ماضی الضمیر بھی سمجھا دیتے ہیں۔ ان میں بہتر انگریزی جاننے والے بھی ہوتے ہیں مگر بہت کم۔ جن شہروں میں غیر ملکی سیاحوں کی ریل پیل ہوتی ہے اور جن کی آمدنی کا انحصار بہت حد تک ان غیرملکیوں پر ہوتا ہے جب وہاں ہم نے انگریزی سے نابلد لوگوں کی اکثریت دیکھی تو بہت حیرت ہوئی۔ غیر ملکیوں کوخوش کرنے کیلئے بھی یہ لوگ ان کی زبان جاننے کی ضرورت واہمیت کو محسوس نہیں کرتے۔ جبکہ ہمارے ہاں معاملہ اس کے برعکس ہے ۔ یہاں کوئی شخص خواہ دنیا بھر کے علوم کا ماہر ہو لیکن انگریزی نہ جانتا ہو تو اسے جاہل سمجھا جاتاہے۔ انگریزی خواں تو کیا عام آدمی بھی اسے ان پڑھ ہی سمجھتا ہے ۔ لیکن پیرس ' روم ' جنیوا اور قاہرہ میں ہم نے اس کے برعکس پایا۔ کئی بار تو ان کی انگریزی سے لاعلمی بیزار بھی کردیتی ہے کہ خدایا کہاں پھنس گئے لیکن اسکے باوجود سیاح جوق درجوق ان ملکوں میں جاتے ہیں اور زبان کی مشکل کے باوجود بدمزہ نہیں ہوتے۔

خان صاحب نے اس مسئلے پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا۔ " میں بتاؤں کہ آخر اس کا سبب کیا ہے؟"

"بتائیے؟"

" بات یہ ہے کہ لوگ تو صدیوں تک انگریز کے غلام رہے۔ نہ صرف جسمانی طورپر بلکہ ذہنی طورپر بھی ان کی غلامی ہم پر مسلط ہوگئی اور آزاد ہوجانے کے

بعد بھی ہمیں اس غلامی سے چھٹکارا نہیں ملا ہے۔ یہ لوگ کبھی غلام نہیں رہے۔ وقتی طور پر غیر ملکیوں کا تسلط ضرور ہوتا رہا لیکن مصر پر انگریزوں یا فرانس والوں نے طویل عرصے تک حکمرانی نہیں کی۔ اس لئے اپنی غربت وافلاس اور مجبوریوں کے باوجود یہ ذہنی طور پر غلام نہ بن سکے۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ خان صاحب بعض اوقات بہت دور کی کوڑی لاتے ہیں۔ غور فرمائیں تو ان کا یہ تجزیہ بالکل درست معلوم ہوتا ہے' بعد میں ہمیں کچھ اور ملکوں میں جانے کا بھی اتفاق ہوا۔ تہران گئے' کابل گئے' بنکاک گئے' کہیں بھی ہمیں انگریزی کا بول بالا نظر نہ آیا مگر جب سری لنکا گئے تو پتا چلا کہ وہاں تو ساٹھ ستر فیصد آبادی انگریزی جانتی ہے۔ انہوں نے اپنی زبانوں کو بھی سیکھا ہے لیکن انگریزی کو بھی ذریعہ اظہار بناتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں افغانی' ایرانی اور تھائی لینڈ کے لوگوں میں کسی قسم کا احساس کمتری نہیں ہے۔ وہ انگریزی سے عدم واقفیت پر شرمندہ نہیں ہوتے اور غیر ملکیوں سے مرعوب ہونے کیلئے بھی تیار نہیں ہیں۔ بڑی بے تکلفی اور بے خوفی سے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتے ہیں۔

سید راجندر ناتھ نے بھی اس تجزیے سے اتفاق ظاہر کیا کیونکہ ان کے ملک میں بھی انگریزی کے بغیر کسی کو پڑھا لکھا اور معقول آدمی نہیں سمجھا جاتا۔ ہم لوگوں نے انہیں باقاعدہ سید صاحب کہنا شروع کردیا تھا۔ بٹ صاحب کو پہلے یہ بات پسند نہیں آئی مگر بعد میں وہ بھی انہیں سید صاحب ہی کہنے لگے۔ راجندر ناتھ اس پر بہت شرمندگی کا اظہار کرتے تھے۔

"کیوں مجھے شرمندہ کررہے ہیں۔ جناب میں سید تو نہیں ہوں مگر جانتا ہوں سید کیا ہوتا ہے۔"

ہم نے کہا۔"دیکھئے صاحب ہم تو جیسا دیس ویسا بھیس کے مقولے پر عمل کرتے ہیں۔ مصری آپ کو سید کہتے ہیں تو پھر ہم آپ کی شان میں گستاخی کیسے کرسکتے ہیں۔"

"تو پھر ایسا کریں کہ ہمیں پنڈت کہا کریں۔ حساب برابر ہوجائے گا۔"

یوں تو عربی ہوٹل کو فندق کہتے ہیں مگر قاہرہ کے لوگ ہوٹل یا ہوتیل بھی

خوب سمجھتے ہیں۔ بٹ صاحب شروع میں تو فندق کو خندق ہی کہتے رہے۔

"بھئی بہت دیر ہوگئی۔ اب خندق چلنا چاہئے۔"

"کس لئے۔ کیا ہوائی حملے کا خطرہ پیدا ہوگیا ہے؟" خان صاحب نے فوراً فقرہ چست کردیا۔

"کیسی بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں۔ بھائی' یہاں ہوائی حملے کا کیا ذکر ہے؟"

"یار خندق تو جنگ کے زمانے میں استعمال ہوتی ہے۔"

"میں تو ہوٹل چلنے کیلئے کہہ رہا ہوں آپ کو تو ذرا سی بھی عربی نہیں آتی۔"

"بھائی وہ خندق نہیں فندق ہے۔ زیر کے ساتھ اور یہ خیال رہے کہ عربی ایسی زبان ہے جس میں زیر زبر سے بھی بہت فرق پڑ جاتا ہے۔ لفظوں کے معنی ہی بدل جاتے ہیں۔"

"اسی لئے بزرگ کہا کرتے تھے کہ ترجمے کے ساتھ قرآن شریف پڑھ لو۔ اگر ان کی بات مان لی ہوتی تو آج یہ حال نہ ہوتا۔"

جہاں تک عربی زبان کی حرمت وتکریم کا تعلق ہے خان صاحب نے اور بٹ صاحب نے اس میں ذرا بھی کمی نہیں آنے دی۔ کسی کو عربی بولتے سنتے تو مؤدب کھڑے ہوجاتے۔ یہ نفسیاتی مسئلہ کئی دن تک درپیش رہا۔ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو باور کرایا کہ یہ لوگ عربی زبان بول رہے ہیں ۔ قرآن شریف کی تلاوت نہیں کررہے۔ بات یہ ہے کہ ہم لوگوں کے لئے تو عربی زبان قرآن شریف تک ہی محدود ہے۔ ظاہر ہے کہ قابل احترام ہے۔

تلاوت کا تذکرہ آیا ہے تو اس کا بھی احوال سن لیجئے۔ اگلے دن ہمیں ایک مصری صحافی مل گئے۔ ہمارے ہوٹل کی لابی میں تشریف فرما تھے۔ گلے میں کیمرہ لٹکا ہوا تھا۔ ایک انگریز جوڑے سے انگریزی میں باتیں کررہے تھے۔ خان صاحب نے دور ہی سے تاڑ لیا۔ دراصل ان کی نگاہ تو انگریزی جوڑے پر پڑی تھی مگر پھر انہوں نے انگریزی بولنے والے عرب کو بھی دیکھ لیا۔

"وہ دیکھو" وہ بے اختیار بولے"وہ سامنے!"

ہم سب نے سامنے دیکھا تو ہر طرف چہل پہل نظر آ رہی تھی۔ خوبصورت سجی بنی غیر ملکی خواتین، خوشبوؤں میں لپٹی ہوئی گھوم رہی تھیں۔

ہم سب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سامنے دیکھتے رہے مگر کوئی خاص چیز نظر نہیں آئی۔

بولے "ذرا کان لگا کر سنو۔"

لیجئے پہلے دیکھنے کی فرمائش تھی اب سننے کی تاکید فرمانے لگے۔ کان لگا کر سنا مگر بہت سے لوگوں کی بول چال کی بھن بھناہٹ کے سوا کچھ سنائی نہیں دیا۔

"وہ اس موٹے اور گنجے انگریز کے ساتھ جو خوبصورت میم بیٹھی ہے اسے دیکھ رہے ہیں؟"

"ظاہر ہے اللہ نے ہمیں بھی آنکھیں دی ہیں۔"

"وہ دونوں ایک مصری سے انگریزی میں باتیں کر رہے ہیں۔ یہ مصری ہمارے کام آسکتا ہے۔"

"مگر کس طرح؟"

"ہم ان کی باتیں ختم ہونے کا انتظار کریں گے اور پھر مصری سے اپنا تعارف کرا کے دوستی کرلیں گے۔"

اب ہم لوگوں نے اپنی تمام توجہ ان پر مرکوز کردی مگر وہ لوگ بھی یا تو بہت زیادہ باتونی تھے یا پھر کسی اہم گفتگو میں مصروف تھے۔ ہم نے جتنی دیر میں کافی کے دو دو کپ نوش کیئے وہ بیئر کے تین چار ڈبے پی گئے۔ مصری ابھی ان کے ساتھ بیئر نوشی میں مصروف تھا بلکہ جب غور کیا تو پتا چلا کہ وہ ان سے زیادہ پی رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ مفت کی تو قاضی کو بھی حلال ہے۔ شاید اسی لئے فراخ دلی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

ہم لوگ دور بیٹھے اندازے لگاتے رہے۔

"بس اب یہ لوگ اٹھنے ہی والے ہیں۔"

"بھئی یہ تو چپک کر ہی رہ گئے۔ ان کی باتیں ہی ختم ہونے کا نام نہیں لے رہیں۔" ان کے ہر انداز پر ہماری نظریں جمی ہوئی تھیں۔ خدا خدا کرکے وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ موٹے انگریز نے اشارے سے بل منگوایا اور ادائیگی کردی۔ ہم لوگ گھات لگائے بیٹھے تھے کہ جوں ہی وہ منتشر ہوں، مصری کو قابو میں کرلیا جائے۔ خان صاحب تو اتنے بے چین تھے کہ بار بار کرسی سے کھڑے ہوجاتے تھے۔ انگریز جوڑے کو رخصت کرتے ہوئے مصری نے ان سے مصافحہ کیا اور دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ وجہ یہ تھی کہ ابھی اس کا بیئر کا ڈبہ خالی نہیں ہوا تھا چنانچہ یہ ہمارے لئے نہایت مناسب موقع تھا۔ ہم نے فوراً" اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور مصری کی میز کے نزدیک پہنچ گئے۔

"السلام علیکم۔" ہم نے انہیں اچانک مخاطب کیا تو وہ چونک پڑے۔

"وعلیکم السلام۔" انہوں نے قرآت کے انداز میں فرمایا اور ہمارا جائزہ لینا شروع کردیا۔ شاید یہ جاننا چاہتے تھے کہ بلاوجہ، بلا کسی تعارف یا تمہید کے السلام علیکم کہنے والے یہ کون لوگ ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟

ہم نے فوراً" کہا۔ "ہم مہمان ہیں۔ پاکستان سے آئے ہیں۔"

وہ صاحب بیئر کا ڈبہ میز پر رکھ کر بے اختیار کھڑے ہوگئے۔ "اہلاً" وسہلاً" مرحبا" کہہ کر انہوں نے ہمیں فوراً گلے لگالیا۔ پہلے ہماری باری آئی پھر خان صاحب اور اس کے بعد بٹ صاحب کو شرف بغل گیری حاصل ہوا۔ یہ صاحب خاصے لحیم شحیم اور بلند قامت تھے۔ گہرا سانولا رنگ، داڑھی مونچھ صفا چٹ، سر پر گھنے اور گھونگریالے بال، ظاہر ہے کہ خالص مصری تھے۔ مصر ایک افریقی ملک ہے اس لئے یہاں کے لوگوں میں افریقی نسل سے تعلق رکھنے والوں کی شباہت پائی جاتی ہے۔ وجاہت، خوبصورتی اور کشش خال خال ہی دیکھنے میں آتی ہے۔ البتہ خوبصورت چہرے اور دمکتے ہوئے رنگ دیکھیں تو سمجھ جائیں کہ یہ شامی، لبنانی، فلسطینی وغیرہ ہیں۔ یا پھر مصریوں سے آمیزش کا نتیجہ ہیں۔ مصری عورتیں بھی خاصی لمبی تڑنگی اور مضبوط ہوتی ہیں۔ نزاکت اور لطافت ان میں کم ہی ہوتی ہے لیکن قاہرہ میں خوبصورت عورتیں بھی نظر آتی ہیں بلکہ ایسی حسینائیں بھی دیکھ لیجئے جن کو دیکھ کر خدا کی قدرت یاد آجاتی ہے۔ قاہرہ ایک بین الاقوامی مستقر اور دنیائے عرب کا مرکز ہے۔ دنیا بھر سے سیاح تو یہاں آتے ہی ہیں لیکن مشرقِ وسطیٰ کے رئیس زادے اور عیش وطرب کے دلدادہ بھی منڈلاتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب طلب ہوگی تو رسد کا بھی بندوبست ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ آس پاس کے عرب ملکوں کا حسن کشاں کشاں قاہرہ میں کھنچا چلا آتا ہے اور

اس کے جمال میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔

ہم نے پہلی فرصت میں جلدی جلدی ان سے اپنا تعارف کرایا۔

انگریزی میں پوچھنے لگے۔"کیا آپ سائح ہیں؟"

خان صاحب سمجھے وہ پوچھ رہے ہیں کہ کیا آپ "سایہ" ہیں ۔ ہم سبھی پریشان ہوگئے کہ یہ مخص بلاوجہ ہمیں بھوت پریت یا آسیب سمجھ رہا ہے۔

ہم نے فوراً" تصحیح کرتے ہوئے کہا۔"ہم ٹورسٹ ہیں۔"

بولے۔"ایک ہی بات ہے ۔ ٹورسٹ کو عربی میں سائح کہتے ہیں۔" یہ سن کر جان میں جان آئی کہ وہ سیاح کو سائح کہہ رہے تھے۔ دراصل عربوں کی عربی اور جو زبان ہم عربی کے نام سے جانتے ہیں ' ان دونوں میں کافی فرق ہے ۔ زبان اور حروف تہجی کا تو شاید اتنا فرق نہ ہوگا لیکن تلفظ اور لب ولہجہ یکسر مختلف ہے۔ یعنی یوں سمجھئے کہ عربی کے جو الفاظ ہم دن رات استعمال کرتے رہتے ہیں۔ مصریوں کی زبانی وہ بھی اجنبی سے لگتے ہیں۔ اس مسئلے کا مناسب حل یہی تھا کہ ہم عربی سے حتی الامکان پرہیز کریں اور کسی انگریزی داں کو پکڑیں۔ اسے بے ادبی بھی نہیں کہنا چاہئے۔ عربی کا احترام وتکریم اپنی جگہ لیکن جو بات آپ کی سمجھ میں نہیں آئے وہ عربی ہو یا لاطینی ایک ہی بات ہے۔

انہوں نے خالص عربی لہجے میں اپنا تعارف کرایا۔ معلوم ہوا کہ ان کا نام ابوالقاسم ہے۔ خاصا آسان اور مانوس نام تھا۔ فوراً" ہی ہماری زبان پر چڑھ گیا۔ ابوالقاسم کی جگہ ہم نے انہیں مسٹر قاسم کہنا شروع کردیا اور انہوں نے جواب میں ہم سب کے ناموں کے ساتھ السید لگادیا۔ مثلاً" السید آفاقی' السید بٹ' السید خان۔

خان صاحب بولے۔" بھئی یہ تو بہت مزے کی بات ہے کہ بیٹھے بٹھائے مفت میں سید بن گئے۔ اپنے ملک میں تو سید بننے کیلئے بہت پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں" پھر ہم نے قاسم کو سمجھانے کی کوشش کی کہ سید ہمارے لئے ملک میں کون لوگ ہوتے ہیں اور کس قدر واجب الاحترام ہوتے ہیں۔

بٹ صاحب نے کہا" اور آپ لوگوں کا کیا حال ہے کہ ہندو' سکھ ' عیسائی کو بھی سید بنا دیتے ہیں۔ کس قدر افسوس کی بات ہے۔ بلکہ ماتم کرنے کا مقام ہے۔"

پہلے تو قاسم کی سمجھ میں ہی یہ نکتہ نہ آیا مگر جب وضاحت سے سمجھایا گیا تو وہ بولا"السید بٹ آپ بالکل ناراض نہ ہوں۔ ہم تو مسٹر کی جگہ یہ لفظ استعمال کرتے ہیں اس لئے گستاخی کے مرتکب نہیں ہیں۔"

قاسم سے باتیں شروع ہوئیں تو ہم نے پھر کافی طلب کی ۔ قاسم صاحب سے پوچھا کہ پیوگے تو بولے"بیئر!"

ہم نے ذرا حیران ہوکر کہا۔"بیئر؟"

بولے ۔"دراصل دن کے وقت میں وہسکی سے پرہیز کرتا ہوں اس لئے بیئر پر گزارہ ہے۔ ویسے اگر زیادہ پی جاؤں تو بیئر سے بھی نشہ ہوجاتا ہے۔"

خان صاحب نے انہیں گھور کر دیکھا۔ بٹ صاحب بولے۔" اس سے یہ تصدیق کرلو کہ یہ مسلمان بھی ہے یا کرسچن وغیرہ ہے۔ یہاں تو سنا ہے کہ عیسائی بھی اسلامی نام رکھ لیتے ہیں۔"

ہم نے کہا۔"یہاں پر ہی کیا منحصر ہے۔ ہمارے ملک میں بھی کرسچن اسلامی نام ہی رکھتے ہیں۔ صرف اپنے نام کے آگے مسیح بڑھا لیتے ہیں اور کیوں نہ ہو۔ اس کا حق بھی رکھتے ہیں کہ آخر اہل کتاب ہیں۔"

قاسم صاحب سے ہمت کرکے پوچھا۔"کیا آپ مسلمان ہیں؟"

سینہ ٹھونک کر بولے۔"الحمد اللہ۔"

لیجئے اب اس کے بعد ہم ان سے کیا کہتے۔ صبر کے سوا چارہ نہ تھا۔

بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ کچھ مسلمان کھانے میں بھی زیادہ احتیاط نہیں کرتے۔ بے تکلفی سے جمبون کھالیتے ہیں۔ جمبون تو آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے۔ ہم نے تو یہی دیکھا کہ اسلام جتنا برصغیر کے مسلمانوں میں ہے اتنا دوسرے اسلامی ملکوں میں نہیں ہے۔

مثلاً" ہوٹل کے کمرے میں مختلف اشیا کے ریٹ درج ہوتے ہیں۔ اس پر سرفہرست وہسکی اور بیئر ہے۔ اس کے بعد کھانے کی اشیا ہیں۔ ہر قسم کے سینڈوچ دستیاب ہے۔ کھانے والا کون ہے۔ مسلمان یا غیر مسلم ۔ ہوٹل والوں کی بلا سے۔ ہمیں یاد نہیں کہ ترقی یافتہ زمانے میں بھی کبھی ہمارے ملک کے فیشن ایبل ہوٹلوں میں

جمبون فراہم کیا گیا ہو۔ وہسکی اور بیئر البتہ دستیاب ہوجاتی تھی اور اس زمانے میں ہوٹلوں اور ریستورانوں میں "بار" بھی ہوا کرتے تھے مگر اب وہ دن بھی ہوا ہوئے۔ آج کی نسل کیلئے تو یہ باتیں خواب وخیال ہو کر رہ گئی ہیں۔ پرمٹ پر شراب دستیاب ہوجاتی ہے یا پھر بلیک مارکیٹ میں اس کی فراوانی ہے ۔ پینے والوں کو بہرحال پیاسا نہیں رہنا پڑتا۔

بٹ صاحب کو اس بات پر خاصی تشویش تھی کہ یہ شخص مسلمان ہوکر بھی کھلے عام شراب پیتا ہے۔

ہم نے کہا۔ " بھائی ہمارے پاکستان میں بھی شراب پینے والے موجود ہیں۔ آپ بلاوجہ اس غریب سے ناراض نہ ہوں۔"

کہنے لگے ۔" سور کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

ہم نے کہا۔ "فی الحال تو اس معاملے میں بے خطا ہے۔ فرض کیجئے کہ سور کے گوشت سے پرہیز کرتا ہے۔"

ان چند تکنیکی خرابیوں سے قطع نظر قاسم بہت دلچسپ اور کام کا آدمی تھا۔ اس کے جوہر ہم پر بعد میں کھلے۔ شکر ہے کہ یہ بھی معلوم ہوگیا کہ سور پر وہ بھی ہماری طرح لعنت بھیجتا ہے۔ لہٰذا مراسم استوار ہوگئے۔ جب ذرا بات چیت ہوئی تو ہم نے موقع پاکر بہت سی معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی کہ خدا جانے پھر یہ شخص یا اس جیسا کوئی دوسرا ہاتھ آئے یا نہ آئے۔

قاہرہ میں پہنچ کر جس بات نے ہمارے دل کو خوش کردیا تھا وہ اذان کی آواز تھی اور اذان بھی اس قدر شیریں کہ مؤذن کی خوش الحانی پر رشک آنے لگا تھا۔

خان صاحب نے کہا" مسٹر قاسم ۔ قاہرہ کے مؤذن بہت اچھے ہوتے ہیں اور تعریف کی بات یہ ہے کہ سبھی بالکل ایک ہی انداز میں اذان دیتے ہیں۔ آخر اس کا کیا راز ہے؟"

وہ بولا "راز یہ ہے کہ یہ سب اذانیں ایک ہی مؤذن کی آواز میں ہیں اور تمام مسجدوں سے ایک ہی وقت میں نشر ہوتی ہیں۔"

"نشر ہوتی ہیں؟"

" جی ہاں ۔ انہیں ریکارڈ کرلیا گیا ہے اور مقررہ وقت پر یہ ریکارڈ بجا دیا جاتا ہے۔"

یہ آئیڈیا خان صاحب کو بہت پسند آیا۔ کہنے لگے۔"یہ ترکیب تو ہمارے ملک میں بھی استعمال کرنی چاہئے اور کم ازکم یہ ضرور ہو کہ تمام مساجد سے ایک ہی وقت میں اذان کی صدا بلند ہو۔"

ہم نے کہا۔"اتنے بھولے اور نادان نہ بنیں۔ آپ کو پتا ہے کہ ہمارے ملک میں ہر مولوی نے ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنا رکھی ہے اور ان تمام حضرات کو اپنی اپنی آوازیں سننے کا بہت شوق ہے ۔ اس لئے یہ سسٹم کم سے کم ہمارے ملک میں نہیں چل سکتا۔"

اذان کے بعد تلاوت کا بھی تذکرہ چھڑ گیا۔ ہم نے کہا کہ "آپ کے قاری بہت خوش الحان ہوتے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ آپ اس سلسلے میں ہماری رہنمائی کریں۔"

بولے۔" بخوشی مگر آپ کو کس قسم کا ریکارڈ درکار ہیں؟"

ہم نے کہا۔"قرآن کی تلاوت کے ۔"

بولے ۔"یہ بتائیں تلاوت پسند کریں گے یا کہ گانا؟"

ہم نے حیران ہوکر قاسم کو دیکھا خان صاحب اور بٹ صاحب نے بھی تیوریاں چڑھائیں۔ بھئی عجیب فضول شخص ہے۔ ہم قرآن کریم کی تلاوت کی بات کررہے ہیں اور یہ ہے کہ اسے موسیقی کی سوجھ رہی ہے۔ یہاں کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔

ہم نے کہا۔"مسٹر قاسم ، ہم قرآن شریف کی تلاوت کی بات کررہے ہیں۔ گانے کا یہاں کیا ذکر ہے؟"

وہ ہنسنے لگے بولے۔"دراصل تلاوت تو تلاوت ہوتی ہے لیکن قرآت کو ہم گانا کہتے ہیں۔"

تب یہ فرق ہماری سمجھ میں آیا۔ جیسے ہمارے ہاں شاعری میں ایک تحت اللفظ ہوتا ہے اور ایک ترنم۔ اسی طرح مصریوں نے قرآن شریف کی سادہ تلاوت کو

تلاوت کا نام دیا ہے اور قرآت کو گانا کہتے ہیں۔ دیکھا جائے تو کسی حد تک درست بھی ہے۔ قرآن کو ترنم اور خوش الحانی سے پڑھا جائے تو ہر موسیقی اس کے آگے ہیچ ہے لیکن ہمارے ہاں قرآن کے ساتھ گانے کا لفظ سوئے ادب سمجھا جائے گا۔ اپنا اپنا دستور ہے۔

السید قاسم ہمارے لیے بہت کار آمد ثابت ہوئے۔ ہمیں رہ رہ کر یہ خیال آتا رہا کہ اگر وہ نیک روح ہمیں قاہرہ میں نہ ملتی تو ہماری سیاحت کا لطف ادھورا رہ جاتا۔

قاسم میں بہت سی خوبیاں تھیں۔ سب سے بڑی بات تو یہ کہ وہ بے دھڑک اور بے تکلف آدمی تھے۔ کسی بات کا برا نہیں مانتے تھے بلکہ اگر ہم برا مان جاتے تو بے چارے ہمیں منالیا کرتے تھے۔ دوسری اہم بات یہ تھی کہ انگریزی سے واقف تھے اور بلاتکان انگریزی بولتے تھے۔ یہ بات الگ ہے کہ ان کی انگریزی دنیا بھر میں مروجہ انگریزی سے قدرے مختلف تھی لیکن مفہوم سمجھ میں آجاتا تھا۔ بات یہ تھی کہ انہوں نے انگریزی پڑھی نہیں تھی۔ محض بول بول کر یا سن سن کر انگریزی داں بن گئے تھے۔

"مگر تم نے یہ انگریزی سیکھی کس سے ؟"

بولے۔ "انگریزوں سے۔ دیکھیے السید۔ یہاں انگریز بہت آتے ہیں اور ہر طرح کی انگریزی بولنے والوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ انگلستان کا انگریز مختلف زبان بولتا ہے۔ امریکی کی زبان اور لب ولہجہ الگ ہوتا ہے۔ یورپ کے لوگ کسی اور انداز میں انگریزی بولتے ہیں۔ عربوں کو بھی آپ نے انگریزی بولتے سنا ہوگا۔ بس یوں سمجھیے کہ قاہرہ میں انگریزی کی کاک ٹیل تیار ہوتی ہے۔ بس میں نے بھی اس طرح انگریزی سیکھ لی۔ اگر لکھنے کو کہیں گے تو ایک فقرہ بھی نہیں لکھ سکوں گا۔"

مطلب یہ کہ وہ نہ انگریزی پڑھے تھے نہ لکھے تھے لیکن تھے انگریزی داں اور اچھی خاصی انگریزی بولتے تھے۔ قاسم کی عمر چالیس کے لگ بھگ ہوگی۔ انگریزی سیکھنی اس نے دس بارہ سال کی عمر سے شروع کی تھی۔

"یا اخی آپ کام کیا کرتے ہیں؟" ہم نے پوچھا۔ یہ سوال ہم نے دو تین دن کی ملاقاتوں کے بعد ان سے کیا تھا کیونکہ ہم نے دیکھا کہ وہ شخص ہر دم ہمارے ساتھ

رہتا تھا۔ آخر گزر بسر کیلئے بھی تو کچھ کرتا ہوگا۔

کہا۔ "میں نے بہت سے کام کیے ہیں۔ بازاروں میں پھیریاں لگائی ہیں۔ سیاحوں کے ساتھ ان کا سامان اٹھا کر پھرتا رہا ہوں پھر گائیڈ بن گیا۔ آج کل نوادرات کا بزنس کرتا ہوں اور پارٹ ٹائم گائیڈ بھی ہوں۔ اچھی گزر بسر ہوجاتی ہے۔"

واقعی ہوجاتی ہوگی۔ بات یہ ہے کہ قاہرہ میں سیاحوں کی کمی نہیں ہوتی اور وہ لوگ گائیڈ کو معقول رقم ادا کرتے ہیں اور اگر کہیں گائیڈ قاسم جیسا چرب زبان ہو تو پھر ریٹ اور بڑھ جاتا ہے۔ گائیڈ کیلئے بھی خداداد صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ کامیاب گائیڈ وہ ہوتا ہے جو بے دریغ جھوٹے سچے واقعات اور داستانیں بیان کرنے سے نہیں ہچکچاتا۔ بے چارہ سیاح اس کی قابلیت اور یادداشت سے متاثر ہوجاتا ہے اور اس کی بہت قدر کرتا ہے جہاں تک نوادرات کا تعلق ہے قاہرہ میں اصلی نوادرات کی بھی کمی نہیں ہے۔ یہ ہزاروں سال پرانی تہذیب کا مرکز ہے۔ پرانی عمارتیں اور پرانا سازو سامان قدم قدم پر بکھرا پڑا ہے پھر اہرام مصر اور دوسرے عجائب خانوں سے چوری کیا ہوا سامان بھی بازاروں میں دستیاب ہوجاتا ہے۔ دونمبر مال کی بھی کمی نہیں ہے جسے چالاک دکاندار بڑی مہارت اور مشاقی سے اصلی بتاکر مہنگے داموں فروخت کردیتے ہیں۔

قاسم کا بہت سے دکانداروں سے تعلق تھا۔ وہ ان کیلئے کمیشن پر کام کرتا تھا۔ گاہکوں کو گھیر گھار کر ان کے پاس لے جاتا اور وہ سیاحوں کی الٹی چھری سے کھال اتارتے۔ اس طرح قاسم کو بھی معقول حصہ مل جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بے فکری سے رئیسوں کی طرح رہتا تھا۔ وقت کی کوئی پابندی نہیں تھی۔ جب جی چاہا کام کیا۔ جی نہ چاہا تو آرام یا مٹرگشت میں مصروف ہوگئے۔

اس روز کافی دیر تک قاسم کے ساتھ صحبت رہی اور ہم سب نے ایک دوسرے کے بارے میں بہت کچھ جان لیا۔ اس طرح دوستی پکی ہوگئی تو قاسم نے فوراً پیشکش کردی کہ اب قاہرہ کی سیر کرانا اس کا ذمہ ہے۔

بٹ صاحب نے سرگوشی کی۔ "بھائی یہ تو بہت خطرناک شخص ہے۔ ہماری بھی کھال اتار لے گا۔"

ہم نے فوراً" معاملہ صاف کرلیا اور کہا" دیکھواخی ہمارے پاس فارن ایکسچینج کی کمی ہے۔ ہم تمہاری فیس ادا کرنے کے قابل نہیں ہیں۔"

وہ ہنسنے لگا۔ "حبیبی آپ سے فیس کون کافر مانگ رہا ہے۔ ہم اور آپ دوست بن گئے ہیں۔ اب آپ ہمارے مہمان ہیں اور عربوں کی میزبانی تو دنیا بھر میں مشہور ہے۔ کیا آپ نے داستان الف لیلیٰ نہیں پڑھی؟ حاتم طائی سے کوئی واقفیت ہے کہ نہیں 'وہ تو ساری دنیا میں شیطان کی طرح مشہور ہے۔"

لیجئے یہ مسئلہ بھی حل ہوگیا۔ شروع شروع میں خان صاحب اور بٹ صاحب نے کافی احتیاط سے کام لیا مگر رفتہ رفتہ انہیں بھی قاسم کے خلوص اور جذبہ دوستی کا یقین ہوگیا اور پھر ہم نے صحیح معنوں میں قاہرہ کی سیرو سیاحت کا لطف اٹھایا۔

قاسم نے اسی وقت ہمیں سیر کرانے کی پیشکش کردی۔ یعنی فوری مدارات اور میزبانی کا آغاز کردیا۔ سوال یہ پیدا ہوا کہ قاہرہ کی سیر کیوں کر اور کس جگہ سے شروع کی جائے۔ اہرام مصر اور تاریخی عمارتوں کے علاوہ اور کیا کیا دیکھا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ قاہرہ میں تاریخی عمارتوں اور یادگاروں کی کمی نہیں ہے۔ قدیم محلات ' عمارتیں ' مساجد' بازار ' ایک عجائب کدہ ہے کہ ہر طرف بکھرا ہوا ہے۔ روم بھی بہت قدیم تاریخی شہر ہے مگر قاہرہ ہمارے خیال میں اس پر بازی لے گیاہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس کے گن گانے کیلئے مغربی ذرائع ابلاغ موجود نہیں ہیں۔ بقول خان صاحب کے "پی ۔ آر" کی کمی ہے ورنہ قاہرہ دوسرے تمام قدیم تاریخی شہروں پر فوقیت رکھتاہے۔

بٹ صاحب نے کہا " دیکھئے جناب تاریخی عمارتیں' اہرام مصر' قدیم مسجدیں' اپنی جگہ مگر سب سے پہلے میں پٹھانوں کا بازار دیکھنا چاہتاہوں۔ آخر وہ ہمارے ہم وطن اور بھائی ہیں۔ ان کے ساتھ پشتو ملی اردو میں باتیں کریں گے۔ پشاوری قہوہ پیئں گے اور چپلی کباب کھائیں گے۔"

ہم نے حیران ہو کر انہیں دیکھا۔ قاہرہ میں پٹھانوں کی کسی بستی کا کم سے کم ہمیں علم نہ تھا۔ " بھائی تمہیں یہ سب کس نے بتایا؟"

بولے۔ "بتاتا کون ہے ۔ آپ نے سنا نہیں کہ یہاں خان الخلیل کا بازار بہت مشہور ہے ۔ ہر شہر میں جس طرح چائنا ٹاؤن وغیرہ ہوتے ہیں اسی طرح قاہرہ میں پٹھانوں کا بازار ہے ۔ چل کر دیکھتے ہیں۔ قصہ خوانی بازار کی یاد تازہ ہوجائے گی۔"

خان صاحب بے ساختہ ہنسنے لگے۔ بولے۔ "شکر کرو کہ قاسم اردو نہیں جانتا ورنہ تمہاری جہالت کا سارے قاہرہ میں ڈھنڈورا پیٹ دیتا۔ میرے بھائی۔ بازار خان الخلیل پٹھانوں کا بازار نہیں ہے ۔ قاہرہ کا قدیم علاقہ ہے۔"

"خان صاحب مجھے بیوقوف بنانے کی کوشش نہ کیجئے۔"

"بھائی اس کیلئے کوشش کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ تو بنے بنائے ہیں۔ میری بات کا یقین نہیں ہے تو قاسم سے پوچھ لیجئے۔"

قاسم کی ایک خوبی بلکہ فائدہ یہ بھی تھا کہ بٹ صاحب تک اس سے بلا تکلف انگریزی بول سکتے تھے ۔ قاسم نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا۔ طرح طرح کے اور ملک ملک کے لوگوں کی انگریزی سن رکھی تھی۔ بٹ صاحب کی انگریزی تو اس کیلئے بامحاورہ انگریزی کی حیثیت رکھتی تھی۔

بٹ صاحب نے فوراً" قاسم سے رجوع کیا اور پوچھا ۔"یااخی ۔ یہ بازار الخلیل کس طرف ہے اور اس کی خوبی کیا ہے؟"

قاسم نے کہا" بازار خان الخلیل قاہرہ کی جان ہے ۔ یہ شہر کا سب سے پرانا اور انوکھا بازار ہے جسے دیکھ کر آپ کو الف لیلیٰ کی کہانیاں اور کردار یاد آجائیں گے۔"

"مگر یہاں رہتا کون ہے ؟"

"مصری رہتے ہیں اور کون رہے گا۔ پرانے مصر کی تصویر دیکھنی ہو تو خان الخلیل کو دیکھئے۔ آپ کہیں تو آپ کو اسی وقت لے چلوں ۔ ویسے خان الخلیل کو تفصیل سے دیکھنے کیلئے تو کئی دن درکار ہوں گے۔"

ہم نے کہا۔"تفصیل کا تو وقت ہمارے پاس نہیں ہے۔فی الحال خلاصے پر گزارہ کرلیں گے۔"

قاسم نے ہوٹل سے باہر نکل کر نہایت شیریں عربی میں ایک ٹیکسی والے کو پکارا اور اسے بتایا کہ " جامعہ الازہر چلو۔"

ہم نے کہا۔"بھائی ہمیں تو خان الخلیل جانا ہے۔ جامعہ الازہر بھی ضرور دیکھیں گے مگر پھر کسی وقت۔"

بولا۔" یااخی ۔ یہ بازار جامعہ الازہر کے بالکل سامنے واقع ہے اور شیطان کی آنت کی طرح بہت دور تک پھیلا ہوا ہے۔ بلکہ اس بازار کو دیکھنے جائیں گے تو آپ مسجد سیدنا حسین بھی دیکھ لیں گے۔" بعد میں معلوم ہوا کہ روایت کے مطابق مسجد سیدنا حسین وہ جگہ ہے جہاں حضرت امام حسینؓ کا سر مبارک دفن ہے۔ اس مسجد کی شان ہی الگ ہے اور یہاں نہ صرف سیاحوں کا ہجوم رہتا ہے بلکہ زیارت والے مسلمانوں کا بھی جمگھٹا لگا رہتا ہے۔ یہ قدیم طرز کی شاندار مسجد ہے۔ بہت زیادہ وسیع بھی نہیں ہے لیکن اپنی شان اور وضع قطع کے اعتبار سے نے منفرد ہے ۔ بہت لوگ زیارت کے وقت زاروقطار روتے ہیں اور آہیں بھرتے ہیں۔ خاص طور پر برقعہ پوش خواتین کو یہاں بہت زیادہ آہ زاری کرتے ہوئے پایا۔

خان صاحب نے پوچھا۔"کیاواقعی امام حسینؓ کا سرمبارک یہاں دفن ہے؟"

قاسم نے کہا۔"میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے یہی سنا ہے اور میرے باپ دادا بھی یہی سنتے آئے ہیں۔"

جامعہ الازہر کے بارے میں سبھی جانتے ہیں کہ یہ دنیا کی قدیم ترین یونیورسٹی ہے اور اسلامی علوم کا مرکز سمجھی جاتی ہے۔ کسی زمانے میں جامعہ الازہر کا نام سن کر عام مسلمان آنکھیں بند کرکے خشوع وخضوع سے دعائیں پڑھنے لگتے تھے۔ عالم اسلام کے علماء اور دینی حلقوں میں جامعہ الازہرآج بھی سند کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ قاہرہ کے پرانے علاقے میں واقع ہے۔ عمارت بھی وہی ہے جو زمانہ قدیم میں تعمیر کی گئی تھی اور آس پاس کا ماحول ویسے کا ویسا ہی ہے ۔ سیاحوں کی ٹولیاں جامعہ کے سامنے چوک میں گھومتی پھرتی ہیں اور تصویریں اتارنے میں مصروف رہتی ہیں۔

خان صاحب بولے۔" دیکھنے میں تو اتنی زیادہ پرانی نہیں لگتی۔ ہماری پنجاب یونیورسٹی اس سے زیادہ پرانی لگتی ہے ۔"

بٹ صاحب بولے ۔" کسی اور کے سامنے یہ نہ کہہ دینا ۔ بھائی یہ ہزاروں سال پرانی یونیورسٹی ہے۔ اس کا پنجاب یونیورسٹی سے کیامقابلہ اور پھر پنجاب یونیورسٹی انگریزوں نے قائم کی تھی جبکہ جامعہ الازہر مسلمان حکمرانوں کی یادگار ہے۔"

ہم نے کہا۔"دراصل ان کا اشارہ عمارت کی بوسیدگی اور خستگی کی طرف ہے۔ورنہ اتنا توخان صاحب بھی جانتے ہیں کہ جامعہ الازہر پنجاب یونیورسٹی سے پہلے قائم ہوئی تھی۔"

جامعہ الازہر کی دیکھ بھال کے لئے حکومت معقول امداد فراہم کرتی ہے۔ جبے ' عبائیں اور عمامے پوش یوں تو قاہرہ میں ہرجگہ نظر آتے ہیں۔ لیکن جامعہ الازہر کے اطراف میں اس پوشاک میں ملبوس زیادہ ترعلماء اور نورانی چہرہ لوگ ہوتے ہیں۔ یہ ایک عجیب طلسماتی سا ماحول ہے۔ فضاء میں علم وحکمت اور تقدس پایا جاتا ہے۔ اگرچہ آس پاس کے علاقے میں صفائی وغیرہ کا معیار بہت زیادہ اچھا نہیں ہے اس کے باوجود دل پر ایک عجیب سے کیفیت اور ہیبت طاری ہوجاتی ہے۔ یہ اس دور کی یادگار ہے جب مسلمان دنیا میں علوم وفنون کے ماہر سمجھے جاتے تھے اور آج کے مغربی عالم اور مفکر' ان کے گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے تھے مگر اب حالات مختلف ہیں۔ جامعہ الازہر آج بھی قائم ہے لیکن مغربی یونیورسٹیاں علوم وفنون اور سائنس وحکمت کی تعلیم وتحقیق میں بہت آگے نکل چکی ہے۔

یہ پتا نہ چلا سکا کہ اس بازار کا نام خان الخلیل کیوں رکھا گیا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ قاسم صاحب بھی اس معاملے میں زیادہ معلومات فراہم نہ کرسکے۔ یہ بازار کیا ہے ایک گورکھ دھندا ہے۔ سڑکیں' گلیاں درگلیاں اور بعض گلیاں تو اتنی تنگ ہیں کہ ایک شخص بھی مشکل سے گزر سکتا ہے۔ یہ بازار دراصل ایک ہزار ایک بازاروں کا مجموعہ ہے ۔ دنیا بھرکی اشیاء یہاں دستیاب ہوجاتی ہیں۔ خاص طور پر قدیم عربی مال واسباب کی کمی نہیں ہے۔ بازاروں اور گلیوں میں قدیم طرز کی محرابیں اور در بھی نظر آتے ہیں۔ ہوٹل بھی یہاں موجود ہیں مگر خالص عربی انداز کے ۔ ہم جیسے لوگوں کا وہاں گزارہ نہیں ہوسکتا۔ کچھ بازار چھتے ہوئے بھی ہیں۔ یعنی ان کے اوپر چھت ہے۔ یہ نہایت پراسرار قسم کا ماحول ہے۔ قدم قدم پر الف لیلیٰ کی کہانیوں کی یاد تازہ ہوجاتی ہے

بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آپ بھی اسی کے ایک کردار ہیں۔ ڈھکے ہوئے یا چھتے
ہوئے بازار قاہرہ کے علاوہ دمشق' اصفہان ' بغداد اور استنبول میں بھی ہیں۔ یورپ کے
بعض شہروں میں بھی ایسے بازار پائے جاتے ہیں مگر جو افسانوی اور الف لیلوی ماحول
یہاں ملتا ہے۔ لمبے لمبے چغے اور لبادے پہنے ہوئے لوگ سروں پر رومال یا پگڑیاں ۔
ہمارے پرانے محلوں کی طرح ہر طرح کی دکانیں' کہیں نانبائی نان لگا رہا ہے' سامنے
خریداروں کا مجمع منتظر کھڑا ہے اور اپنی باری کا انتظار کیے بغیر سب سے پہلے گرما گرم
نان حاصل کرنے کی کوشش میں ہر شخص مصروف ہے اور اس دوران میں عربی کی
بارش بھی جاری ہے۔ کہیں کلچہ فروش تھڑے پر یا ٹھیلا لگائے کھڑے ہیں۔ ان کے ارد
گرد بھی بچوں اور بڑوں کا ہجوم ہے۔ خواتین بھی دھکے کھانے اور دھکے دینے میں کسی
سے کم نہیں ہیں ۔ ہمارے ہاں فٹ پاتھوں اور بازاروں میں مختلف قسم کے کھانے
فروخت کرنے والے عام طور پر نظر آتے ہیں ۔ قاہرہ میں بھی یہی حال ہے ۔ شوربہ
فروشوں کی دکانوں پر کھانے والوں کا مجمع ہے۔ پھل پھلاری فروخت کرنے والے بھی
موجود ہیں۔ کہیں کوئی تسبیح ہاتھ میں لیے آنکھیں بند کیئے بیٹھے کسی خیال میں گم ہیں۔
یہ نسوار فروش ہیں۔ خود بھی نسوار سے شوق فرما رہے ہیں۔ کوئی خریدار آکر ٹھوکا دیتا
ہے تو چونک پڑتے ہیں۔ خدا جانے نسوار کا نشہ ہے یا افیم کی پینک میں ہیں ۔ گلیوں
کے علاوہ ذرہ بڑی سڑکوں پر بھی یہی اژدھام ہے ۔ ٹوٹی پھوٹی' پرانی اور شکستہ بسیں بھی
انجر' پنجر ہلاتی ہوئی گزر جاتی ہیں جن سے سواریاں لٹکی ہوئی ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے یہ
بسیں بھی کھدائی کے ذریعے اہرام کے ساتھ ہی برآمد کی گئی ہیں۔ تھڑوں اور چھوٹی
دکانوں پر لوگ بیٹھے شطرنج یا تاش کھیلنے میں مصروف ہیں۔ یہاں کوئی بھی بات نہیں کرتا
۔ کھیلنے والے اور کھیل دیکھنے والے سبھی غور و فکر میں کھوئے ہوئے ہیں ۔ کبھی کبھی
کوئی صاحب " ہوں ہاں" کی آواز نکال دیتے ہیں۔ ایک چال چلنے کے بعد پھر وہی
خاموشی اور استغراق طاری ہوجاتا ہے۔ ان سڑکوں اور گلیوں میں عورتیں اور مرد سبھی
دکان داری کرتے ہیں۔سبزی ' پھل اور دیگر کھانے پینے کی اشیاء فروخت کرنے کے
لئے گدھا گاڑیاں استعمال ہوتی ہیں۔ بچے اودھم مچاتے پھر رہے ہیں۔ پاؤں اور سر سے
ننگے ہیں لیکن عبائیں پہنے ہوئے ہیں کہ یہ ان کا قومی اور عام لباس ہے۔

ہم تو ایک طرح کی ونڈو شاپنگ کرنے میں مصروف تھے۔ نوادرات کی
دکانوں میں جاکر خریدنے کی استطاعت نہ تھی پھر بھی خان صاحب اور بٹ صاحب بعض
دکانوں کے اندر جاپہنچے اور مختلف اشیاء کی قیمتیں دریافت کرنے لگے۔ مول تول اور
بھاؤ تاؤ کرنے کے معاملے میں یہ لوگ بھی ہماری طرح ہیں بلکہ ہم سے بڑھ کر ہی ہوں
۔ چھوٹی بڑی ہر چیز کے بارے میں قیمت پر بحث ضرور ہوتی ہے۔ اگر زبان کی پرابلم
ہے تو انگلیوں اور ہاتھوں کی مدد سے قیمتیں طے کی جاتی ہیں۔

قاسم نے پہلے ہی بتادیا تھا کہ قیمتیں ہر چیز کی پوچھ لیں مگر خریدنے کا ارادہ نہ
کریں' مگر کوئی کہاں تک صرف قیمتیں پوچھ کر گزارہ کرسکتا ہے۔ ہم نے ایک شیونگ
کریم خریدلی۔ خان صاحب نے ایک چہرہ دیکھنے والا آئینہ خریدا۔ بٹ صاحب کی سمجھ
میں کچھ نہ آیا تو انہوں نے خربوزہ خریدلیا۔ خربوزہ انتہائی شیریں اور لذیذ تھا۔ بٹ
صاحب نے اپنی دانست میں کافی کم قیمت خریدا تھا مگر قاسم کو پتا چلا تو اس نے بتایا کہ
بٹ صاحب مار کھا گئے ۔ اس کی قیمت اور بھی کم تھی اس دکان داری اور خریداری
کے دوران میں قاسم ہم سے دور دور ہی رہا تھا کہ ہم بذات خود حالات کا مشاہدہ
کرسکیں۔ ظاہر ہے کہ ہم تو سیاح تھے ۔ مقامی لوگوں کے ساتھ تو سلوک ہی اور کیا
جاتا ہے۔

لیجئے صاحب ۔ یہ تھا خلیل خان کا بازار جہاں ہمیں بدقسمتی سے ایک بھی
خان صاحب نظر نہیں آئے ۔ سوائے ہمارے اپنے خان صاحب کے ۔

بٹ صاحب نے انہیں دیکھا اور کہا۔ " وہ دن گئے جب خلیل خان فاختہ
اڑایا کرتے تھے ۔ اب تو نہ خلیل خان نظر آتے ہیں اور نہ ہی فاختہ۔"

بازار خان خلیل جائیں اور کچھ کھانے پینے سے پرہیز کریں ۔ یہ ممکن ہی
نہیں ہے۔ چائے خانوں کے ساتھ ساتھ کبابوں والوں کی دکانیں بھی تھیں۔ یہاں کے
چائے خانوں میں بھی لوگ بیٹھے باتیں کرتے یا اونگھتے ہوئے نظر آئے۔ کباب بھی
کھائے مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی ۔ یعنی ہمارے ہاں کے کبابوں میں جو لذت
اور چٹ پٹا پن ہوتا ہے عربوں کے کباب ان سے محروم ہوتے ہیں۔ مرچ مسالے کا تو
تذکرہ ہی نہیں ہے ۔ کرم فرمائی ہے کہ تھوڑا سا نمک ڈال دیتے ہیں ۔ ورنہ ہم تیران

تھے کہ یہ کباب حلق سے کیوں کر اتریں گے ؟

بازار خلیل میں یوں تو مقامی لوگوں کا بھی اژدھام تھا لیکن سیاح یا سائح حضرات وخواتین کی بھی کمی نہیں تھی جن میں اکثریت اہل فرنگ کی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ یہی لوگ ان کا اصل شکار ہوتے ہیں اور ان کی وہ دونوں ہاتھوں سے کھال اتارتے ہیں۔ سیاح یہ سمجھتا ہے کہ اس مول تول کے ذریعے بہت سستا سودا کرلیا ہے مگر اس بے چارے کو علم نہیں ہوتا کہ وہ مصر کے بازار میں لٹ چکا ہے۔

دکانداروں کا یہ عالم ہے کہ سیاح کی صورت دیکھتے ہی یوں لپکتے ہیں جیسے مٹھائی پر مکھیاں۔ یہاں مختلف اشیاء فروخت کرنے والوں کے بازار الگ الگ ہیں۔ نوادرات کی دکانیں تو خیر قدم قدم پر نظر آجاتی ہیں۔ ہمارے ہاں پان سگریٹ کی اتنی دکانیں نہیں ہوتیں جتنی کہ وہاں نوادرات کی ہیں۔ ان بازاروں اور گلیوں میں خالص مصری اور مقامی اشیاء فروخت ہوتی ہیں۔ کہیں تسبیحیں اور جائے نمازیں بک رہی ہیں تو کہیں برتن فروش بیٹھے ہوئے ہیں۔ زیورات بنانے والوں کے بازار بھی ہیں۔ یہ زیورات ہمارے زیورات سے مختلف ہوتے ہیں۔ اس معاملے میں وہ فرعونوں سے زیادہ متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ ویسے ہم نے بہت سے ایسے مصری بھی دیکھے جو فرعونوں سے رشتے داری پر فخر محسوس کرتے ہیں۔

کسی دکان کے سامنے سے گزرنا کوئی آسان کام نہیں ہے ۔ جیسے ہی کوئی متوقع خریدار نظر آتا ہے ایک چھوڑ کئی کئی دکاندار اس کی طرف لپکتے ہیں ۔ "اہلاً وسہلاً" کے بعد عربی کا سبق شروع ہوجاتا ہے۔ ہم لوگ تو احتراماً ان کی گفتگو خاموشی سے سن لیا کرتے تھے مگر یورپ والے خاصی مداخلت کرتے ہیں ۔ اس پر بٹ صاحب بہت ناراض ہوئے۔ بولے۔ "یہ فرنگی کیا جانیں عربی کی قدر!"

اب قریب قریب وہی منظر دیکھنے میں آتا ہے جو ہمارے ریلوے اسٹیشنوں پر یا ٹیکسی اور تانگا اسٹینڈ پر ہوتا ہے ۔ یعنی ایک شخص پر بے شمار لوگ ٹوٹ پڑتے ہیں۔ کوئی اپنی دکان کی خوبی بیان کرکے ادھر کھینچ رہا ہے تو کوئی مخالف سمت میں لے جانا چاہتا ہے ۔ اگر آپ اکیلے ہیں تو آپ کے اعضائے جسمانی خطرے میں ہیں اور اگر ایک سے زائد ہیں تو ایک لمحے میں تین تیرہ ہوجاتے ہیں اور اپنے ساتھیوں کو تلاش کرتے

رہ جاتے ہیں۔ ہر دکاندار کی خواہش ہوتی ہے کہ آپ اگر اس کی ساری دکان نہیں تو کم ازکم چند اشیاء تو وہاں سے ضرور خریدیں ۔ آپ کیلئے وہ قیمتوں میں خاص رعایت کرنے پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔ صرف آپ کیلئے ۔

قاسم ان تمام مراحل سے ہمیں بخیرو عافیت گزار کر لے گیا۔ آفرین ہے اس شخص پر ۔ اگر یہ نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟

خان صاحب نے کہا۔ "ناخدا جس کا نہ ہو اس کا خدا ہوتا ہے۔ کوئی نہ کوئی بندوبست تو اللہ میاں کرہی دیتے۔"

بازار خان خلیل کوئی ایک بازار تو ہے نہیں۔ یہ تو گلیوں ' بازاروں کا مجموعہ ہے اور یہاں پہنچ کر یوں لگتا ہے جیسے آپ ہزاروں سال پہلے کے قاہرہ میں آگئے ہیں۔ ویسے قاہرہ میں بے شمار مقامات ایسے ہیں جہاں آپ کو یہی احساس ہوتا ہے کیونکہ ان میں کوئی خاص فرق پیدا نہیں ہوا ہے۔

کباب تو ہم نے جیسے تیسے حلق سے اتارلیے تھے مگر کام ودہن کی آزمائش سے محروم ہی تھے۔

قاسم نے بٹ صاحب اور خان صاحب کی زبان سے بار بار بھوک کا تذکرہ سنا تو یہ تجویز پیش کی کہ آپ کو یہاں کی مخصوص ڈش کھلاتے ہیں۔

"وہ کیا ہے؟"

کہا۔ "کبوترا!"

اب حقیقت یہ ہے کہ ہم لوگوں نے کبھی کبوتر کھانے کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ کبوتروں کو دیکھنے کے مواقع بار بار ملے تھے مگر انہیں کھانے کا خیال بھی کبھی دل میں نہیں آیا ۔ البتہ حکماء سے یہ ضرور سنا تھا کہ بعض بیماریوں میں کبوتر کا گوشت کھانا باعث شفا ہوتا ہے۔ یا پھر "خون کبوتر جیسے آنکھوں" کا محاورہ سن رکھا تھا۔ ہم یورپ سے ہوکر آئے تھے۔ وہاں تو ہر تاریخی مقام پر کبوتروں کے غول کے غول ہوتے ہیں اور سیاحوں سے خاصی بے تکلفی کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں۔ سیاح انہیں دانہ بھی کھلاتے ہیں۔ قاہرہ کی پرانی مساجد اور عمارتوں کے آس پاس بھی کبوتروں کے غول نظر آئے ۔ شاید کھانے والے کبوتر وہیں سے پکڑ کر لائے جاتے ہوں گے۔

خان صاحب نے صاف انکار کردیا ۔ بولے۔" معاف کیجئے میں کبوتر نہیں کھاؤں گا۔"

"مگر یہ حلال جانور ہے۔" بٹ صاحب نے نکتہ طرازی کی۔

اول تو یہ جانور نہیں پرندے ہیں دوسری تمام حلال چیزیں کھانی ضروری تو نہیں ہیں۔ مثلاً" آپ نے کبھی گھوڑے کا اونٹ کا گوشت کھایا ہے؟"

"کبھی موقع نہیں ملا' ورنہ ضرور کھاتے ۔ آخر ہمارے بزرگ یہی کھایا کرتے تھے۔"

"ہمارے بزرگ تو جہاد بھی کیا کرتے تھے۔ کنیزیں بھی رکھتے تھے ۔ فتوحات بھی کرتے تھے۔"

بے پروائی سے بولے۔" دراصل ہمیں کبھی موقع ہی نہیں ملا ورنہ ہم بھی کچھ کرکے دکھا دیتے۔"

ہمیں تو تیتر اور بٹیر تک کھانے کا شوق نہیں ہے۔ بھلا اتنا مختصر سا پرندہ کوئی کیا کھائے اور اس میں کہاں بوٹی تلاش کرتا پھرے۔

بٹ صاحب نے کہا۔" فکر نہ کریں ۔ کبوتر میں کافی بوٹیاں ہوتی ہیں۔ بلکہ مرغ سے بھی کم ہڈیاں ہوتی ہیں ۔ بس اسے مرغی سمجھ کر کھانا چاہئے۔"

قاسم خاموشی سے ہماری گفتگو سن رہا تھا۔ اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ ہم لوگ انتہائی جمہوریت پسند ہیں اور باہمی بحث و تمحیص کے بغیر کوئی کام نہیں کرتے۔ وہ اتنا متاثر ہوا کہ ایک بار کہنے لگا کہ آپ لوگوں کوتو انگلستان یا فرانس میں ہونا چاہیے تھا بلکہ بات بات پر تو وہ لوگ بھی بحث نہیں کرتے۔

قاسم نے کہا۔" مجھے یہ بتائیے کہ فیصلہ کیا ہوا؟"

ہم نے کہا۔" بھائی اس کا دل رکھ لو ورنہ کیا سوچے گا۔ ہماری خاطر اپنا قیمتی وقت ضائع کررہاہے۔ کیا ہم اس کی خاطر ایک کبوتر تک نہیں کھاسکتے؟"

چنانچہ قاسم کی قیادت میں ہم ایک تندور نما ہوٹل کے سامنے پہنچ گئے جس کے سامنے لکڑی کی کرسیاں اور بنچیں رکھی ہوئی تھیں۔ یہاں بے شمار عباپوش اور عمامہ پوش حضرات تشریف فرما تھے۔ کچھ عربی دانی کا مظاہرہ کررہے تھے ۔ کچھ خاموش سوچ میں گم بیٹھے تھے۔ قہوے کی پیالی سامنے رکھی ہوئی تھی۔ مگر نگاہیں خلاء میں تھیں۔ ایک میز پر دو حضرات جوس سے شوق فرما رہے تھے۔

"خاصی زندہ دل اور کھلنڈری قوم ہے۔" بٹ صاحب نے کہا۔

خاں صاحب بولے۔" مگر کسی کھیل میں آج تک دنیا میں نام پیدا نہیں کیا۔"

"بھائی ۔ دراصل حکومت ان کی سرپرستی نہیں کرتی ورنہ ان میں بہت زیادہ صلاحیتیں ہیں۔"

کبوتر خانہ' معاف کیجئے کبوتر فروش کی دکان پر جاکر ہم سب کو ایک خوشگوار حیرت ہوئی جب ایک صحت مند اور تروتازہ دوشیزہ نے اندر سے جھانکااور پھر اپنے ساتھی سے کچھ سرگوشی کی۔ لڑکی کا تعلق اسی دکان سے تھا اور معلوم ہوا کہ باروچن کے فرائض سرانجام دیتی تھی۔ صورت شکل واجبی تھی لیکن نوجوان اور صحت مند تھی اس لئے آنکھوں کو بھلی لگی۔ قاسم نے فوراً" عربی زبان میں بات چیت شروع کردی پھر ہم سے پوچھا کہ ہر شخص کتنے کبوتر کھائے گا؟"

ہم نے کہا۔"پہلے یہ تو پتا چلے کبوتر کس شکل وصورت کا ہوگا۔ شوربہ ہوگا 'پکا ہوگا' یا بھنا ہوا ہوگا۔"

بولے ۔"بھنا ہوا بہتر ہوتا ہے۔ میں تو وہی کھاتا ہوں۔"

بھنے ہوئے تین کبوتروں کا آرڈر دینے کے بعد ہم لوگ بھی لکڑی کی کرسیوں پر بیٹھ گئے ۔ کچھ دیر میں اندر سے ایک نوعمر لڑکا عبا کے دامن سے ہاتھ صاف کرتا ہوا باہر آیا اور قاسم سے بات چیت شروع کردی۔ اہل کتاب ہونے کے باوجود ہماری سمجھ میں خاک نہ آیا۔ البتہ "ہندی" اور " السید" پلے پڑا۔ دراصل وہ یہ پوچھ رہاتھا کہ کیا یہ سید حضرات انڈیا سے آئے ہیں؟

قاسم نے بتایا کہ یہ پاکستان سے آئے ہیں اور الحمد اللہ مسلمان ہیں۔

"کلمہ گو؟" اس نے تصدیق چاہی اور پھر اطمینان کرنے کے بعد "اہلاً وسہلاً" کہہ کر علیک سلیک کرنے کے بعد واپس چلاگیا۔ کچھ دیر بعد پلیٹوں میں بھنے ہوئے کبوتر بھی آگئے مگر یہ سروس کرنے والی مصری دوشیزہ تھی۔ وہ کچھ مسکراتی '

کچھ شرماتی ہوئی آئی۔ پلیٹیں ہمارے سامنے میز پر رکھ دیں اور خود کھڑی ہوگئی۔ قریب سے دیکھا تو اور زیادہ دلکش لگی ۔ کھلتا ہوا سانولا رنگ ' سیاہ بال' سیاہ آنکھیں' ناک نقشہ البتہ تیکھا نہیں تھا۔ مگر اس کی کمی قدو قامت کے تناسب نے پوری کردی تھی۔

ہماری توجہ بٹ گئی تھی کبھی کبوتر کو دیکھتے' کبھی اس دوشیزہ کی جانب توجہ دیتے جو قاسم سے گفتگو میں مصروف تھی۔ قاسم نے خاصی گاڑھی عربی بولنے کے بعد مترجم کے فرائض سرانجام دینے شروع کردیئے۔ کہاکہ یہ لڑکی ہندی فلموں کی شوقین ہے اور آپ لوگوں سے اس بارے میں کچھ پوچھنا چاہتی ہے۔

بٹ صاحب سے پورے زور سے لاحول پڑھی۔ وہ دونوں چونک کر دیکھنے لگے۔ پڑھی تو انہوں نے لاحول ہی تھی جو ظاہر ہے کہ عربی میں مگر ادائیگی کا انداز ایسا تھا کہ دونوں ان کی شکل دیکھنے لگے۔ انہوں نے نے قاسم سے کہا۔"انہیں بتادو کہ ہم انڈیا کی فلموں پر لعنت بھیجتے ہیں۔"

"مگر کیوں ؟" لڑکی نے معصومیت سے سوال کیا۔

" اس لیے کہ وہ ہمارا دشمن ہے۔ ہماری اس سے جنگ ہوچکی ہے ۔ اس نے ہمارے ساتھ بہت ناانصافی کی ہے۔"

لڑکی نے بہت معذرت کی ۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ تو پاکستان کو بھی انڈیا کا حصہ ہی سمجھتی تھی' اس لیئے چلی آئی ۔ معذرت طلب کرکے وہ رخصت ہوگئی۔ خان صاحب بولے۔"اس لڑکی کا جغرافیہ بہت کمزور ہے ۔"

ہم نے کہا تاریخ میں بھی کوری نظر آئی ہے

کبوتر ہم نے تو چکھ کر ہی چھوڑ دیا

بلکہ چکھنا بھی تہمت ہی سمجھئے خان صاحب نے البتہ بڑے شوق سے کھایا اور کہتے رہے کہ مرغ سے زیادہ لزیز ہے۔

قاسم نے بھارتی فلموں کا تذکرہ شروع کردیا۔ بھارتی فلمیں قاہرہ میں کافی تعداد میں آتی تھیں۔ اور ناچ گانوں کی وجہ سے مقبول بھی تھیں۔ ان فلموں کے عربی میں سب ٹائٹل بھی ہوا کرتے تھے جس کی وجہ سے مصریوں کو کہانی' مکالموں اور گانوں کا مطلب بھی پتا چل جاتا تھا ۔ بعد میں ہم نے خود بھی کئی سینما گھروں پر بھارتی فلموں

مصریوں کا رش دیکھا۔ عورت' مرد' بچے ' بوڑھے سبھی جوق در جوق آرہے تھے۔ بعض فلمیں تو وہاں سلور جوبلی بھی منالیا کرتی تھیں۔

بٹ صاحب کافی دیر تک عالم اسلام کی بے حسی کا ماتم کرتے رہے ۔ مصر کے قدیم بازاروں میں بھی عورتیں کافی تعداد میں نظر آتی ہیں۔ بعض پرکشش بھی ہوتی ہیں مگر دبلی پتلی خواتین کو دیکھنے کی حسرت ہی رہی۔

ہم نے پہلے بتایا کہ بٹ صاحب نے قاہرہ پہنچتے ہی دو چیزیں دیکھنے کی فرمائش کی تھی۔ ایک تو دریائے نیل اور دوسری قلوپطرہ۔ خیر دریائے نیل تو انہوں نے دیکھ لیا۔ قاہرہ میں اگر آپ گھومیں پھریں تو دریائے نیل سے اکثرواسطہ پڑتا ہے۔ کہیں لمبا چوڑا دریا اور کہیں مریل سا نیم دریا۔ جس طرح ایک زمانے میں لاہور میں دو طرح کے دریائے راوی تھے۔ ایک دریائے راوی اور دوسرا راوی ضعیف ۔ یہ راوی ضعیف دراصل دریائے راوی کی باقیات سمجھ لیجئے۔ دریانے جب رخ بدلا تو اس کا ایک حصہ برائے نام ہی رہ گیا۔ جب بہت زیادہ بارش ہوتی تو دریائے میں سیلاب آتا تو اس میں بھی زندگی کے آثار نظر آجاتے' ورنہ بس نشان عبرت بنا پڑا رہتا۔

دریائے نیل کے چھ پل ہیں۔ 26 اکتوبر کا پل سب سے بڑا پل ہے ۔ اسے قصرالنیل بھی کہاجاتاہے۔ اسے دیکھنے کی خواہش توپوری ہوگئی اب سوال یہ تھا قلوپطرہ انہیں کیونکر دکھائی جائے۔

"بھائی قلوپطرہ تو عرصہ ہوا مرکھپ گئی۔"

بولے"اس کی ممی تو ہوگی؟"

قاسم نے مطلع فرمایاکہ قاہرہ میں کم ازکم قلوپطرہ کی ممی موجود نہیں ہے۔

خان صاحب نے کہا"بہت زیادہ شوق ہے تو تمہیں فلم قلوپطرہ دکھا دیں گے۔ ورنہ ایلزبتھ ٹیلر کی کوئی اچھی سے تصویر دیکھ لو کہ فلم قلوپطرہ میں مرکزی کردار اسی نے ادا کیاتھا۔"

قاسم کواس بات پر بہت حیرانی تھی کہ یہ عجیب شخص ہے جو قاہرہ پہنچ کر نہ تو اہرام کودیکھنے کا خواہش مند ہے' نہ تاریخی عمارتوں کی دیدار کا طلب گار ہے۔

ہم نے کہا"بھائی زیادہ حیران ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس قسم کے

عجائبات انسانوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ یقین نہ آئے تو بٹ صاحب کو دیکھ لیجئے۔"

قاسم سے بٹ صاحب نے قلوپطرہ کے بارے میں بہت کرید کرید کر پوچھا۔ دراصل انہوں نے بچپن ہی سے قلوپطرہ کے بارے میں بہت سی داستانیں اپنی نانی اماں کی زبانی سن رکھی تھیں۔ جب قدرے بڑے ہوئے تو اس کے بارے میں کہانیاں پڑھیں۔ اور بڑے ہوئے تو ناولیں پڑھیں، جوان ہوکر فلم بھی دیکھ ڈالی۔ بس اس طرح وہ قلوپطرہ کے نادیدہ پرستار بن گئے۔

قاسم ہم سب کو لے کر ایک ریستوران میں پہنچ گیا۔ یہ ایک ماڈرن ریستوران تھا۔ قاہرہ میں ہم نے یہ بھی بات دیکھی کہ ہر جگہ عملہ ضرورت سے زیادہ ہوتا ہے۔ شاید یہ تیسری دنیا کے تمام ملکوں کا رواج ہے کہ بے شمار کام کرنے والے ہوتے ہیں جبکہ مغربی ملکوں میں یہی کام فرد واحد کے ذمے ہوتا ہے۔ یہاں بھی درجنوں ویٹر موجود تھے پھر ان کی دیکھ بھال اور نگرانی کیلئے ایک ہیڈ ویٹر تھا۔ اس کی نگرانی کے لئے بھی کوئی ہوگا۔ اس طرح درجہ بدرجہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔

قاسم نے پہلے تو اچھی سی سیخ کا آرڈر دیا پھر کہا کہ دیکھیے حبیبی میں آپ کو قلوپطرہ اور مصر کے بارے میں کچھ بتانا چاہتا ہوں تاکہ آپ یہاں سے لاعلم ہی نہ چلے جائیں۔ قاسم نے مصر اور قلوپطرہ کے بارے میں جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ آپ بھی سن لیجئے۔

قدیم اہل مصر حسام بن نوح کے بیٹے کی اولاد سے تھے جس کا نام مصرایم تھا۔ اسی لئے اس علاقے کا نام مصر رکھا گیا۔ مصری تمدن دنیا کا قدیم ترین تمدن کہا جاسکتا ہے۔ اس کا آغاز ۵۰۰۴ قبل مسیح میں ہوا تھا۔ مصر کے اولین حکمران فرعون کہلاتے تھے۔ فراعنہ کے پہلے دس خاندان شہر منفس میں ایک ہزار سال تک حکومت کرتے رہے۔ اس زمانے میں انسانی علم کے مطابق دنیا میں صرف آٹھ حکومتیں قائم تھیں جن میں ہند، ہنس، چین، مصر، کریٹ، بابل، ایران وغیرہ شامل تھے۔ ان تمام حکومتوں میں سب سے بڑی حکومت مصر کی تھی کیونکہ روایت کے مطابق باقی تمام حکومتوں کا زیر تسلط رقبہ مصر کے مقابلے میں کم تھا۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مصر کو اس عہد میں کس قدر سطوت اور سان وشوکت حاصل تھی۔

مصر کے دس حکمرانوں یعنی فراعنہ نے منفس میں ایک ہزار سال تک حکمرانی کی پھر ۴۰۰۰ قبل مسیح میں حکومت کا پایہ تخت شہر "طب" میں منتقل ہوگیا۔ مصر کے پہلے اکتیس حکمران جو فرعون کہلاتے تھے، ان کی تعداد ۲۷۰ بتائی جاتی ہے۔ یہ لوگ خالص مصری تھے۔ انہوں نے ۳۲۳ قبل مسیح تک مصر پر بڑی شان وشوکت اور وقار کے ساتھ حکمرانی کی۔ اس کے بعد مصر پر سکندر اعظم نے یلغار کی اور قبضہ کرلیا۔ اسکندریہ کا شہر سکندر اعظم ہی نے آباد کیا تھا اور یہ بھی ایک قدیم شہر ہے۔ اس طرح مصر میں پہلی بار ایک غیر ملکی بادشاہت قائم ہوئی کیونکہ سکندر اعظم یونان سے آیا تھا۔ سکندر تو مصر کو فتح کرنے کے بعد واپس چلا گیا لیکن اس کے مرنے کے بعد بابل کے گورنر بطلیموس نے مصر پر حملہ کرکے یونانی گورنر پر فتح حاصل کرلی اور مصر کا بادشاہ بن گیا۔ اس طرح بطلیموس مصر کا ۳۲ واں حکمراں تھا اور اس کے عہد سے مصر میں ایک نئی بادشاہت کی داغ بیل پڑی تھی۔ بطلیموس کی اولاد نے کافی عرصے تک مصر پر حکومت کی۔ قلوپطرہ اسی خاندان سے تعلق رکھتی تھی اور وہ خاندان بطلیموس کی تیرھویں اور آخری حکمراں تھی کیونکہ اس کے بعد رومنوں نے مصر پر قبضہ کرلیا تھا۔

۲۸ قبل مسیح میں یورپ کی عظیم سلطنت روما تھوڑا سا فاصلہ خانہ جنگی میں مبتلا تھی۔ اس سلطنت کو رومتہ الکبریٰ کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ روم کے دو بڑے جنرل پومپی اور سیزر اقتدار کی جنگ میں مصروف تھے۔ آخرکار سیزر نے پومپی کو شکست فاش دے کر بھاگنے پر مجبور کردیا۔ جنرل پومپی نے بحری جہاز کے ذریعے فرار ہوکر مصر کے دارالحکومت اسکندریہ کا رخ کیا۔ مصر اور جنرل پومپی کی سلطنت کے درمیان بہت اچھے تعلقات رہے تھے بلکہ جنرل پومپی کا ارادہ تھا کہ مصر میں اپنی فوجی قوت کو یکجا کرکے دوبارہ سیزر سے نبرد آزما ہوکر اقتدار واپس لے لے لیکن جن دنوں جنرل پومپی نے اسکندریہ کا ارادہ کیا اس زمانے میں خود مصر میں بھی غیر معمولی حالات تھے۔

خاندان بطلیموس کے تیرھویں بادشاہ کا انتقال ہوچکا تھا اور اس کی جگہ دستور کے مطابق قلوپطرہ تاج وتخت کی مالک تھی کیونکہ وہ بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھی۔ یہ حسین اور پری چہرہ ملکہ اپنی رنگین مزاجیوں کیلئے بھی شہرت رکھتی تھی۔ مصر

میں ایک رسم یہ بھی تھی کہ باپ کے مرنے کے بعد سب سے بڑی بیٹی تخت وتاج کی
مالک ہوتی تھی اور بیٹا اس حق سے محروم رہتا تھا۔ قلوپطرہ کے باپ کی خواہش تھی کہ
اس کے مرنے کے بعد قلوپطرہ اپنے بھائی سے شادی کرلے اور وہ دونوں مل کر حکمرانی
کریں۔ قدیم سلطنت مصر میں بھائی بہن کی شادی کو برا نہیں سمجھا جاتا تھا لیکن قلوپطرہ
نے اپنے چھوٹے بھائی سے شادی کرنے سے انکار کردیا اور تاج وتخت پر قابض
ہوگئی۔ چھوٹے بھائی نے اپنے حامیوں کی مدد سے بغاوت کردی۔ اس جنگ میں قلوپطرہ
کو شکست ہوگئی اور اسے مصر سے بھاگ کر شام میں پناہ لینی پڑی جب جنرل پومپی پناہ
لینے مصر پہنچا تو وہاں قلوپطرہ کا چھوٹا بھائی حکومت کررہا تھا جسے بطلیموس ۱۴ کا خطاب ملا
تھا۔ وہ اپنے امراء اور مشیروں کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنا ہوا تھا۔ بطلیموس نے اپنا پایہ تخت
اسکندریہ کو بنایا تھا جو کہ ایک خوبصورت شہر اور خوشحال ومعروف بندرگاہ تھی۔ ان ہی
دنوں بطلیموس کو یہ اطلاع بھی ملی کہ اس کی بہن قلوپطرہ نے شام میں ایک لشکر جرار
اکٹھا کرلیا ہے اور خشکی کے راستے مصر پر قبضہ کرنے کے لئے آرہی ہے۔ دوسری
مشکل یہ پیش آئی کہ جنرل پومپی کے تعاقب میں جولیس سیزر بھی اسکندریہ پہنچ گیا
پومپی تو فرار ہوگیا اور بعد میں ہلاک کردیا گیا مگر جولیس سیزر نے اسکندریہ کے شاہی
محل میں قیام کیا اور بطلیموس کو مرعوب کرنے کے لئے ہدایات جاری کرنی شروع
کردیں۔ قلوپطرہ کی فوجیں مصر پہنچ گئی تھیں مگر اس ذہین اور حسین عورت کو یہ علم تھا
کہ وہ جولیس سیزر کے ساتھ مقابلہ نہیں کرسکے گی اس لئے وہ ایک روایت کے مطابق
نہایت پراسرار طریقے سے جولیس سیزر کے محل میں پہنچ گئی۔ وہ ایک بیش قیمت قالین
میں لپٹی ہوئی تھی جب قالین کھولا گیا تو اس کے اندر سے قلوپطرہ اپنے تمام تر حسن
وجمال کے ساتھ برآمد ہوئی اور جولیس سیزر کے ہوش وحواس پر چھاگئی۔

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔" بٹ صاحب بے صبری سے بولے" اس کے بعد
بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے سب معلوم ہے۔"

"مگر کیسے؟"

بولے "میں نے فلم قلوپطرہ دیکھی ہے۔"

لیجئے قصہ ہی تمام ہوگیا۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد قاسم نے بھی خاموش رہنا
ہی مناسب خیال کیا۔

5

ترکوں نے جب مصر کو فتح کیا تو محمد علی پاشا کو مصر کا گورنر مقرر کیا۔ یہ شاہ
فاروق کا پردادا تھا۔ اس نے کچھ عرصے بعد بادشاہت کا اعلان کردیا۔ اس کے لشکری اور
دوسرے امراء ترک تھے اور عربی سے نابلد تھے۔ اس خاندان کا آخری حکمران شاہ
فاروق تھا جسے فوجی بغاوت کے ذریعے معزول کرکے جلاوطن کردیا گیا اور وہ ایک جلاوطن
اور مایوس شخص کے طور پر اٹلی میں رہا جہاں اس کے عیش وطرب کا سلسلہ جاری رہا
حالانکہ دولت میں کمی آگئی تھی۔ وہ ایک خوش خوراک اور رنگین مزاج آدمی تھا اور
خوش خوراکی ہی اس کی موت کا سبب بنی تھی۔

مصر پر فاطمیوں، ترکوں اور مملوکوں نے بھی حکمرانی کی ہے اور ان کی
یادگاریں، مساجد، قلعوں، محلات اور دوسری عمارتوں کی شکل میں قاہرہ کے چپے چپے پر
بکھری ہوئی ہیں۔ سلطان صلاح الدین ایوبی عالم اسلام کا ہیرو اور نجات دہندہ کہلاتا ہے۔
اس کا تعمیر کردہ قلعہ بھی قاہرہ میں موجود ہے۔ قلعے کے درودیوار شکستہ ہوچکے ہیں لیکن
اس کی ہیبت اور وقار میں کمی نہیں آئی ہے۔ اس قلعے سے قاہرہ کا تمام شہر نظر آتا

ہے۔ یہاں پہنچ کر دل ودماغ پر ایک عجیب والہانہ کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔ ان درو دیوار کے درمیان وہ مسلمان فاتح رہا کرتا تھا جس نے عیسائیوں کی مشترکہ قوت کو پارہ پارہ کرکے دوبارہ اسلام کا بول بالا کردیا تھا۔ چشم تصور میں جب اس دور کے واقعات لہراتے ہیں تو ہمت بھی بندھی اور مایوسی بھی ہوئی ۔ واقعی دنیا مقام عبرت ہے۔ کیسے کیسے لوگ اس دنیائے بے ثبات میں آئے اور اپنے اپنے کردار ادا کرکے رخصت ہوگئے مگر ان میں سے کچھ لازوال شہرت اختیار کرگئے اور انہوں نے حیات جاوداں پائی۔ سلطان صلاح الدین ایوبی بھی اسلام کا ایک ایسا ہی فرزند تھا۔

تیسری دنیا کے ہر بڑے اور ترقی یافتہ شہر کی مانند قاہرہ کے بھی دو روپ ہیں ایک قدیم اور ایک جدید ۔جدید شہر مغرب کی جھلک پیش کرتا ہے اور مشرقی حصہ یوں لگتا ہے جیسے وہاں زمانے کی رفتار ہی تھم گئی ہے ہر چیز اور ہر منظر وہی ہے کہ جو ہزاروں سال پہلے ہوگا مصر کی نئی اور پرانی نسل میں بھی یہی فرق ہے جو جدید اور قدیم شہر میں ہے نئی نسل مغرب سے متاثر ہے ۔کوٹ پتلون ' اسکرٹ' مغربی انداز و اطوار لڑکیوں اور لڑکوں میں وہی بے حجابی اور بے باکی جو مغرب کا طرہ امتیاز ہے بلکہ قاہرہ میں ہم نے ماڈرن لوگوں کو کچھ زیادہ ہی مغرب زدہ دیکھا۔ شہر کے جدید حصوں میں خواتین بھی ہر جگہ کام کرتی ہوئی نظر آتی ہیں ان کی پوشاک بھی مغربی ہے اور انداز بھی۔ ان میں خوش شکل اور خوش ادا خواتین بھی ہیں جو خوبصورت نسل سے تعلق رکھتی ہیں لیکن پرانے مصری اسی پرانے ڈگر پر گامزن ہیں۔ مسجدوں میں خاص طور پر جمعہ کے روز خوب رونق ہوتی ہے ۔ ہجوم اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ مساجد کے سامنے کی سڑکیں بھی نمازیوں سے بھر جاتی ہیں۔

مصر میں قبرستان بھی دو قسم کے ہیں۔ ایک قدیم اور دوسرے جدید۔ قبرستان ہمارے قبرستان کے مقابلے میں کہیں بہتر نظر آئے ۔ قبرستان میں خواتین "عموماً" فاتحہ خوانی کے لیے جاتی ہیں اور اتنی بڑی تعداد میں جاتی ہیں کہ ان کے لیے علیحدہ بندوبست کیا جاتا ہے ۔ مصر میں طلباء کو ہمیشہ اہمیت حاصل رہی ہے۔ فوجی انقلاب سے پہلے ایک زمانہ تو ایسا بھی تھا کہ طلبا جب چاہتے تھے حکومت کا تختہ الٹ دیا کرتے تھے '

ابو القاسم کے ساتھ ہم نے قاہرہ کو جس روپ اور جس انداز میں دیکھا شاید ان کے بغیر ممکن نہ ہوتا۔

بٹ صاحب کہنے لگے " یہ شخص تو ہمارے لیے خواجہ صاحب ثابت ہوا ہے ۔"

"کون خواجہ صاحب ؟"

" ارے بھئی وہی جو بھٹکے ہوئے لوگوں کو راستہ دکھایا کرتے تھے۔"

"ہاں ہاں وہی ۔ اس کا مطلب ہے کہ کشمیری اس زمانے میں بھی لوگوں کی بھلائی کے کام کرتے رہتے تھے۔"

بٹ صاحب خواجہ خضر کو بھی کشمیری سمجھ رہے تھے مگر ہم نے آنکھوں ہی آنکھوں میں انہیں منع کردیا۔

وہ آہستہ سے بولے ۔"یہ شخص تو بالکل جاہل ہے۔ خواجہ خضر کو بھی کشمیری بنا دیا"

ہم نے کہا۔"تو تمہارا کیا حرج ہے ' بے چارے کو خوش ہوجانے دو۔

بولے"آپ نے گربہ کشتن روز اول والی بات نہیں سنی؟ اگر ہم نے روک ٹوک نہیں کی تو کل یہ فرمائیں گے ' حضرت آدم بھی کشمیری تھے چونکہ۔ وہ آسمان سے جب پھینکے گئے تھے تو کشمیری تھے تو کشمیر ہی میں جاکر آباد ہوئے تھے۔"

ہم نے کہا۔"مگر حضرت آدم کے پیر کا نشان تو سری لنکا میں ہے ۔ ہم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔"

بولے ۔"سیروسیاحت کرتے ہوئے سری لنکا بھی پہنچ گئے ہوں گے ۔ اس زمانے میں انہیں اور کوئی کام تو تھا نہیں۔"

ہوٹل واپس پہنچے تو استقبالیہ پر السید راجندر ناتھ کا پیغام ہمارے لئے موجود تھا ۔ وہ کافی دیر تک ہمارا انتظار کرنے کے بعد کہیں چلے گئے تھے مگر دھمکی دے کر گئے تھے کہ واپس آئیں گے تو ہمارے ساتھ سیروسیاحت کا پروگرام بنائیں گے۔

" اب کیا کریں ۔ یہ تو بڑی گڑبڑ ہوگئی ہے۔" خاں صاحب نے کہا۔

" کیا گڑبڑ ہوگئی؟"

"یار ہمیں ابوالقاسم جیسا کام کا آدمی مل گیا ہے۔ اب راجندر ناتھ کی ضرورت ہی کیا ہے؟"

بٹ صاحب نے انہیں شرم دلائی۔ "بڑے افسوس کی بات ہے۔ آپ تو بہت مطلبی بلکہ طوطا چشم نکلے۔ اب ابوالقاسم مل گیا ہے تو راجندر ناتھ سے جان چھڑانا چاہتے ہو۔"

ہم نے کہا۔ "کیا حرج ہے اگر راجندر ناتھ بھی ہمارے ساتھ چلے۔"

بولے۔ "آپ نے سنا نہیں کہ یہاں ٹیکسی والے تین سے زیادہ سواریاں نہیں بٹھاتے۔ ہمیں دو ٹیکسیاں لینی پڑیں گی۔"

"دیکھو اول تو راجندر ناتھ صرف رات کے وقت ہی ہمیں ملتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر ٹیکسی میں تھوڑا سا خرچہ زیادہ ہوگیا تو کون سی آفت آجائے گی۔"

بٹ صاحب نے فوراً" نکتہ طرازی کی۔" یہاں تو مسجدیں بہت ہیں۔ ہم اگر مسجد کے اندر گئے تو راجندر ناتھ کیا کرے گا؟"

"کرے گا کیا۔ وہ بھی ہمارے ساتھ مسجد کے اندر چلا جائے گا۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" بٹ صاحب باقاعدہ ناراض ہوگئے۔" وہ ہندو ہے۔ مسجد میں کیسے جاسکتا ہے؟"

ہم نے کہا" بھئی یہ مسجدیں اب تاریخ کا حصہ بن چکی ہیں۔ سبھی سیاح وہاں جاتے ہیں۔ وہاں اب نمازیں تو پڑھائی نہیں جاتیں۔ آپ نے دیکھا نہیں مسجد کے صحن میں لوگ جوتے پہنے گھوم رہے تھے۔"

طے پایا کہ راجندر ناتھ سے بے وفائی نہیں کی جائے گی۔ راجندر ناتھ دو گھنٹے بعد واپس آگیا تو ہم نے اسے سارے دن کی روداد سنائی۔ وہ بہت خوش ہوا کہ ہمیں ایک بہت کار آمد بندہ مل گیا ہے کیونکہ اس قدر تفصیل سے تو خود اس نے بھی قاہرہ نہیں دیکھا تھا۔

"اب رات کا کیا پروگرام ہے؟" راجندر ناتھ نے پوچھا۔

"بھئی بہت تھک گئے ہیں ۔" بٹ صاحب نے جمائی لے کر کہا۔

خان صاحب بولے۔" بھائی نام یہاں آرام کرنے نہیں گھومنے پھرنے آئے ہیں ۔ اگر چند راتیں جاگ لیں گے تو کون سی قیامت آجائے گی۔ روز روز تو قاہرہ آنے کا موقع نہیں ملتا۔"

"مگر جائیں گے کہاں؟"

"رات کے وقت تو نائٹ لائف ہی دیکھی جاسکتی ہے۔ سڑکوں پر گھومیں گے۔ دریائے نیل کا نظارہ کریں گے ۔ کافی خانوں میں جائیں گے۔ فٹ پاتھوں پر مٹر گشت کریں گے۔ جی چاہا تو کسی نائٹ کلب میں بھی چلے جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے ۔" خان صاحب خوش ہو کر بولے۔ "آپ کا مطلب ہے قاہرہ کے ماڈرن علاقوں میں جائیں گے؟ وہاں تو انگریز بھی ہوں گے۔"

ہم نے کہا۔" آپ یہاں انگریزوں سے ملنے کیلئے آئے ہیں یا قاہرہ اور مصر کا کلچر دیکھنے آئے ہیں؟ انگریزوں کو دیکھنے کا شوق تھا تو لندن میں ان کی کیا کمی تھی؟"

خاں صاحب شرمندہ سے ہوگئے مگر پھر بھی کہنے لگے "سچی بات یہ ہے کہ گوروں اور گوریوں کے بغیر رونق نہیں ہوتی۔ مشکل یہ ہے کہ اپنے ملک میں تو اب یہ لوگ تبرک کے طور پر بھی نہیں ملتے۔"

بٹ صاحب ان کی غلامانہ ذہنیت پر ماتم کرتے رہے۔

السید راجندر ناتھ ہمیں لے کر باہر نکلے۔ سب سے پہلی ٹیکسی کو دیکھتے ہی بٹ صاحب نے بے تابی سے ہاتھ ہلانا شروع کردیا۔

راجندر نے کہا۔"اس طرح ہاتھ نہ ہلایا کریں یہاں کے ٹیکسی ڈرائیور اسے اچھا نہیں سمجھتے۔"

"تو پھر ٹیکسی کو بلانے کا کیا طریقہ ہے؟ منہ میں انگلیاں ڈال کر سیٹی بجائیں؟"

" جی نہیں صرف ہاتھ بلند کردیں۔وہ خود رک جائے گا۔"

ٹیکسی والا ہمارے سامنے آکر رک گیا۔" اہلا" وسہلا"" اس نے بڑے خلوص سے کہا۔ ہمارا حلیہ اور شکل وصورت دیکھ کر وہ ہمیں مسلمان ہی سمجھا تھا اور ٹھیک ہی سمجھا تھا ' ہم تینوں مسلمان تھے۔ الحمد اللہ ' چوتھے راجندر ناتھ کو مصریوں نے پہلے ہی "سید" کا خطاب دے دیا تھا۔

ٹیکسی ڈرائیور خاصا گورا چٹا تھا۔ انگریزی سے بھی واقف تھا۔ بعد میں معلوم

ہوا کہ لبنانی ہے۔

خان صاحب نے پوچھا۔ "اتنا خوبصورت ملک چھوڑ کر یہاں کیوں آگئے ؟"

کہا" آپ شاید اخبارات نہیں پڑھتے۔ وہاں کے حالات ایسے ہیں کہ لبنان اب پہلے والا لبنان نہیں رہ گیا' جب حالات ٹھیک ہوں گے تو واپس چلا جاؤں گا۔"

بٹ صاحب نے ہمارے کان میں کہا۔" اس کا نام تو پوچھو۔"

ہم نے کہا۔" بھئی یہ عورت نہیں مرد ہے اور آپ کے مسلک میں محض خواتین کا نام پوچھنا جائز ہے۔ دوسرے یہ کہ اتنی انگریزی تو اب آپ کو بھی آگئی ہے۔ خود ہی نام کیوں نہیں پوچھ لیتے۔"

بولے۔ " اس لئے کہ آپ ہمارے ترجمان ہیں۔ آپ کے ہوتے ہوئے ہمارا سوالات کرنا اچھا نہیں لگتا۔"

ٹیکسی میں بیٹھتے ہی سید راجندر نے فرمایا ۔"میدان تحریر چلو۔"

بٹ صاحب نے فورا" منہ بنالیا۔ کہنے لگے۔ یہ کون سا وقت ہے میدان تحریر جانے کا۔ مجھے رائٹرز اور شاعروں سے ملنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔"

راجندر نے بتایا کہ میدان تحریر قاہرہ کا مشہور چوک ہے ۔ بہت رونق ہوتی ہے وہاں پر۔"

" مگر اس کا نام میدان تحریر کیوں ہے؟"

"دراصل یہ لبریشن اسکوائر کا ترجمہ ہے۔ مصری انگریزی کے الفاظ بہت کم استعمال کرتے ہیں۔ ہوٹل کو بھی فندق کہتے ہیں یا انگریزوں پر مہربان ہوں گے تو ہوتیل کہہ دیں گے۔"

ہم ایک آہ بھر کر خاموش ہوگئے۔ ساری دنیا میں شاید ہم ہی ایک قوم ہیں جو اپنی زبان کو استعمال کرتے ہوئے شرماتے ہیں۔

میدان تحریر پہنچ کر ٹیکسی نے ہمیں ایک جگہ اتار دیا۔ راجندر نے ہمارے جیب میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے کرایہ نکال کر دے دیا۔ آخر مشرقی تہذیب بھی کوئی چیز ہے۔ خان صاحب نے بہت روکا بلکہ ٹیکسی ڈرائیور کے ہاتھ سے نوٹ لے کر راجندر کے حوالے کردیا جو اس نے واپس لینے سے انکار کردیا۔ چنانچہ وہی تکلف والی تکرار شروع ہوگئی جو کہ ہمارے ہاں عام طور پر دیکھنے میں آتی ہے۔ غریب ٹیکسی ڈرائیور حیران پریشان یہ تماشہ دیکھ رہاتھا۔ اسے شاید اپنے کرائے کی فکر پڑ گئی تھی کہ ان لوگوں کے جھگڑے میں کہیں اس کا کرایہ ہی نہ مارا جائے۔

راجندر نے کہا "دیکھئے صاحب' دعوت میں نے آپ کو دی تھی۔ اس لئے بل بھی میں ہی دوں گا۔" خان صاحب نے ہار مان لی اور راجندر کانوٹ ٹیکسی ڈرائیور کے حوالے کردیا۔ اس کی حیرانی کو دیکھ کر ہم نے اسے بتایا کہ دراصل یہ ہماری تہذیب کا حصہ ہے۔

"چھینا جھپٹی اور لڑائی جھگڑا آپ کی تہذیب کا حصہ ہے؟" اس نے حیران ہوکر پوچھا۔

" نہیں نہیں' بات یہ ہے کہ جو شخص میزبان ہوتا ہے' وہی بل ادا کرتا ہے۔ بس اتنی سی بات ہے۔"

خدا جانے سمجھایا نہ سمجھا مگر سرہلاتا رہا۔ بٹ صاحب نے موقع غنیمت جان کر اس سے نام بھی پوچھ لیا۔

"میرانام حریق النبی ہے مگر آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

ہم نے کہا۔"دراصل انہیں لوگوں کے نام جمع کرنے کا شوق ہے۔ کسی بھی ملک میں جن لوگوں سے ملتے ہیں ان کے نام ضرور دریافت کرتے ہیں جس طرح لوگ ڈاک کے ٹکٹ جمع کرتے ہیں' اسی طرح یہ لوگوں کے نام اکٹھے کرتے ہیں۔"

"اچھا مگر ان ناموں کا کریں گے کیا؟"

"ایک ڈکشنری ترتیب دیں گے۔ ہمارے ملک میں ایسی کتابیں بہت مقبول ہوتی ہیں۔"

وہ مزید حیران ہوگیا۔ بٹ صاحب نے بڑی گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور کہا" تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔"

اس نے بھی " اہلا "وسہلا" وغیرہ کہہ کر خوشی کا اظہار کیا۔

"آپ بھی مسلمان ہیں؟" بٹ صاحب نے ٹیکسی سے اترتے ہوئے پوچھا۔

بولا"جی نہیں میں بیروتی عیسائی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ تو رخصت ہوگیا مگر ہم

لوگوں کو ورطۂ حیرت میں مبتلا کر گیا۔ نام حریق النبی او مذہباً" عیسائی؟" "بھئی کمال ہو گیا!"

میدان تحریر روشنیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ اسے چوک یا چوراہا کہنا درست نہیں تھا۔ یہ تو کئی چوکوں کا مجموعہ تھا۔ ویسے کہنے کو ایک بہت کشادہ چوک تھا مگر یہاں سے دس ہزار سڑکیں مختلف سمتوں میں جاتی ہیں اور ٹریفک کا وہ اژدہام کہ توبہ توبہ۔ فٹ پاتھوں پر بھی بقول خان صاحب کھوے سے کھوا اچھلتا ہے۔ خان صاحب بہت خوش تھے۔ اس لئے کہ انگریز کافی تعداد میں نظر آرہے تھے۔ مرد کیمرے گلوں میں لٹکائے ہوئے پھر رہے تھے۔ خواتین بنی ٹھنی' سولہ سنگھار کیے اٹھلاتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ مصریوں کی عباؤں اور ڈھیلے ڈھالے ٹخنوں تک کے جبوں کے درمیان مغربی لباس نے عجیب سا ماحول پیدا کردیا تھا۔ مغرب زدہ مصری مرد و خواتین بھی بہت بڑی تعداد میں نظر آرہے تھے۔ شاپنگ کیلئے دکانیں بھی موجود تھیں مگر زیادہ تر لوگوں کا رجحان سیرو تفریح کی طرف تھا یا پھر ونڈو شاپنگ کررہے تھے۔

خان صاحب نے پوچھا۔" یہ دکاندار اپنا خرچہ کیسے پورا کرتے ہوں گے؟"

"کیوں؟"

"بھئی شاپنگ تو برائے نام ہی لوگ کرتے ہیں۔ باقی تو ونڈو شاپنگ ہی کرتے رہتے ہیں۔ ان بے چاروں کا گزارہ کیسے ہوتا ہوگا؟"

"فکر نہ کریں۔ یہ برائے نام شاپنگ کرنے والوں سے ہی اتنا وصول کرلیتے ہیں کہ منافع میں رہتے ہیں۔"

دکانداروں پر ترس کھاتے ہوئے ہم لوگوں نے بھی کچھ شاپنگ کرنے کا ارادہ کیا۔ ایک بڑے سے اسٹور میں داخل ہوتے ہی ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیا گیا۔ یہ ایک جدید فیشن ایبل اسٹور تھا اس لئے ظاہر ہے کہ سیل گرلز بھی موجود تھیں اور کافی تعداد میں تھیں۔ اچھی شکل وصورت کی خواتین بھی نظر آئیں۔ اخلاق اور شائستگی بھی کم نہ تھی مگر مشکل یہ تھی کہ ایک ایک گاہک کے لئے دو دو تین تین سیل گرلز موجود تھیں۔ ہم نے قاہرہ میں دیکھا کہ ہر کام کیلئے ضرورت سے زیادہ لوگ موجود ہوتے ہیں۔ ائرپورٹ پر بھی درجنوں لوڈر تھے۔ ہم تو مغربی ملکوں کے عادی ہوگئے تھے۔ یہاں سامان خود ہی اٹھانا پڑتا ہے مگر قاہرہ ائرپورٹ پر لوڈروں کی افراط تھی۔ ہم نے بھی خوب

عیاشی کی۔ تینوں نے تین لوڈروں کی خدمات حاصل کرلیں۔ دوسرے اسٹاف کی بھی کثرت تھی۔ ایک تو تھے کام کرنے پر مامور لوگ پھر ان کی نگرانی پر بھی کچھ لوگ مامور تھے۔ شاید ان کے اوپر بھی لوگ ہوں گے۔ یہ خالص مشرقی انداز ہمیں بہت پسند آیا۔ ہمارے ملک میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ یعنی کام کم اور کام کرنے والے زیادہ۔

اسٹور میں بھی یہی عالم تھا۔ خاں صاحب تو راجہ اندر بنے ہوئے تھے۔ اشیاء دکھانے کیلئے کئی لڑکیاں موجود تھیں جن میں سے ہرایک آپ کو کچھ نہ کچھ خریدنے پر مجبور کررہی تھی۔ اگر آپ نے غلطی سے کچھ خریدلیا تو دوسری لڑکیاں اور بہت ساسامان دکھانے لگیں کہ یہ بھی ملاحظہ کیجئے۔ بڑے اسٹوروں میں قیمتیں مقرر ہوتی ہیں مگر بھاؤ تاؤ کا یہاں بھی دستور ہے۔ مغرب والے تو بے وقوف بن کر مقررہ قیمت ادا کردیتے ہوں گے مگر ہم مشرق والے بھلا کہاں قابو میں آتے ہیں۔

مثلاً ایک قمیص کی قیمت لڑکی نے سات پونڈ بتائی تو خاں صاحب نے دو پونڈ لگائی۔

"یار کچھ تو شرم کرو۔ یہ لڑکی کیا سوچے گی؟" بٹ صاحب نے کہا۔

"یہی سوچے گی کہ خریدار بہت ہوشیار ہے۔"

کچھ دیر بعد اندازہ ہوا کہ خاں صاحب واقعی حق بجانب تھے راجندر ناتھ بھی بہت پشیمان سا نظر آرہا تھا۔ وہ غریب کافی دنوں سے منہ مانگی قیمت ادا کرتا رہا تھا۔ اب اسے عقل آئی مگر کافی دیر بعد۔ خاں صاحب اس سے زیادہ ہوشیار سمجھ دار نکلے۔

سامان تو اسٹور سے ہم لوگو نے برائے نام ہی خریدا مگر سامان دیکھنے میں کافی وقت گزارا۔ اسٹور کی سجاوٹ مغربی ملکوں کے اسٹور جیسی ہی تھی۔ سیل گرلز بھی مغربی پوشاک میں تھیں۔ صفائی اور سجاوٹ کے علاوہ خوشبوؤں کی بھی کمی نہ تھی۔ خاں صاحب کو یہ اسٹور بہت پسند آیا۔ سید راجندر سے دریافت کیا کہ کیا یہاں ایسے اور بھی اسٹور ہیں؟

"بہت۔"

"پھر تو انہیں دیکھنے میں کافی وقت لگے گا۔ اللہ نے توفیق دی تو پھر بھی

انہیں دیکھنے کے لئے وقت نکالیں گے۔"

"بھائی آپ قاہرہ میں اسٹور دیکھنے آئے ہیں یا تاریخی یادگاریں اور اہرام؟ اگر اسٹور ہی دیکھنے تھے تو ان کی لندن میں بھی کوئی کمی نہیں تھی۔"

بولے۔" ہر ملک اور شہر کے اسٹور الگ ہوتے ہیں۔ ماحول الگ ہوتا ہے۔ خریداری کا انداز الگ ہوتا ہے۔لندن کے اسٹوروں میں آپ قیمت کم کراسکتے ہیں اور پھر یہاں تو سیل گرلز شہد کی مکھیوں کی طرح آپ کے پاس منڈلاتی رہتی ہیں۔ وہاں کی نک چڑھی سیل گرلز تو پاس بھی نہیں پھٹکتیں۔"

بٹ صاحب بحث شروع کرنے کا ارادہ کررہے تھے مگر ہم نے انہیں روک دیا پھر بھی وہ اظہار افسوس کیے بغیر نہ رہ سکے۔"اہرام مصر' تاریخی عمارتیں' عجائب گھر' سڑکیں' بازار' محلات کیا کچھ ابھی دیکھنے کو باقی ہے اور یہ اسٹوروں کو دیکھنے کیلئے مرے جارہے ہیں۔"

کہنے لگے ۔"دیکھو بھائی ۔ قاہرہ تو ہم فلموں اور تصویروں میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ کتابوں میں بھی بہت کچھ لکھا ہوا ہے مگر اسٹور کا مزہ تو تب ہی آتا ہے جب آپ خود وہاں جائیں۔"

ان کا بس چلتا تو وہ کچھ دیر اور وہاں رہتے مگر ہم لوگوں نے باہر کارخ کیا۔ وہ بہت معذرت خواہانہ انداز میں سیل گرلز سے رخصت ہوئے۔ وہ بھی کافی دور تک "اہلا "وسہلا"" کہتی ہوئی ان کے ساتھ ساتھ آئیں۔ ایسے قدردان گاہک انہیں بھی شاید روز روز نہیں ملتے ہوں گے۔

قاہرہ میں غزہ کا علاقہ نہایت خوبصورت' جدید اور قابل دید ہے لیکن میدان تحریر کو اگر قاہرہ کا دل کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ بڑی بڑی خوبصورت عمارتیں' ہوٹل ریستوران ' اسٹور' کافی ہاؤس' قہوہ خانے ' تفریح گاہیں' سبھی کچھ تو یہاں موجود ہے۔ انسانوں کی موجیں مارتا ہوا سمندر ہے جسے دیکھ کر جی خوش ہوجاتا ہے اور احساس ہوتا ہے کہ ہم کسی بڑے اور جدید شہر میں آئے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ اگر آپ پیدل گھومیں تو راستہ بھولنے کے امکانات بہت زیادہ ہیں۔ سبھی عمارتیں ایک جیسی اور تمام سڑکیں یکساں نظر آتی ہیں۔ قاہرہ میں راستہ پوچھنا بھی ایک حماقت اور وقت کا زیاں ہے۔ اول تو کوئی آپ کی بات ہی نہیں سمجھے گا اگر تھوڑی بہت انگریزی جانتا بھی ہے تو فوراً" صاف انکار میں سرہلا دے گا۔ یہ بھی نہیں کہ اخلاقاً" غلط پتا ہی بتا دے۔ پوچھیں تو کس سے پوچھیں۔ ایسے موقعوں پر ٹیکسی والے ہی کام آتے ہیں مگر وہ بھی اس وقت جب آپ ان کی ٹیکسی میں سوار ہوجائیں۔ قاہرہ کے ٹیکسی والے خاصے چالاک ہوتے ہیں۔ آپ جس جگہ جانا چاہتے ہیں وہ خواہ دو فرلانگ کے فاصلے پر ہی کیوں نہ ہو ٹیکسی والا آپ کو ہرگز نہیں بتائے گا۔ جب آپ ٹیکسی میں سوار ہوجائیں گے تو دو منٹ کے بعد آپ کو منزل کے سامنے پہنچا دے گا اور معقول کرایہ طلب کرے گا۔ یہ شاید ہم نے آپ کو نہیں بتایا کہ بخشش کا یہاں کافی رواج ہے۔ جب تک آپ بخشش نہیں دیں گے' کیا مجال جو وہ صاحب یا صاحبہ آپ کی جان چھوڑ دیں۔ بخشش تو بخشش ہوتی ہے ۔ چاہے جو دے دیں مگر قاہرہ کے لوگ اس بات کے قائل نہیں ہیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ بخشش کے قائل ہیں۔ اگر آپ نے انہیں کوئی بڑا نوٹ دے دیا تو وہ اسے بھی بخشش سمجھ کر بقایا واپس کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ "اہلا "و سہلا "مرحبا" کہتے ہوئے رخصت ہوجاتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ آپ ان کو آواز دے کر روکنے یا زبردستی ان سے رقم وصول کرنے سے تو رہے۔

قاہرہ میں جمہور کے حوالے سے دو چیزیں قابل ذکر ہیں۔ ایک تو میدان التحریر یا جمہوریہ چوک اور دوسری شارع جمہوریہ۔ یہ بڑی خوبصورت سڑک ہے۔ پہلے اس کا نام شارع عابدین تھا۔ اس لئے کہ شاہی رہائش گاہ' قصر عابدین بھی اسی سڑک پر واقع تھی۔ مصر کے آخری حکمران شاہ فاروق اس محل میں رہا کرتے تھے۔ یوں تو اور بھی کئی محل تھے جن میں ان کی والدہ ملکہ نازلی' شہزادیاں اور شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والے دوسرے لوگ رہا کرتے تھے لیکن قصر عابدین بادشاہ کی سرکاری رہائش گاہ تھی ۔ انقلاب کے بعد قصر عابدین کو ایک ایک عجائب گھر میں تبدیل کردیا گیا ہے اور لوگ بے خوف وخطر (لیکن داخلہ فیس ادا کرنے کے بعد) اس قصر شاہی میں گھومتے پھرتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ ان کا بادشاہ کس شان وشوکت اور طمطراق سے رہا

کرتا تھا۔

شاہ فاروق کے بارے میں بھی بہت سی داستانیں اور کہانیاں مشہور ہیں۔ ہر حکمران وقت کی طرح شاہ فاروق کو بھی یہ خوش فہمی تھی کہ وہ اپنے ملک کے مقبول ترین تاجدار ہیں اور عوام ان کے شیدائی ہیں۔ مصریوں کی اپنے آخری بادشاہ کے بارے میں کچھ زیادہ اچھی رائے نہیں ہے۔ وہ نازونعم میں پلا ہوا ایک بادشادہ زادہ تھا جو اقتدار اور دولت کے ساتھ ساتھ جوانی کے نشے میں بھی چور تھا۔ بہت سے مصری شاہ فاروق کو زیادہ قصور وار نہیں ٹھہراتے ہیں۔ ہمارے دوست اور راہبر ابوالقاسم کی بھی یہی رائے تھی۔

شاہ فاروق نے جب مصر کا تاج وتخت سنبھالا تھا اسوقت ان کی عمر صرف سترہ سال تھی۔ شاہی خاندانوں کے دستور کے مطابق فاروق کیلئے بھی بہترین استادوں کا اہتمام کیا گیا تھا مگر شہزادے کو تعلیم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی پھر برطانوی حکومت نے اسے انگلستان میں تعلیم اور فوجی تربیت دینے کا بندوبست کیا مگر یہ کوششیں بھی فاروق کا کچھ نہ بگاڑ سکیں۔ وہ ایک متلون مزاج ' پارہ صفت' رنگین مزاج ' غیر ذمے دار' ضدی ' کھلنڈرا اور عیش وطرب کا دلدادہ نوجوان تھا۔ سترہ سال کی عمر میں ' حکمرانی ملی تو رہی سہی کسر بھی پوری ہوگئی ۔ خوشامدیوں اور حاجت مندوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ملکہ نازلی کو ناز تھا کہ وہ ملکہ ہیں اور فاروق کی نگرانی کریں گی مگر ان کا طریقہ بھی درست نہ تھا۔ دوسرے انہیں خود بھی امور مملکت اور سیاست سے آگاہی نہ تھی۔ فاروق ایک بگڑا ہوا شہزادہ تھا۔ ملکہ کی بے جا پابندیوں نے اسے اور بھی ضدی اور خود سر بنادیا تھا۔ اسے معقول لوگوں اور اچھی صحبت سے گھبراہٹ ہوتی تھی۔ مصریوں کے مقابلے میں وہ غیر ملکیوں خصوصاً" اہل مغرب کو زیادہ پسند کرتا تھا ۔ اس کے ذاتی ملازم جن کا تعلق اٹلی اور فرانس سے تھا اس کے مشیر خاص تھے۔ وہی اس کیلئے عیاشی کا سامان بھی فراہم کرتے تھے۔ اور شاہ فاروق کو ان پر مکمل اعتماد تھا۔اسے سنجیدہ معاملات سے بھی کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ہر دم عیش وطرب میں مصروف رہنا چاہتا تھا اور اس مقصد کیلئے اس کے غیر ملکی ملازمین ہی اس کیلئے سب سے زیادہ کار آمد اور قابل اعتماد تھے۔ یہ تاریخ کا ایک نازک دور تھا جب فرانس اور انگلستان مشرق وسطیٰ کی سیاست پر تسلط حاصل کرنے کی دوڑ میں مصروف تھے۔ مصر کو اس علاقے میں مرکزی حیثیت حاصل تھی اور اسی لئے مغربی طاقتوں کی اس پر نظر کرم کچھ زیادہ ہی تھی۔ ایسے نازک مرحلے میں شاہ فاروق جیسا رنگین مزاج پلے بوائے مصر کا حکمران تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ نہ صرف مصر بلکہ تمام مشرق وسطیٰ کی سیاست کا رخ تبدیل ہوگیا اور مغربی طاقتیں اسرائیل کا پودا لگانے میں کامیاب ہوگئیں۔ شاہ فاروق کو اچھی صحبت کی طرح اعلیٰ معیاری چیزوں سے بھی الرجی تھی۔ گھٹیا درجے کی عورتیں ہی اسے پسند آتی تھیں۔ خصوصاً" موٹاپے کی طرف مائل عورتیں تو اس کی کمزوری تھیں۔

وہ کھلے عام ان کے پیچھے بھاگا پھرتا تھا اور جب چاہتا تھا نائٹ کلب یا جواء خانوں میں بلا تکلف پہنچ جاتا تھا ۔ کئی بار اپنی دل پھینک طبیعت کی وجہ سے بعض غیر ملکی سفیروں کی بیگمات کے ہاتھوں اس نے رسوائی بھی اٹھائی مگر ان باتوں کو وہ خاطر میں نہیں لاتا تھا ۔ تاریخ نے اس کے خلاف فیصلہ سنادیا اور وہ جلاوطن ہو کر روم پہنچ گیا مگر اس نے تاریخ سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا اور ایک تیسرے درجے کے کلب میں ایک تیسرے درجے کی محبوبہ کے بازوؤں میں دم توڑ دیا ۔ اب فاروق کا ذکر صرف کتابوں کے صفحات تک محدود ہے۔ خود اپنے ملک میں کوئی اسے یاد نہیں کرتا' نہ ہی اس کے حق میں کلمہ خیر کہتا ہے۔ کسی زمانے میں مصر میں اسکے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا ۔ آج وہاں کوئی اس کا نام لیوا نہیں ہے۔

قاہرہ جانے کا اصل مقصد اہرام مصر دیکھنا ہوتا ہے' چنانچہ رات کو جب ہوٹل واپس پہنچے تو یہ فیصلہ ہوچکا تھا کہ اگلے دن اہرام مصر دیکھنے جائیں گے۔ اہرام پر یہ لطیفہ یاد آیا کہ ایک صاحب نے جب اہرام مصر کی بہت زیادہ تعریفیں سنیں تو بولے کہ بھئی اہرام مصر میں کیا خاص بات ہے۔ حرم تو ہر بادشاہ کا ہوا کرتا تھا ۔ مصر والوں نے کون سا تیر مار لیا۔

اہرام دراصل ہرم کی جمع ہے۔ یہ فراعنہ کے زمانے کی یادگاریں ہیں۔ انہیں آپ مقبرہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ ہر بادشاہ جب مرتا تھا تو اسے ہرم میں دفن کردیا

جاتاتھا۔ اس کا تاج اوردوسرے قیمتی جواہرات بھی اس کے ساتھ ہی تابوت میں رکھ دیئے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ بعض فرعونوں کی توچہیتی ملکہ کو بھی ساتھ ہی دفن کردیاجاتاتھا۔ اس طرح ایک کے بعد ایک ہرم بنتا رہا اور سینکڑوں کی تعداد میں اہرام بن گئے۔ یہ اہرام شہر کی حدود سے دور ریگستانوں اور صحراؤں میں بنائے جاتے تھے۔ فرعونوں کے جاہ وجلال اور شان وشوکت کا کیا کہنا۔ وہ اپنے آپ کو خدا سمجھتے اور کہتے تھی ۔ آج بھی کوئی انسان تکبر اور غرور کا اظہار کرے تو اسے فرعون کہا جاتا ہے تو ذرا سوچئے اصل فرعون کیا چیز ہوں گے؟ یہ ایک ایک کرکے مرتے جاتے تھے مگر اس کے باوجود خدائی کا دعوی کرنے سے باز نہ آتے تھے ۔ یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی کہ اگر وہ خدا ہیں اور لازوال ہیں تو پھر موت انہیں کیوں آجاتی ہے اور وہ عام انسانوں کی طرح پیوند زمین کیوں ہوجاتے ہیں؟

ہر فرعون اپنا ہرم علیحدہ تعمیر کراتا تھا ۔ اس کا جانشین اپنا ہرم الگ بناتاتھا۔ اس طرح ہرفرعون ڈیڑھ اینٹ کی مسجد کی طرح اپنا الگ الگ مقبرہ یاہرم بناتا رہا لیکن اہرام مصر کی تعداد فرعونوں کی تعداد سے بھی زیادہ ہے۔ یہ سینکڑوں کی تعداد میں صحرا کے سینے پر پھیلے ہوئے ہیں۔ بہت سے زمین کے باہر ہیں۔ بہت سے ابھی زیر زمین دفن ہیں اور خدا جانے کب کھود کر نکالے جائیں گے۔ مقبرہ زمین کے اندر ہوتاتھا' اس کی نشانی زمین کے باہر نظر آتی تھی۔اہرام کی عمارتوں کو آپ لوح مزار بھی کہہ سکتے ہیں۔ فرعون کیونکہ لازوال حیثیت حاصل کرنا چاہتے تھے اس لئے مرنے کے بعد اپنی لاش کو ممی کی صورت میں محفوظ کرلیا کرتے تھے۔ خدا جانے وہ کون سا مسالہ ان کے کیمیادانوں نے دریافت کیاتھا جس کے استعمال کے بعد ان کے جسم سالہاسال بلکہ صدیوں تک کیلئے محفوظ کرلئے جاتے تھے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ زمین کے اوپر تو عمارت ثابت وسالم نظر آیا کرتی تھی مگرچور ڈاکو اس زمانے میں بھی بہت چالاک اور ترقی یافتہ تھے۔ وہ صحرا کے اندر سرنگ کھود کر یا نقب لگاکر اصل تابوت تک پہنچ جاتے تھے۔ لاشوں اور ممیوں کو اٹھا کرلے جاتے تھے ۔ اور تحسربود کر دیتے تھے' مال ودولت اور زر وجواہر اپنے استعمال میں لاتے تھے۔ صدیاں گزر جانے کے بعد جب مغربی

ماہرین آثار قدیمہ نے اہرام کی کھدائی کی اور زیر زمین لاش اور تابوت تک رسائی حاصل کی تو انہوں نے اسے خالی پایا۔ تب دنیا کو معلوم ہوا کہ اپنے زمانے کے خداؤں یعنی فرعونوں کی لاشوں کے تابوتوں اور ممیوں کے ساتھ چوروں نے کیا سلوک روا رکھا ہے۔ ان مقبروں کے اندر جانے کیلئے آج جو راستے موجود ہیں ان میں سے کچھ توبادشاہوں نے خود تعمیر کرائے تھے مگر بہت سے ایسے بھی ہیں جو چوروں نے کھود کربنائے تھے۔

اہرام تو بہت ہیں لیکن ان میں سب سے اہم اور سب سے بڑا خوفو کاہرم ہے ۔ ہم نے بھی اسے دیکھا' لیکن یہ بعد کی باتیں ہیں پہلے ہماری آپ بیتی بیان ہوجائے۔

ہم رات گئے تھکے ہارے ہوٹل پہنچے تو وہاں ایک آفت ناگہانی ہماری منتظر تھی ۔ استقبالیہ پر ایک موٹے تازے مصری بزرگ تشریف فرماتھے۔ انہوں نے مصری زدہ انگریزی میں ہمیں جو تقریر دلپذیر سنائی اس کا خلاصہ یہ تھا کہ ہمیں کل صبح بوبجے تک اپنے کمرے خالی کرنے ہوں گے۔ اس ہدایت کا اطلاق سید راجندر ناتھ پر نہیں ہوتاتھا۔ وہ اس سے مستثنیٰ تھے ۔ وجہ یہ تھی کہ انہوں نے ہوٹل میں اپنے کمرے کی پہلے سے بکنگ کرائی تھی اور کافی طویل عرصے سے وہاں مقیم تھے۔

"مگر ہمارے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا جارہاہے؟" ہم نے پوچھا۔

" اس لئے کہ وہ ہمارے مستقل مہربان ہیں۔ انہیں ہم مایوس نہیں کرسکتے۔"

اس کے بعد انہوں نے نہایت سلیس عربی میں ہمیں صورت حال بتانی شروع کردی اور ہم سے معذرت کرنے لگے۔ مختصرا" یہ کہ آپ نہایت معقول لوگ ہیں۔ہمارے مہمان ہیں۔ مسلمان بھائی ہیں۔ شریف لوگ ہیں۔ ہمیں آپ سے کوئی شکایت بھی نہیں ہے مگر آپ کو کمرے خالی کرنے ہوں گے۔ آئندہ جب آپ قاہرہ آئیں گے اور ہمارے ہوٹل میں قیام فرمائیں گے تو ہم آپ کے ساتھ بھی پرانے گاہکوں جیسا ہی سلوک کریں گے وغیرہ وغیرہ۔

ہم نے مدد کے لئے السید راجندر ناتھ کی طرف دیکھا مگر وہ بھی نگاہیں چرا گئے اور بولے کہ یہ بزرگ درست ہی فرما رہے ہیں۔ آپ نے ایک تو ایڈوانس بکنگ نہیں کرائی تھی دوسرے ہوٹل میں قیام فرماتے وقت بھی یہ وضاحت نہیں کی تھی کہ آپ کو کتنے دن قیام کرنا ہے۔ گویا تکنیکی طور پر' اخلاقی طور پر اور کاروباری اصولوں کے اعتبار سے ہم غلط تھے۔ راجندر ناتھ تو یہ کہہ کر اپنے کمرے میں چلے گئے مگر جانے سے پہلے ہمیں بہت تسلیاں دیتے گئے کہ فکر نہ کریں آپ کو اچھا سا ہوٹل مل ہی جائے گا اور میں شام کے وقت وہاں آکر آپ سے ملاقات بھی کرلیا کروں گا۔

"یار یہ تو نہایت غلط آدمی ہے۔" خاں صاحب نے کہا۔

"آخر اپنی اصلیت دکھاہی دی نا۔" بٹ صاحب نے دانت پیس کر کہا۔"یہ ہندو کبھی ہمارے دوست اور ہمدرد نہیں ہوسکتے۔"

ہم نے کہا۔"بھائی اس غریب کو کیوں رگید رہے ہو۔ آخر اس کا قصور کیا ہے؟"

بولے۔" اسے چاہئے تھا کہ ہماری خاطر جھگڑا کرتا اور خود بھی ہوٹل چھوڑ دیتا۔"

ہم نے کہا۔" وہ کوئی پاگل تو نہیں ہے جو ایسا کرتا۔"

بولے۔" اگر ہم اس کی جگہ ہوتے تو ایسا ہی کرتے۔"

" اب جبکہ آپ اس کی جگہ نہیں ہیں تو پھر سوچئے کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے؟"

خاں صاحب نے ایک سرد آہ بھری اور آس پاس کے ماحول کا جائزہ لیا۔ استقبالیہ کے اردگرد جو موٹی اور صحت مند خواتین نظر آرہی تھیں انہیں بڑی حسرت سے دیکھا اور پھر بولے۔"ایسا ماحول اور پھر اتنے کم کرائے میں اور کہاں ملے گا؟"

ہم نے کہا۔"خاں صاحب ذرا ہوش کے ناخن لیجئے۔ محض چند موٹی تازی لڑکیوں کو چند لمحے دیکھنے کی خاطر آپ جس ہوٹل کے گن گارہے ہیں۔ آپ اپنی ذہنیت تبدیل کرلیں۔"

بٹ صاحب نے فوراً" فقرہ مکمل کردیا۔"اپنی اوقات نہ بھولیں۔ اب آپ کو واپس پاکستان جانا ہے۔ چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔ ساری رنگین مزاجی ناک کے راستے نکل جائے گی۔"

ہم اپنے کمروں میں واپس چلے گئے مگر واقعی فکر مند تھے کہ آخر جائیں گے کہاں" خاں صاحب کو پریشانی کے عالم میں نیند بہت آتی ہے اس لئے وہ تو منہ لپیٹ کر سوگئے۔ بٹ صاحب اور ہم فکر میں غلطاں بیٹھے رہے پھر بٹ صاحب نے بھی " اللہ مالک ہے" کہہ کر اپنے کمرے کا رخ کیا۔ ہم نے سوچا کہ واقعی جب اللہ ہی مالک ہے تو ہمیں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ اس لئے ہم بھی آرام سے سوگئے۔

صبح کا ناشتہ کرنے کے بعد ہم نے اپنا سامان استقبالیہ پر پہنچا دیا اور لاؤنج کے صوفوں پر بیٹھ کر یہ غور کرنے لگے کہ فرعونوں کے اس ملک میں اب ہم سر چھپانے کہاں جائیں گے؟

خاں صاحب نے موقعے سے فائدہ اٹھاکر استقبالیہ پر موجود سب سے دبلی پتلی اور خوبصورت لڑکی سے بات چیت شروع کردی۔ کافی دیر تک یہ گفتگو جاری رہی جس کے بعد وہ بہت شاداں وفرحاں ہمارے پاس واپس آئے اور اطلاع دی کہ ہوٹل کا بندوبست ہوگیا ہے۔

" اچھاواقعی کہاں؟"

"شارع قصر النیل پر ایک محل تھا جسے اب ہوٹل بنادیا گیا ہے۔ شاید اس کانام سوائے ہوٹل ہے ۔نہایت شاندار اور آرام دہ ہوٹل ہے ۔ قاہرہ کے بہترین ہوٹلوں میں اس کا شمار ہوتا ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس ہوٹل میں آپ عام لباس پہن کر داخل نہیں ہوسکتے۔ شام کا یارسمی لباس پہننا ضروری ہوتا ہے۔"

بٹ صاحب بولے۔" اور شاید رات کو سلیپنگ سوٹ پہنے بغیر سونے کی اجازت نہیں ہے!"

"ہاں ظاہر ہے بڑا شاندار ہوٹل ہے کوئی معمولی بات تو نہیں ہے۔"

"تو کیاہوٹل کا سٹاف رات کے وقت کمروں میں جاکر چیک کرتا رہتا ہے کہ کس کس نے سلیپنگ سوٹ پہنا ہے؟"

"ارے نہیں ۔ بھائی تمہاری سمجھ میں تو کچھ آتا ہی نہیں ہے۔ بس ایک اصول بنا ہوا ہے۔ سب اس کی پابندی کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی معمولی ایرا غیرا قسم کا آدمی تو اس کے اندر قدم نہیں رکھ سکتا۔"

"تو پھر تم وہاں کیسے جاؤ گے؟" بٹ صاحب نے پوچھا۔

بولے۔"بیکار باتوں میں وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بھئی مجھے تو یہ ہوٹل بہت پسند آیا ہے۔ آخر ہم قلوپطرہ کے ملک میں آئے ہیں۔ فرعونوں کی سرزمین پر گھوم رہے ہیں۔ ذرا ٹھاٹ سے رہنا چاہیئے۔"

ہم نے کہا۔" وہ تو ٹھیک ہے مگر سب سے اہم بات تو آپ نے بتائی ہی نہیں۔"

" وہ کیا؟"

" وہ یہ کہ کرایہ کیا ہے؟"

کہنے لگے۔ "افوہ ۔ دیکھو یہ پوچھنا تو یاد ہی نہیں رہا۔ میں ابھی پوچھ کر آتا ہوں۔"

وہ فوراً لپک کر اسی خاتون کے پاس چلے گئے مگر دو منٹ بعد ہی منہ لٹکا کر چلے آئے۔

"کیوں بھئی کیا ہوا؟"

"بھئی کرایہ ذرا زیادہ ہے۔ ایک سنگل کمرے کا ایک دن کا کرایہ ایک سو دس ڈالر ہے۔"

"تو پھر کیا ہوا۔" ہم نے کہا۔"فرعونوں کی سرزمین پر ٹھاٹ سے رہیں گے۔ قلوپطرہ کی روح کے سامنے شرمندگی نہیں ہو۔"

"تو پھر کرائے کی رقم بھی قلوہ پطرہ کی روح سے ادھار مانگ لیجئے یا پھر کسی عجائب گھر سے نقب لگاکر تھوڑے سے نوادرات چرالیجئے۔ چند روز کا خرچہ تو نکل ہی آئے گا۔" یہ بٹ صاحب تھے۔

خاں صاحب سوچ میں پڑ گئے اور حساب لگانے لگے کہ اگر تین چار دن اس ہوٹل میں قیام کیا تو کتنا خرچہ ہوگا اور باقی اخراجات کیسے پورے ہوں گے۔

بٹ صاحب نے کہا۔" اس کی آپ فکر نہ کریں۔ ہم آپ کو ہوٹل والوں کے پاس گروی رکھ جائیں گے۔"

ہم نے کہا۔" دیکھیے خاں صاحب۔ یہ مانا کہ آپ کو اس لڑکی سے بات کرنے کا بہانہ چاہیئے تھا مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ واقعی حماقت کی باتیں شروع کردی جائیں۔ ہمارے پاس تو اس ہوٹل کے اخراجات کیلئے بھی رقم کی مشکل پڑی ہوئی ہے اور آپ " سوائے ہوٹل " کی خبریں سنا رہے ہیں۔ انسان کو کبھی کبھی عقل سے بھی کام لے لینا چاہیئے۔"

"بشرطیکہ انسان کے پاس عقل ہو۔" بٹ صاحب نے فقرہ مکمل کردیا۔

ہم فکر مندی میں مبتلا تھے لیکن یہ اطمینان تھا کہ دو چار گھنٹے تک ہوٹل کے لاؤنج میں بیٹھ سکتے ہیں۔ اس دوران میں کوئی ترکیب سوجھ جائے گی۔ یکایک بٹ صاحب نے نعرہ لگایا۔" وہ آگئے خواجہ صاحب!"

"کون خواجہ صاحب ۔" ہم نے حیران ہوکر پوچھا۔

"بھئی کشمیری خواجہ صاحب نہیں راستہ دکھانے والے خواجہ صاحب۔"

دیکھا تو ابوالقاسم چلے آرہے تھے۔ قاسم نے صبح سویرے آنے کا کوئی وعدہ تو نہیں کیا تھا مگر ہمیں توقع تھی کہ وہ ہمیں کہیں لے جانے کیلئے ضرور آئے گا۔

"اہلاً وسہلاً۔" پاس نے گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور باری باری ہم سب کے رخسار کو بوسہ دیا۔"کیا بات ہے سامان لے کر یہاں کیوں بیٹھے ہیں آپ لوگ؟"

ہم نے مختصر الفاظ میں تمام قصہ بیان کیا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا پھر بولا۔"دیکھئے میں کوئی بندوبست کرتا ہوں ۔ میرے ایک جاننے والے کو ہوٹلوں کے بارے میں کافی معلومات ہیں۔"

کچھ دیر ٹیلی فون پر بات کرنے کے بعد وہ بہت خوش وخرم واپس آیا۔

"لیجئے آپ کی مشکل تو آسان ہوگئی یااخی۔"

" اچھا وہ کیسے؟"

"ڈاؤن ٹاؤن میں ایک ہوٹل ہے۔ بہت اعلیٰ درجے کا تو نہیں ہے مگر ٹھیک ہی ہے اور آپ کو کون سا ہوٹل میں وقت گزارنا ہوتا ہے۔ رات کو سونے کیلئے ہی تو

ضرورت پڑتی ہے۔"

بٹ صاحب نے کہا۔"اور ہمیں یہاں کوئی جانتا بھی تو نہیں خوامخواہ شرمندگی اٹھانی پڑے۔"

ہم لوگوں نے سامان سمیٹنا شروع کیا۔ اتنی دیر میں خدمت گاروں کا دستہ وہاں پہنچ گیا۔ ہر شخص نے ایک ایک سامان اٹھالیا۔ ان کی نگرانی کیلئے بھی ایک صاحب موجود تھے جو انہیں عربی میں ہدایات دے رہے تھے۔ اس کے باوجود چند خدمت سے محروم رہ گئے تو انہوں نے ملتجیانہ نظروں سے ہمیں دیکھنا شروع کردیا۔

"یہ بخشش کی فکر میں ہیں۔" خاں صاحب نے انکشاف کیا۔

"چھوڑو یار۔ اچھے خاصے ہٹے کٹے ہیں۔ بلا کسی وجہ کے بخشش کا کیا سوال ہے۔" بٹ صاحب نے فوراً" ویٹو استعمال کر دیا۔ ان حضرات کی نظروں سے نظریں بچاتے ہوئے ہم باہر چل دیئے وہاں ایک چھوڑ دو چوکیدار تھے اور ہمیں دیکھتے ہی انہوں نے بڑی سرگرمی دکھانی شروع کردی تھی ۔ مثلاً"ٹیکسی والوں کو پکارنے لگے تھے۔ فوراً" تین ٹیکسیاں بھی آگئیں اور ہمارے کچھ کہے بغیر ہی لوڈر حضرات نے ان ٹیکسیوں میں ایک ایک سوٹ کیس رکھنا شروع کردیا۔

"یہ کیا ہورہاہے ؟" خاں صاحب چپ نہ رہ سکے۔"بھائی انہیں روکو۔"

قاسم نے فوراً" دخل در معقولات کرتے ہوئے سب کو مناسب انداز میں ڈانٹ ڈپٹ کی۔ دو ٹیکسی والوں کو رخصت کردیا۔ لوڈروں کو بھی کچھ پیاسٹر عطا کیے۔ وہ منہ بناکر مگر صبر کرکے رہ گئے ۔ اگر یہ مرحلہ ہمیں پیش آتا تو شاید یہ سب حضرات مل کر ہماری تکا بوٹی کردیتے۔

مختلف شاہراہوں اور فیشن ایبل علاقوں سے گزرتے ہوئے ہماری ٹیکسی قدرے تنگ سڑکوں تک پہنچ گئی۔ قاسم نے اطلاع دی کہ یہ "مصرالقدیمہ" ہے ۔ خیر اتنا زیادہ قدیم بھی نہیں تھا مگر جدید بھی نہیں کہاجاسکتا تھا۔ یوں سمجھ لیجئے جیسے اندرون لاہور شہر کے مقابلے میں کرشن نگر کا علاقہ ۔ خاصی بھیڑ بھاڑ اور افراتفری تھی۔ ہر قسم کی سواری سڑکوں پر رواں دواں تھی۔ماڈرن ملبوسات بھی کم نظر آئے۔ پتلون قمیص والے بھی تھے لیکن ٹخنوں تک لمبے جبہ پوش بھی کافی تعداد میں تھے یہ متوسط طبقے کا

علاقہ تھا۔ یہاں بازار بھی تھے۔ رہائشی مکانات بھی تھے اور ہوٹل بھی نظر آرہے تھے۔ ہم جس ہوٹل کے سامنے جاکر رکے اس کا نام ہمیں یاد نہیں رہا مگر اتنا وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ "فندق" تھا۔ قاسم نے ہمیں ایک کاغذ پر احتیاط" اس کانام اور پتہ عربی میں لکھ دیا تھاکہ اگر راستہ بھول جائیں تو کسی کو دکھا کر منزل پر پہنچ جائیں۔ بٹ صاحب نے اس کاغذ کو بڑی احتیاط سے تہہ در تہہ کیا یہاں تک کہ وہ تعویذ کے سائز کا ہوگیا پھر انہوں نے اسے چوما' آنکھوں سے لگایا اور بڑے احترام سے اپنے بٹوے میں رکھ لیا۔ بولے"آخر عربی ہے۔احترام تو کرنا ہی چاہئے۔"

ہم تو سمجھ رہے تھے کہ شاید کوئی سرائے نما تھرڈ کلاس ہوٹل ہوگا مگر وہ اچھا خاصا معقول ہوٹل نکلا۔ صاف ستھرا بھی تھا۔ تین منزلہ عمارت تھی۔ چھوٹا سا لاؤنج بھی تھا۔ البتہ استقبالیہ پر کوئی خاتون براجمان نظر نہیں آئیں لیکن اسٹاف میں کچھ خواتین ضرور شامل تھیں۔ جن میں سے ایک تو خاصی خوب رو تھیں۔بٹ صاحب سارے کام چھوڑ کر ہمارے پیچھے پڑ گئے "اس کانام پوچھ لو۔"

ہم نے کہا۔"بندہ خدا۔ ابھی کمرہ حاصل نہیں کیا ہے نہ ہی خاتون سے کوئی واسطہ پڑا ہے ۔ نام پوچھنے کی کیا تک ہے؟؟"

کہنے لگے۔"اچھا وعدہ کریں کہ بعد میں ضرور پوچھ لیں گے۔"

ہم نے کہا "اگر انگریزی جانتی ہوگی تو ضرور پوچھیں گے۔"

بولے ۔"نام پوچھنے کیلئے زیادہ عربی جاننا ضروری نہیں ہوتا۔ سب کو معلوم ہے کہ عربی میں نام کو اسم کہتے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ وہ جواب میں اپنا نام بتائے گی اور وہ بھی ہماری سمجھ میں آجائے گا۔"

بٹ صاحب اس فکر میں مبتلا تھے ۔ ادھر قاسم نے ہمارے لئے تین کمروں کا بندوبست کردیا تھا۔ ساتھ ہی یہ اطلاع بھی دی کہ "کمروں کے ساتھ ساتھ باتھ روم نہیں ہیں۔"

"اف خدایا پھر کیا ہوگا؟" بٹ صاحب پریشان ہوگئے۔"یہاں تک تو آس پاس کھیت وغیرہ بھی نہیں ہیں۔ ہر طرف آبادی ہی آبادی ہے۔"

" اور ہم منہ ہاتھ کہاں جاکر دھوئیں گے ؟ باورچی خانے میں۔" خاں صاحب

بھی پریشان ہوگئے۔

قاسم ہنسنے لگا۔ بولا۔ "جیبی کمروں کے ساتھ اٹیچڈ باتھ روم نہیں ہیں مگر کامن باتھ روم تو ہیں۔"

"اچھا اچھا یعنی یورپ والا حساب ہے۔" خاں صاحب بولے۔ "ہمیں تو پہلے خیال ہی نہیں آیا تھا۔"

پھر پوچھا۔ "یہاں کامن باتھ روم میں کیا کیا ہوتا ہے؟"

وہی جو ہر باتھ روم میں ہوتا ہے۔ یعنی شاور' ٹب' پانی' صابن' تولیہ وغیرہ۔"

"میرا مطلب یہ ہے کہ گرم پانی بھی ہوتا ہے؟"

"بھائی یہاں گرم پانی کی کیا ضرورت ہے۔ اس موسم میں گرم پانی سے کون نہاتا ہے؟"

"مجھے ڈاکٹر نے ہر موسم میں نیم گرم پانی سے نہانے کا مشورہ دیا ہے۔"

قاسم نے فوراً مسئلہ حل کردیا۔ "آپ آٹھ نو بجے کے قریب نہائیں گے تو پائپ میں نیم گرم پانی ہی آئے گا۔"

ایک وردی پوش خدمت گار نے ہمارا سامان اٹھایا کچھ کندوں پر لادا' کچھ ہاتھوں میں اٹھایا اور عربی بولتا ہوا ایک طرف چل پڑا۔ استقبالیہ پر ایک صاحب سوٹ پہنے بیٹھے تھے۔ مگر اس کے اوپر قبا بھی پہن رکھی تھی۔ وہ اس ہوٹل کے منیجر اور مالک وغیرہ تھے۔ انہوں نے بتایا کہ آپ لوگوں کو دوسری منزل پر بہت اچھے کمرے دیے گئے ہیں۔ دوسری منزل کا فائدہ یہ ہے کہ وہاں شور زیادہ نہیں ہوتا مگر ہم اس سہولت کے لیئے اضافی کرایہ طلب نہیں کرتے مگر تجربے سے معلوم ہوا کہ دوسری منزل پر پہلی منزل سے زیادہ شور تھا۔ اس کا سبب خاں صاحب نے یہ بتایا کہ عربی بولنے والوں کی آوازیں ادھر پھیلنے کے بجائے آسمان کی طرف جاتی ہیں۔

کمرے خاصے معقول تھے بس الماریاں وغیرہ کافی سال خوردہ تھیں۔ ہم نے ایک الماری کھولی تو اتنا شور بلند ہوا کہ ڈر کے مارے بند کردی۔

"کوئی بات نہیں ہے۔" قاسم نے تسلی دی۔ "دو تین دن کی تو بات ہے۔ اپنے کپڑے سوٹ کیسوں میں ہی رہنے دیجئے۔ الماری میں لٹکانے کی کیا ضرورت

ہے؟"

واقعی یہ شخص کافی ذہین اور سمجھ دار ثابت ہو رہا تھا۔ ہر مسئلہ چٹکی بجاتے میں حل کردیتا تھا۔ بٹ صاحب باربار کہہ رہے تھے کہ کیوں نہ ہو۔ آخر خواجہ خضر ہے۔

سوٹ کیس کمروں میں رکھ کر ہم نکل پڑے۔ باتھ روم استعمال کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی کیونکہ ہم پچھلے ہوٹل سے نہا دھوکر آئے تھے لیکن دوسرے دن جب باتھ روم سے واسطہ پڑا تو اصلیت معلوم ہوئی۔ شاور میں پانی یوں آتا تھا جیسے ہم پر احسان کررہا ہے۔ مجبوراً" پائپ سے نہائیے۔ کموڈ وغیرہ بھی خاصے بوسیدہ تھے۔ کسی کا ڈھکنا نہیں ہے تو کسی کا فلش خراب ہے۔

"یار ڈھکنے کا کیا کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ ڈھکنا ہوتا بھی تو آپ اسے اٹھاکر ہی کموڈ استعمال کرتے۔ آپ لوگوں کو تو خواہ مخواہ اعتراض کرنے کی عادت ہوگئی ہے۔ قاسم بے چارہ کیا سوچے گا۔ ایک تو ہماری مشکلیں آسان کررہا ہے اس پر آپ لوگوں کے نخرے۔"

خیر یہ بھی غنیمت تھا مگر جب ہم نے غسل کرنے کے بعد تولیہ تلاش کیا تو کہیں نظر نہ آیا۔ ہر طرف دیکھ لیا مگر کوئی آثار نہیں تھے۔ مطلب یہ کہ تولیہ رکھا ہی نہیں گیا تھا۔ تولیے کے بغیر کیسے گزارہ کرتے اور تولیہ منگانے کے لئے کس کو بلاتے۔ کچھ دیر غور کیا پھر ہم نے باتھ روم کا دروازہ کھٹ کھٹانا شروع کردیا۔ چند لمحے بعد باہر سے عربی میں کسی نے سوالات شروع کردیئے۔ ہم نے اندر سے اردو اور انگریزی بولنی شروع کردی۔ ہر طرح سے بتایا کہ بھائی ہمیں تولیہ درکار ہے مگر وہاں کون سننے والا تھا۔ کافی دیر تک یہ مذاکرہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ ہم نے محسوس کیا کہ اسی اثناء میں ہمارا جسم خشک ہوگیا۔ گویا تولیے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی تھی۔ خدا کا شکر ادا کیا اور کپڑے پہن کر باہر نکل آئے۔ وہاں دو تین حضرات جمع ہوگئے تھے اور بڑے زور شور سے عربی دانی کا مظاہرہ کررہے تھے۔ کاش ہم بھی کم ازکم حافظ ہی ہوتے تو جواب میں ان سے کچھ تو کہتے۔ ہمیں کپڑوں میں ملبوس برآمد ہوتے دیکھ کر حیران ہوکر ہمیں دیکھنے لگے۔ سمجھ میں نہیں آیا آخر مسئلہ کیا تھا اور ہم شور کیوں مچا رہے تھے۔ ہم نے قاسم

کو یہ مسئلہ بتایا تو اس نے انتظامیہ سے بات کر کے ہمیں ایک ایک تولیہ عنایت کرنے پر آمادہ کر لیا۔ تولیہ دیکھا تو سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ رومال تھا' جھاڑن تھا یا منہ پونچھنے کا تولیہ تھا۔

ہم نے کہا"ہمیں نہانے والا تولیہ چاہیے۔"

قاسم نے اسٹاف سے بات کی۔ وہ بولے۔"ہمارے پاس اس سے بڑے سائز کا تولیہ نہیں ہے۔ آپ یوں کریں کہ باری باری اسی سے سارا جسم پونچھ لیا کریں۔ اگر زیادہ پرابلم ہے تو ہم ایک اور دے سکتے ہیں۔"

خدایا۔ قاہرہ میں تولیوں کا اتنا قحط ہوگا' یہ ہم نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ سوچا کہ آئندہ کبھی قاہرہ جانے کا اتفاق ہوا تو اپنے ساتھ کچھ تولیے ضرور لے کر جائیں گے۔

اہرام کا سلسلہ قاہرہ کے گردونواح میں ہی شروع ہوجاتا ہے اور جہاں سے صحرا شروع ہوتا ہے وہاں تک پھیلا ہوا ہے جب تک آپ قاہرہ نہ جائیں اس وقت تک یہ محسوس ہوتا ہے کہ اہرام خدا جانے کیا توپ چیز ہوں گے۔ اہرام کو دیکھنے کے بعد ان کے رعب ودبدبے میں کچھ اضافہ ہی ہوتا ہے کیونکہ تصویروں اور تحریروں کے ذریعے آپ ان کی شان وشوکت کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ اصل اہرام کو دیکھ کران کی عظمت کا احساس دوگنا ہوجاتا ہے۔ عقل تسلیم نہیں کرتی کہ ہزاروں سال قبل انسانوں نے یہ دیو قامت پیکر تعمیر کیے ہوں گے اور کیوں کر تعمیر کیے ہوں گے جب کہ تعمیرات کے جدید طریقے اور سہولتیں بھی موجود نہ تھیں۔ ان حالات میں تپتے ہوئے صحراؤں میں یہ اہرام تعمیر کرنا کس قدر مشکل کام ہوگا۔

"میں بتاتا ہوں۔" بٹ صاحب نے فوراً" دخل در معقولات کی۔

"اچھاتو بتائیے؟" ہم سمجھے کہ بٹ صاحب نے غالباً" اس موضوع پر کوئی خاص کتاب پڑھ لی ہوگی۔ "مگر آپ کو پتا کیسے چلا؟"

بولے"میں نے فلم ٹین کمانڈنٹس دیکھی تھی۔"

لیجئے ان کی معلومات کا ماخذ بھی پتا چل گیا۔

وہ ٹین کمانڈنٹس نہیں' ٹین کمانڈمنٹس ہے۔"

"ہاں وہی جس کی نمائش پر پاکستان میں پابندی لگادی گئی تھی۔"

اہرام قاہرہ کے آس پاس بکھرے پڑے ہیں۔ بڑے' چھوٹے' درمیانی سائز کے اور بعض بے حد چھوٹے لیکن خوفو کے ہرم کی کیا بات ہے۔ صحرا کے سینے پر اس کی حیثیت ایک عظیم الشان دیو جیسی ہے۔ یقین نہیں آتا کہ یہ ہزاروں سال پہلے کے انسانوں کی تخلیق ہے۔ یہ تو کسی آسمانی یا غیر مرئی طاقت کی تخلیق لگتی ہے۔ پتھروں کے یکساں بڑے بڑے ٹکڑے ایک کے اوپر ایک بڑے سلیقے سے رکھے گئے ہیں۔ کیا مجال جو کہیں ذرا سی بھی کمی یا کوتاہی آجائے۔

خوفو اپنے عہد کا کس قدر پرہیبت' باعظمت اور طاقتور فرعون ہوگا جس نے اپنے لئے یہ مقبرہ تعمیر کرایا تھا۔ ہزاروں لاکھوں انسانوں نے شب وروز محنت کر کے اسے بنایا ہوگا اور اس کوشش میں سینکڑوں ہزاروں انسانوں کی جانیں بھی ضائع ہوئی ہوں گی مگر فرعونوں کو انسانوں کی کیا پرواہ ہوسکتی ہے۔ جب آج کے چھوٹے موٹے فرعون انہیں خاطر میں نہیں لاتے تو وہ سچ مچ کے فرعون تھے۔

خوفو کے ہرم کے آس پاس بھی سیاح بکھرے ہوئے تھے یا پھر گائیڈ تھے۔ ان کے علاوہ مانگنے والے' بس یہ تین قسم کی مخلوق ہے ہو' ان عجائبات کے آس پاس نظر آتی ہے۔ بچے' بڑے' جوان اور بوڑھے "اہلا"وسہلا"" اور "یاحبیبی" کے نعرے لگاتے ہوئے سیاحوں پر یلغار کردیتے ہیں۔ پتا نہیں ان میں وہ لوگ بھی ہوں گے جن کے آباؤ اجداد نے یہ ہرم تعمیر کرنے میں حصہ لیا ہوگا۔

یہ ہرم کسی زمانے میں خدا جانے کس قدر شاندار چیز ہوگا کہ امتداد زمانہ اور انسانی لوٹ کھسوٹ کے بعد بھی آج یہ اس قدر رفیع الشان ہے۔ ہرم کے اندر جانے کے لئے راستہ موجود ہے۔ ان راستوں کے اندر جانے کیلئے بھی شیر جیسے دل کی ضرورت ہے۔ ایک تو یہ احساس کہ آپ منوں ٹنوں پتھروں کے اندر دفن ہوگئے ہیں اور دوسرے یہ کہ ایک تنگ و تاریک گزرگاہ ہے جس میں تازہ ہوا اور روشنی کیلئے کوئی بندوبست نہیں ہے پھر بھی شیر دل لوگ ایسے ہیں جو ان راستوں کو طے کر کے تابوت تک پہنچ جاتے ہیں۔ ہم تو بس دروازے کو دیکھ کر ہی رہ گئے۔ اندر قدم رکھنے کی ہمت ہی نہ پڑی۔ سنا ہے کہ اندر جو راستہ سا بنا ہوا ہے جس میں رینگ رینگ کر

گھٹنوں کے بل چلنا پڑتا ہے۔ کہیں نشیب ہے اور کہیں فراز۔ پتھروں اور لکڑی کے تختوں کو جوڑ جوڑ کر یہ راستے بنائے گئے ہیں۔ انسانی ذہن بھی ایک حیرت انگیز چیز ہے کیسے کیسے انواع اقسام کے خیالات اس کے اندر جاگزیں ہوجاتے ہیں۔ اور پھر حضرت انسان ان تصورات کو عملی جامہ بھی پہنا دیتے ہیں۔ ان راستوں میں ہوا کا گزر ہی نہیں ہوتا۔ حبس اس قدر کہ بہت سے لوگ تو چند قدم چل کر واپس لوٹ آتے ہیں یا پھر بے ہوش ہوجاتے ہیں۔ ہم تو باہر کھڑے کھڑے ہی بے ہوش ہونے لگے تھے۔ کمزور دل اور کمزور جسم اعصاب کے لوگ تو خیر اندر جانے کے خیال سے ہی لرز جاتے ہیں۔ وہ کیسے لوگ ہوں گے جو آخری منزل تک پہنچ کر ہی دم لیتے ہیں۔ اللہ اکبر۔ ہر سائز کے اہرام موجود ہیں مگر نمونہ ایک جیسا ہے۔ ہزاروں لاکھوں سیاح اطراف عالم سے کشاں کشاں ان عجائبات کو دیکھنے کیلئے چلے آتے ہیں۔

گائیڈ آپ کو ان فرعونوں کی کہانیاں سناتے رہتے ہیں جنہوں نے اس سرزمین پر سالہاسال تک حکمرانی کی ہے اور جو مملکت کے مطلق العنان حکمراں تھے۔ ان کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ قانون کی حیثیت اختیار کرلیتا تھا۔ خاں صاحب گائیڈ کو بھلا کہاں خاطر میں لانے والے تھے۔ انہوں نے تو فرعون کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور اپنے کانوں سے ان کی باتیں سنی تھیں مگر یہ کیسے ممکن ہے؟ ممکن کیوں نہیں ہے۔ فلمی صنعت زندہ باد۔ ان اہرام کو دیکھنے والوں میں غیرملکیوں کے علاوہ مقامی لوگ بھی شامل ہوتے ہیں اور اپنی بساط کے مطابق ان کے بارے میں تبصرے کرتے رہتے ہیں۔

ایک تو موسم گرم' اس پر ریگستان کا علاقہ ' براحال ہوگیا۔ اگر آس پاس ریستوران نہ ہوتے تو بھلا ہمارا کیا حال ہوتا۔ ریستوران بہت اچھے' آرام دہ اور شاندار ہیں۔ کھانے پینے کی ہر چیز یہاں مل جاتی ہے۔ کافی سے لے کر وہسکی تک جس چیز کی خواہش کریں گے فوراً حاضر کردی جاتی ہے۔

ہمارے گائیڈ تو ابوالقاسم تھے۔ وہ ہمیں فرعونوں اور اہرام کے قصے سناتے رہے۔ اللہ جانے اس میں جھوٹ کتنا تھا اور سچ کتنا تھا مگر جو بھی تھا۔ نہایت دلچسپ اور حیران کن تھا۔

خاں صاحب کہنے لگے۔" اس شخص کے ذہن کی بھی داد دینی پڑتی ہے۔"

بھی اہرام بنانے والوں سے کم تو نہیں ہے۔ انہوں نے ٹھوس اہرام بنائے تھے۔ اس نے ان کے متعلق کہانیاں بنائی ہیں۔"

بٹ صاحب بار بار پوچھ رہے تھے۔ کہ قلوپطرہ کا حرم کہاں ہے۔ جب بتایا گیا کہ ان میں سے کوئی بھی قلوپطرہ کا حرم نہیں تو اہرام میں ان کی دلچسپی برائے نام رہ گئی۔

بولے۔ "عجائب گھر چلتے ہیں' وہاں قلوپطرہ کی ممی ہوگی۔"

اہرام کیا ہیں؟ مٹی' ریت' پتھر لیکن پھر بھی دیکھنے والوں کو حیران کردیتے ہیں۔

قاسم نے کہا" کافی اہرام دیکھ لیے۔ اب ابوالہول کے پاس چلتے ہیں۔"

پتھروں اور ریت کی آمیزش سے بنا ہوا یہ عظیم الشان مجسمہ کسی زمانے میں فن کا نمونہ ہوگا مگر آج بھی اس کی عظمت وسطوت میں کوئی کمی نہیں ہوئی ہے۔ حالانکہ ٹوٹ پھوٹ گیا ہے۔ اس کے باوجود اس کی ایک نرالی شان ہے۔ ابو الہول کے سامنے ہر شام کو لائٹ اور ساؤنڈ کا پروگرام پیش کیا جاتا ہے۔ روشنیوں' سایوں اور آوازوں کی مدد سے پرانے زمانے کے واقعات کی داستان بیان کی جاتی ہے۔ اور ایسانقشہ پیش کیا جاتا ہے کہ چشم تصور میں وہ تمام واقعات سچ مچ رونما ہوتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ ہم لوگ کافی تھک گئے تھے اس لئے روشنی اور آواز کے پروگرام کوملتوی کردیا گیا۔ جب شام کا اندھیرا پھیلتا ہے اس وقت اس پروگرام کا آغاز ہوتا ہے۔

ہم سب ان مناظر کو دیکھ کر مبہوت سے ہوگئے تھے۔ بٹ صاحب سب سے زیادہ متاثر نظر آرہے تھے جس کا ثبوت ان کی بے کراں خاموشی تھی۔ ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ بٹ صاحب اتنی دیر تک خاموش رہیں۔

جب ہم ٹیکسی میں سوار ہوکر واپس لوٹ رہے تھے تو انہوں نے اپنی زبان کھولی اور بولے۔"فرعون بھی عجیب لوگ تھے۔ بھلا اتنی دور ریگستانوں میں یہ سب کچھ بنانے کی کیا ضرورت تھی؟"

ہم نے کہا۔"توپھر اور کہاں بناتے؟ اگر شہر کے اندر بناتے تو لوگ کہاں جاتے؟"

ہم نے کہا۔"مگر خاں صاحب یہ شہر نہیں' شہر خموشاں ہے' یہ زندہ انسانوں کے رہنے کی جگہ نہیں ہے اور پھر فرعونوں کو لوگوں کیلئے آبادیاں اور بستیاں بنانے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ کام تو آج کے فرعون بھی نہیں کرتے۔ انہیں بھی اپنے گھر اور اپنے مقبرے بنانے سے فرصت نہیں ہے۔"

واپسی پر بٹ صاحب اور خاں صاحب نے ہوٹل واپس جانے سے صاف انکار کردیا۔ گرمی ' حبس' ریت اور سارے دن کی تھکن کے بعد اس ہوٹل کے باتھ روم کا تصور ہی روح فرسا تھا جہاں شاور میں پانی نہیں آتا تھا اور جسم خشک کرنے کیلئے تولیے دستیاب نہیں تھے۔ اس سے اچھا تو یہ تھا کہ کسی حمام میں چلے جائیں ۔ حماموں کی قاہرہ کے پرانے علاقوں میں کمی نہیں ہے مگر قاسم کامشورہ تھا کہ وہاں نہ جائیں تو بہتر ہوگا کیونکہ عام طور پر وہ زیادہ صاف ستھرے نہیں ہوتے۔

خاں صاحب کو اچانک آئیڈیا سوجھا۔"کیوں نہ ہم بازار سے تولیے خرید کر لے چلیں؟"

حیرت ہے یہ خیال پہلے کسی کو کیوں نہ آیا چنانچہ راستے میں ایک جگہ ٹیکسی رکوائی گئی اور قاسم کے ساتھ ہم ایک "صوق" میں داخل ہوگئے۔ ایک جنرل اسٹور قسم کی چیز تھی جس میں کوکا کولا سے لیکر ملبوسات تک ہر چیز موجود تھی سب سے زیادہ حوصلہ افزا بات یہ تھی کہ دکان میں ایک موٹے اور گنجے مالک کے علاوہ دو طرحدار مگر تنومند سیل گرلز بھی موجود تھیں جنہیں دیکھتے ہی خاں صاحب کی باچھیں کھل گئیں اور انہیں کچھ اور چیزیں بھی یاد آگئیں مثلاً" شیونگ کریم' بلیڈز ' رومال ' ناخن تراش وغیرہ۔

بٹ صاحب نے کہا"یہ سب چیزیں آپ کے پاس موجود تو ہیں پھر خریدنے کی کیا ضرورت ہے؟"

کہنے لگے ۔"پردیس میں ضرورت سے زیادہ سامان ہمراہ رکھنا عقلمندی کی نشانی ہے اور پھر یہ سب استعمال کی چیزیں ہیں۔ اپنے ساتھ قاہرہ کی یادگاروں کے طور پر پاکستان لے چلیں گے۔"

ہم نے کہا۔"ٹھیک فرمایا آپ نے۔ قاہرہ سے ایسے نوادرات خریدنے کا خیال اس سے پہلے کسی اور کو نہ آیا ہوگا۔"

خاں صاحب نے سیلز گرل کے پاس جاکر فوراً" انگریزی بولنی شروع کردی جس کے جواب میں اس نے سرہلاہلا کر "شکرا" شکرا"" کہنا شروع کردیا جس سے ثابت ہوا کہ خاتون کو انگریزی سے واقفیت نہیں تھی۔ خاں صاحب کی جگہ اگر کوئی اور شخص ہوتا تو دوسری سیلز گرل سے بات چیت شروع کردیتا مگر بقول بٹ صاحب کے خاں صاحب ایسی خواتین کو ترجیح دیتے ہیں جنہیں انگریزی نہیں آتی۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہے کہ گفتگو کا سلسلہ اس بہانے کافی دراز ہوجاتا ہے۔

خاں صاحب نے اس سے شیونگ کریم طلب کی اور اشاروں میں اسے شیونگ کریم کے بارے میں بتایا۔ وہ کچھ دیر سنتی اور دیکھتی رہی پھر سیفٹی ریزر اٹھالائی۔خاں صاحب نے بتایا کہ یہ ریزر تو شیو کرنے کے لئے ہوتا ہے مگر اس سے پہلے جو چیز استعمال کی جاتی ہے وہ درکار ہے۔ انہوں نے اپنے چہرے پر دونوں ہاتھ پھیر کر بھی سمجھانے کی کوشش کی ۔ لڑکی خاصی سمجھ دار تھی۔ اس نے فوراً" ایک خوشبودار صابن نکال کر پیش کردیا۔ ہم نے دیکھا کہ یہاں یہ سلسلہ کافی دیر تک جاری رہنے کا امکان ہے اس لیے خاں صاحب کو ان کے حال پر چھوڑ کر باہر نکل گئے۔ خاں صاحب پہلے یہ بھول ہی گئے تھے کہ وہ دراصل تولیہ خریدنے کیلئے دکان میں داخل ہوئے تھے جب خیال آیا تو انہوں نے تولیے کے بارے میں لڑکی کو اشاروں سے سمجھانا شروع کردیا۔ کبھی دونوں ہاتھوں سے جسم رگڑتے ۔کبھی چہرے پر دونوں ہاتھ پھیرتے ۔ کبھی ہاتھوں کو تولیے بناکر بالوں میں رگڑتے ۔ لڑکی کافی دیر تک ان کی یہ حرکتیں بغور دیکھتی رہی اور غور کرتی رہی۔ بالاخر وہ ایک الماری میں سے ایک خوبصورت سی ڈبیا نکال کرلے آئی جس میں خارش کی کریم تھی۔ خاں صاحب سر پکڑ کر رہ گئے۔ وقت زیادہ نہیں تھا اس لئے مجبوراً" دکان سے باہر نکل آئے۔خدا جانے اس لڑکی نے ان کے بارے میں کیا رائے قائم کی ہوگی۔

فندق پر جاکر ارادہ تھا کہ اگر غسل کا بندوبست نہ ہوا تو کم سے کم منہ ہاتھ ضرور دھولیں گے مگر خلاف توقع غسل خانے کے پائپ میں پانی آرہا تھا ۔ ایک عباپوش صاحب زادے کسی طرف سے نمودار ہوئے اور انہوں نے ایک درمیان سائز کا تولیہ

بھی کھونٹی پر لٹکادیا۔ ہم سب کی خوشی کے مارے باچھیں کھل گئیں لیکن مشکل یہ تھی کہ اس کے بعد دوسرا تولیہ نصیب نہ ہوگا۔

خاں صاحب کی باری آئی تو بہت بگڑے' کہا کہ اس عبا پوش لڑکے کو بلاؤ۔

پوچھا "اس کی کیا ضرورت ہے؟"

بولے۔"اس کی عبا اتروا کر تولیے کی طرح استعمال کریں گے۔"

جب تک ہم اس "فندق" میں قیام فرمارہے تولیے کا یہ بحران مسلسل جاری رہا۔ ایک دن تو بٹ صاحب اپنے بستر کی چادر اٹھاکر غسل خانے میں پہنچ گئے اور اسے تولیے کے طورپر استعمال کرنے لگے۔ یہ خیال سب کو پسند آیا۔ وجہ یہ تھی کہ بستروں کی چادریں تو ہوٹل والے ہر روز ہی بدل دیا کرتے تھے۔ نہاکر جسم پونچھنے کے بعد ہم اس چادر کو پوٹلی بناکر ایک کونے میں ڈال دیا کرتے تھے۔ ہوٹل کا عملہ اس کی جگہ دوسری اجلی چادر بستر پر بچھا دیتاتھا۔اس طرح بٹ صاحب کی فراست سے یہ مسئلہ حل ہوگیا۔ خاں صاحب نے ان سے کہنا شروع کردیا کہ بٹ صاحب اب کشمیر کا مسئلہ حل کرنے کیلئے بھی کوئی ایسی ہی ترکیب سوچو۔

دن بھر اہرام مصر کی ریت چھانی تھی اس لئے سبھی تھک گئے تھے مگر خاں صاحب کا فرمان تھا کہ ہم یہاں آرام کرنے نہیں' سیر کرنے آئے ہیں چنانچہ رات کیلئے ایک نیا پروگرام ترتیب دینا ضروری تھا۔ رات کیلئے دو ہی پروگرام ہوسکتے تھے۔ ایک یہ کہ شہر کی سڑکوں پر گھوما پھرا جائے۔ دوسرا یہ کہ کسی نائٹ کلب میں جاکر رقص و نغمہ دیکھا جائے۔

ابوالقاسم نے کہا۔" ایک تیسرا پروگرام بھی ہوسکتا ہے۔"

"وہ کیا؟"

"وہ یہ کہ سینما میں چل کر انڈین فلم دیکھی جائے۔"

بٹ صاحب نے بے ساختہ اتنی زور شور سے لاحول پڑھی کہ قاسم بے چارہ گھبرا سا گیا۔ ہم نے انہیں سمجھایا کہ بھئی' انڈیا تو ہمارے پڑوس میں ہے۔ ہم اتنی دور قاہرہ میں انڈین فلمیں دیکھنے تو نہیں آئے ہیں بلکہ قاہرہ کو دیکھنے آئے ہیں۔

بٹ صاحب نے کہا" اور اسے یہ بھی بتاؤ کہ ہمارے تعلقات انڈیا کے ساتھ اچھے نہیں ہیں کیونکہ اس نے کشمیر پر قبضہ کر رکھا ہے۔"

خاں صاحب نے قاسم کو بڑے رسان سے سمجھایا جس طرح اسرائیل نے عرب علاقوں پر قبضہ کررکھا ہے اسی طرح انڈیا نے بھی کشمیر پر زبردستی قبضہ کررکھا ہے اور اس سلسلے میں ہماری انڈیا سے جنگ بھی ہوچکی ہے۔

قاسم نے کہا"تو پھر کیا ہوا۔ جنگ اپنی جگہ ہے۔ فلم اپنی جگہ ہے۔"

خاں صاحب بہت جوش میں آئے مگر ہم نے انہیں مشورہ دیا کہ بلاوجہ اپنا جوش و خروش ضائع کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسے اس حال پر چھوڑ دو۔ ان لوگوں کے خیالات اور نظریات ہم سے مختلف ہیں۔

پھر بھی خاں صاحب نے قاسم سے پوچھ ہی لیا کہ اگر اسرائیل کی کوئی فلم قاہرہ میں نمائش کیلئے پیش کی جائے گی تو کیا وہ فلم دیکھنے جاؤ گے؟"

وہ بولا۔"یا اخی۔ فلمیں تو ہم مصری بھی اچھی بناتے ہیں مگر اسرائیل کی فلموں کی بات ہی اور ہے۔ ان فلموں میں ہیروئنیں بہت خوبصورت ہوتی ہیں اور کپڑے بھی کم پہنتی ہیں۔"

"تم نے وہ فلمیں کہاں دیکھیں؟"

بولا "وڈیو پر۔ میرے چند جاننے والے اسرائیل گئے تھے وہ بھی وہاں سے فلمیں دیکھ کر آئے ہیں۔ بہت تعریف کررہے تھے۔"

لیجئے اس کے بعد تو اس موضوع پر بات کرنا ہی لاحاصل تھا۔

قاسم کی ان باتوں نے ہم سب کو اس کی طرف سے بدظن کردیا تھا مگر پھر ہم نے سمجھایا کہ بھئی اس کے اپنے نظریات اور خیالات ہیں۔ ہمارے اپنے نظریات ہیں۔ آخر ہمارے ملک میں بھی تو بے شمار لوگ انڈین فلمیں دیکھتے ہیں اور ان کی تعریف بھی کرتے ہیں۔ اس لئے اس بے چارے پر ناراض ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

قاسم نے ایک نائٹ کلب کا نام تجویز کیا اور کہا کہ وہاں ام کلثوم کے نغمے گائے جاتے ہیں اور ڈانسر بھی بہت غضب کی ہے۔ وہاں کا تو ٹکٹ ہی بہت مشکل سے ملتا ہے اگر آپ لوگ کہیں تو میں فون پر کوشش کردیکھوں۔اس لئے کہ وہاں میرا ایک جاننے والا بھی ساز بجاتا ہے۔ یعنی وہاں بھی جان پہچان' تعلقات اور سفارش چلتی ہے اور

کیوں نہ چلیے آخر وہ بھی ایک مشرقی ملک ہے ۔ مشرق کو اللہ تعالیٰ نے جن خوبیوں یا خرابیوں سے نوازا ہے ' ان میں یہ سفارش سرفہرست ہے۔

خاں صاحب جھٹ سے بول پڑے۔" یہ بالکل مناسب تجویز ہے۔ بھئی ام کلثوم کے نغمے تو ان لوگوں کی جان ہیں۔ اگر ہم نے قاہرہ میں آکر بھی ام کلثوم کے نغمے نہیں سنے تو پاکستان جاکر کیا منہ دکھائیں گے۔"

بٹ صاحب بولے" تو پھر ایسا کرتے ہیں کہ نغمے سن کر آجائیں گے۔ڈانس میں تو آپ کی دلچسپی ہے نہیں۔"

کہنے لگے۔" یہ کیا بات ہوئی۔ بھئی ٹکٹ کی قیمت بھی تو وصول کرنی ہے اور تم نے سنا نہیں کہ وہ ڈانسر کتنی غضب کی ہے۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ رات کے وقت قاہرہ کی اپنی ہی نرالی شان ہوتی ہے۔ دن میں اس کے کچھ حصے بہت مرغوب کرتے ہیں مگر رات کے وقت۔جب روشنیاں ہوتی ہیں تو قاہرہ رنگ ونور کا سمندر نظر آتا ہے۔ دریائے نیل کے مناظر اس میں مزید اضافہ کردیتے ہیں۔ قاسم نے بتایا کہ دریائے نیل کی بجرے کے ذریعے سیر کا پروگرام بھی بنایا جاسکتا ہے جو بہت پرلطف ہوتا ہے مگر وقت کم تھا اور خاں صاحب کا یہ کہنا بھی بجا تھا کہ جب دور سے دریائے نیل دیکھ لیا تو نزدیک سے دیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہاں بجرے میں بیٹھ کر تو ہم قاہرہ کی روشنیاں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ اگر کشتی الٹ گئی تو کیا ہوگا۔ رات کے وقت ہمیں کوئی بچانے بھی نہیں آئے گا اور ہم دریائے نیل میں ڈوب جائیں گے۔

بٹ صاحب نے لقمہ دیا ۔"فرعون کی طرح۔"

ظاہر ہے اس کے بعد نیل میں کشتی رانی کا پروگرام ملتوی کردیا گیا تھا۔

ٹیکسی میں مختلف روشنیوں سے جگمگاتے ہوئے راستوں سے گزرتے ہوئے ابوالقاسم نے ہمیں مختلف مقامات کے بارے میں بتایا۔ فلاں سڑک کا یہ نام ہے۔ اس کے مقابل فلاں سڑک ہے ۔ اس کے نزدیک صلاح الدین ایوبی اسکوائر ہے جہاں ترک اور مملوک شہسواری کیا کرتے تھے۔

بٹ صاحب مچل گئے کہ صلاح الدین اسکوائر ضرور دیکھیں گے۔

قاسم نے وعدہ کیا کہ اگلے دن وہ ہمیں قابل دید عمارتیں اور عجائب گھر دکھائے گا۔ صلاح الدین اسکوائر کی زیارت بھی کرادے گا۔ قاہرہ کا اوپیرا اسکوائر بھی دکھائے گا جو لکڑی کا بنا ہوا ہے۔ یہ بہت قدیم عمارت ہے۔

ہم نے پوچھا" مگر اوپیرا کے فن کار تو بہت قدیم نہیں ہوں گے؟"

کہا" جی نہیں بالکل جدید ہیں سنا ہے ۔کہ بہت اچھا اوپیرا ہے۔ یورپ والوں کے مقابلے کا ہے۔"

"تم نے کبھی نہیں دیکھا؟"

"جی نہیں مجھے اوپیرا سے زیادہ بور اور کوئی چیز نہیں لگتی' یہ تو یورپ والوں نے اپنی چالاکی سے ہم پر مسلط کردیا ہے ورنہ اسے تو کوئی مفت بھی دیکھنے کو تیار نہ ہو۔"

ہم جس کلب میں گئے وہ شارع جمہوریہ کے آس پاس کسی سڑک پر تھا جس کا نام ہمیں یاد نہیں رہا۔ بہرحال بہت بارونق جگہ تھی سیاحوں کے ٹھٹ کے لگے ہوئے تھے۔ ہر طرف گہماگہمی تھی۔

نائٹ کلب کا نام عربی میں تو کچھ اور تھا لیکن انگریزی میں اسکا نام "کیٹ واک" تھا یعنی بلی کی چال۔ کافی بارونق اور خوبصورت جگہ تھی۔

ہم جس وقت اندر داخل ہوئے تو اسٹیج پر ایک طرح دار 'کشیدہ قامت اور بھرے بھرے جسم کی رقاصہ مصروف رقص تھی۔ ہم نے بہت غور کیا مگر اس رقص اور نغمے میں اور اس سے پہلے والے میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آیا۔ موسیقی بھی اسی انداز کی تھی اور رقص کے زاویے بھی وہی تھے۔ رقاصہ کے فن کا دارومدار اس کی کمر" پیٹ اور کولھوں پر تھا لیکن بہت ماہر فن کارہ تھی کمر اور کولھے ہلانا کوئی مشکل کام تو نہیں ہے۔ ہماری پنجابی فلموں کی تمام ہیروئنیں ہر فلم میں یہی کچھ کرتی ہیں مگر مصری رقاصہ کی بات ہی اور تھی اس کے رقص میں رعنائی 'کشش' دلکشی اور وقار کی آمیزش تھی۔ اس پر مصری موسیقی نے کچھ اور ہی کیفیت طاری کردی تھی۔ یہ ماحول یہ سماں اور یہ والہانہ انداز دنیا کے کسی اور نائٹ کلب میں دیکھنے کو نہیں ملا۔ ردھم کے لیئے رقاصہ نے دف کا استعمال کیا تھا اور ردھم اور دھن کے ساتھ رقاصہ کا دلنواز

سراپا اس طرح ہلکورے کھاتا ہوا نظر آرہا تھا جیسے سمندر میں جوار بھاٹا۔ تمام تر ہیجان خیزی اور جنسی کشش کے باوجود اس رقص میں فحاشی یا بے ہودگی کا شائبہ تک نہیں تھا۔ یہ ایک انوکھا تجربہ تھا۔

ہم لوگ رقاصہ کے حسن و جمال کو دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔ چمپئی رنگت، بھوری آنکھیں، شربتی بال اور نہایت پر کشش سراپا۔ قاسم نے اطلاع دی کہ یہ رقاصہ لبنانی ہے لیکن مصر میں بہت مقبول ہے۔ اس کا شمار صف اول کی بیلے ڈانسرز میں کیا جاتا ہے۔ عام طور پر رقص کرنے والیاں محض تماشائیوں کا دل بہلانے کے لیے اپنا فرض ادا کرتی ہوئی نظر آتی ہیں مگر اس رقاصہ کے رقص میں ایک خاص بات یہ تھی کہ رقص کو اس نے خود پر طاری کرلیا تھا۔ سب لوگ مبہوت بیٹھے اس کے حرکت کرتے ہوئے۔ چاندنی کی طرح چمکتے ہوئے جسم کو دیکھ رہے تھے اور کسی کو پلک جھپکنے کا ہوش تک نہ تھا۔ میں نے پہلے بھی بتایا ہے کہ بیلے ڈانس میں دوسرے ملکوں کی طرح محض مرد تماشائی ہی نظر نہیں آتے بلکہ خاندان کے دیگر افراد بھی اس تجربے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ مصریوں کو موسیقی اور رقص سے بہت وابستگی ہے۔ بچے بھی اس محفل میں موجود تھے اور شاید یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں میں بچپن ہی سے موسیقی کا ذوق اور شعور پیدا ہوجاتا ہے۔ ہم لوگ تو شاید ایسی محفلوں میں اپنی بیگمات اور بچوں کو ہمراہ لے جانا پسند نہ کریں۔

جب رقاصہ کا جنبش کرتا ہوا جسم ساکت ہوا تو دیکھنے والوں کو ہوش آگیا اور سارے ہال میں ایک بھن بھناہٹ کی آواز پھیل گئی ورنہ اس سے پہلے سناٹا چھایا ہوا تھا۔

رقص کے بعد ایک مغنیہ گانے کے لیے تشریف لائیں۔ انہوں نے جیسے ہی اپنی شیریں آواز بلند کی اچانک ہال میں شور سا مچ گیا۔ مغنیہ خاموش ہو کر کھڑی ہوگئی۔ اناؤنسر نے آکر عربی میں کچھ تقریر کی لیکن دوبارہ، ہی شور مچنا شروع ہوگیا۔ ہماری سمجھ میں صرف ایک ہی لفظ آیا "یاثومہ یاثومہ۔"

سب لوگ ہم آواز ہو کر یہی آواز لگا رہے تھے۔

خاں صاحب نے ہم سے پوچھا "یہ جرثومہ جرثومہ کیوں پکار رہے ہیں؟"

ہم نے کہا "شاید جراثیم کش دوائی چھڑکنے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔"

قاسم سے پوچھا تو اس نے ہنستے ہوئے کہا کہ حاضرین مغنیہ سے یہ فرمائش کر رہے ہیں کہ وہ ام کلثوم کا گایا ہوا کوئی نغمہ سنائے۔ ام کلثوم کو لوگ پیار سے "یاثومہ" کہہ کر پکارتے تھے۔ ام کلثوم کو نہ صرف مصر بلکہ تمام عالم عرب میں ایک دیوی کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ قاسم نے بتایا کہ اس محفل میں وہ نغمہ سرا ہوتی تھی۔ وہاں لوگ اس پر فرمائشوں کی بارش کر دیا کرتے تھے۔ "یا ثومہ فلاں نغمہ سناؤ۔" یا پھر "یاثومہ یہ مصرع پھر دہراؤ۔"

کوئی شوقین اچانک کھڑا ہو کر آواز لگاتا "یاثومہ مصرعہ دہراؤ ورنہ میں خود کشی کر لوں گا۔" اور ام کلثوم کو بار بار وہی مصرعہ دہرانا پڑتا ہے۔ ایک بار ایک شخص نے کھڑے ہو کر کہا "یاثومہ "اے رات والا" نغمہ سناؤ ورنہ میں اپنی بیوی کو طلاق دے دوں گا۔" اور ام کلثوم نے ان کی فرمائش بھی پوری کردی۔ اس طرح فرمائشوں کا سلسلہ تمام رات جاری رہتا تھا اور جب ام کلثوم ایک بار گانے کے لیے اسٹیج پر آتی تھی تو پھر آٹھ دس گھنٹے تک آواز کا جادو جگاتی رہتی تھی اور سننے والوں پہ سحر ساطاری کر دیتی تھی۔ ام کلثوم کا ایک انتہائی مقبول نغمہ " دالیل " ہے اس کا مطلب ہے "اے رات" یہ ایسا نغمہ تھا جسے سن کر بھی سامعین کا دل نہیں بھرتا تھا۔ عام لوگوں میں تو اس کی پرستش کی ہی جاتی تھی مگر حکمران بھی خود چل کر اس کے نغمات سے لطف اندوز ہونے کے لیے جایا کرتے تھے۔ قاسم نے بتایا کہ ایک مرتبہ قاہرہ کے نیشنل اسپورٹس کلب میں ام کلثوم کی نغمہ سرائی کا پروگرام جاری تھا اچانک بادشاہ وقت فاروق ام کلثوم کے نغمات سننے کے لیے وہاں جادھمکا اور اتنا متاثر ہوا کہ وہیں ام کلثوم کو "الکمال" تمغہ عطا کر دیا۔

ادھر قاسم یہ باتیں سنا رہا تھا ادھر اسٹیج پر اناؤنسر اور سامعین کے مابین بیت بازی جاری تھی۔ اناؤنسر کا کہنا تھا کہ پہلے آپ گلوکارہ کا گانا سن لیں، پھر وہ ام کلثوم کے نغمات بھی سنادے گی مگر سامعین کا اصرار تھا کہ نغمہ طرازی کا آغاز ام کلثوم کے نغمے سے ہونا چاہیے۔

ہم نے قاسم سے پوچھا۔ "کیا ام کلثوم بہت حسین عورت تھی؟"

"ہرگز نہیں ۔ وہ معمولی شکل وصورت کی عورت تھی۔ بلکہ کچھ لوگوں کے خیال میں تو بدشکل تھی مگر اس کی آواز کے حسن نے ظاہری شکل وصورت کا احساس ہی مٹادیا تھا۔ ایک عالم اس کا دیوانہ تھا۔ اس کی قدرومنزلت اور احترام کا یہ عالم تھا کہ لوگ اس کا نام سن کر مؤدب ہوجایا کرتے تھے ۔ لوگوں کو اس سے والہانہ عقیدت تھی۔ ۱۹۴۸ء میں ایک بار اس نے منگنی کا اعلان کیا تو سارے ملک میں آگ سی لگ گئی۔ ام کلثوم جہاں بھی نغمہ سرا ہوتی لوگ چیخ چیخ کر اسے شادی کرنے سے منع کرتے تھے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ منگنی ٹوٹ گئی اور شادی نہ ہو سکی لیکن کئی سال بعد ام کلثوم نے خاموشی کے ساتھ ایک ڈاکٹر سے شادی کرلی جس کا نام ڈاکٹر حسن الاعتقادی تھا۔

ام کلثوم نے ایک عام مذہبی گھرانے میں نیل کے کنارے ایک گاؤں میں جنم لیا تھا۔ ایک نام ام کلثوم رکھا گیا تھا عرب دنیا میں وہ "یاثومہ" کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس نے بچپن ہی سے قرآت کی تربیت حاصل کی تھی اور سات آٹھ سال کی عمر میں اس قدر خوش الحانی سے قرآت کرتی تھی کہ سننے والوں پہ سکتہ طاری ہوجایا کرتا تھا۔ کون جانتا تھا کہ یہ گمنام لڑکی کسی زمانے میں عالم عرب کی پہچان بن جائے گی ۔ عربوں میں یہ مثل مشہور ہوچکی ہے کہ عربوں کے مزاج کو سمجھنے کے لیے ام کلثوم کو دنیائے عرب میں جو مقام حاصل ہوا ' تاریخ میں اس کی کوئی مثال موجود نہیں ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک بار لکھا تھا کہ جس شخص نے ام کلثوم کی آواز نہیں سنی وہ عربی موسیقی کی دلاویزی کا اندازہ نہیں لگا سکتا۔

پندرہ سولہ سال قبل ام کلثوم نے ۸۰ سال کی عمر میں وفات پائی تو بہت عرصے تک اس کی موت کا سوگ منایا گیا لیکن اس کی آواز آج بھی لازوال ہے۔

اناؤنسر نے اپنی شیریں کلامی کی انتہا کر دی تھی مگر اس کے باوجود حاضرین ہی کی جیت ہوئی اور مغنیہ نے بالاخر ام کلثوم کے ایک نغمے سے پروگرام کا آغاز کیا۔ سامعین پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوگئی ۔ خود قاسم نے بھی جھومنا شروع کر دیا اور ساتھ ہی کہتا جارہا تھا کہ یا ثومہ کی آواز کے مقابلے میں یہ آواز کچھ بھی نہیں ہے ۔ اس کے باوجود سننے والے جھوم رہے تھے۔ اس طرح "یاثومہ" کو خراج عقیدت پیش کرنے کے بعد گلوکارہ نے اپنے نغمات پیش کیے ۔ آواز اس گلوکارہ کی بھی نہایت میٹھی

تھی ۔ یا شاید ہر عربی بولنے والے کی آواز میں شیرینی گھلی ہوتی ہے ۔ ہم زیادہ لطف اندوز نہ ہوسکے ۔ وجہ بتاچکے ہیں کہ ہمیں سبھی مصری گانے ایک ہی جیسے لگتے ہیں ۔ خدا جانے یہ بدذوقی ہے یا ناسمجھی ۔ خاں صاحب البتہ بہت زور سے آنکھیں بند کیے جھوم رہے تھے۔

بعد میں بٹ صاحب نے پوچھا۔ "بھائی آپ کس بات پر جھوم رہے تھے؟" خاں صاحب بولے۔ "میں جھوم نہیں رہا تھا۔ اور دراصل بہت زور کی نیند آرہی تھی۔ سوچا اس بہانے کچھ نیند لے لوں۔"

اس سلسلے میں خاں صاحب کو بدذوقی کا الزام بھی نہیں دیا جاسکتا تھا کیونکہ مسلسل جاگنے اور گھومنے پھرنے کی وجہ سے ہم سب کا کم و بیش یہی عالم تھا۔

نائٹ کلب سے باہر نکلے تو رات خاصی گزر چکی تھی مگر قاہرہ کی رونق اور شگفتگی اپنے عروج پر تھی ۔ بلکہ یوں لگ رہا تھا رات گزرنے کے ساتھ قاہرہ کے حسن میں اضافہ ہوتا جارہا ہے ۔ فٹ پاتھ پر ایک خوش شکل نوجوان عرب کو دیکھ کر قاسم نے "اہلا" و "سہلا" کہہ کر گلے لگالیا۔ رخساروں کو بوسہ دینے کی رسم ادا کی گئی پھر ہم لوگوں سے تعارف کرایا گیا۔ یہ صاحب قاسم کے دوست تھے ۔ ان سے بات چیت کرنے کی غرض سے ہم لوگوں نے ایک ریستوران کا رخ کیا۔ ان کا نام عتیق تھا۔ خاصا قیمتی نام تھا۔ "اہلا" و "سہلا" کو آپ مصر کا "ہائی" سمجھ لیجیے یا انگلستان کا ہیلو۔ ہم لوگ اس کی جگہ "السلام علیکم" کہتے ہیں ۔ قاہرہ کے دوران قیام میں ہم نے بھی کئی بار "اہلا" و "سہلا" کہنے کی کوشش کی مگر وہ ترنم اور گہرائی پیدا نہ ہوسکی جو عربوں کی ادائی میں ہے۔

عتیق صاحب کا پورا نام غالباً" عتیق اسدیا کچھ اسی قسم کا تھا۔ یعنی خالص عربی نام تھا ۔ ہمیں صرف عتیق ہی یاد رہ گیا۔ ان سے ملاقات کافی دلچسپ اور مفید ثابت ہوئی اور مصری زندگی کے ایک پہلو سے آشنائی ہوئی ۔ عتیق صاحب کی عمر تیس بتیس سال کے لگ بھگ تھی۔ خاصے اسمارٹ اور خوش شکل تھے ۔ قدوقامت بھی کم نہ تھا ۔ عربی بھی نہایت سلیقے اور مٹھاس کے ساتھ بولتے تھے ۔ اس کے علاوہ انگریزی بھی جانتے تھے جو کہ قاہرہ میں ایک اضافی خوبی سمجھنا چاہیے بلکہ یہ معلوم کر کے مزید

حیرت اور خوشی ہوئی کہ وہ فرنچ بھی جانتے تھے۔ یعنی ٹوٹی پھوٹی بول لیتے تھے اور سمجھ بھی لیتے تھے۔

خاں صاحب نے فوراً" ان کا امتحان لے ڈالا۔" میثی موسیو۔"

جواب میں انہوں نے بھی مسکرا کر میثی کہا۔ خاں صاحب تو ان سے چائے اور دودھ کی فرنچ بھی دریافت کرنا چاہتے تھے مگر ہم نے انہیں سمجھایا کہ آپ کو ان کا امتحان لینے کی ضرورت کیا ہے اور آپ کون سے فرنچ کے ماہر ہیں' لے دے کر کل چار لفظ فرنچ کے جانتے ہیں اور چلے ہیں دوسروں کا امتحان لینے۔

عتیق صاحب نے ہمیں اپنے متعلق کافی معلومات فراہم کیں۔ وہ محکمہ اطلاعات میں لباس اور اطوار سے تو یہی ظاہر ہو رہا تھا۔ انہیں حالات حاضرہ سے بھی واقفیت تھی پاکستان اور ہندوستان کے بارے میں کافی باتیں جانتے تھے مگر غالباً" سوشلسٹ خیالات کے مالک تھے کیونکہ انہوں نے ۶۵ء کی جنگ کا دینے کے بعد مشورہ دیا کہ دونوں ملکوں کو اچھے ہمسایوں کی طرح رہنا چاہیے۔ بلاوجہ لڑائی جھگڑے سے کیا حاصل ہو گا۔

ہم نے انہیں بتایا کہ ایک بھارت ہمارے ساتھ اچھا اور برابری کا سلوک نہیں کرتا دوسرے یہ کہ اس نے کشمیر پر قبضہ جما رکھا ہے۔

کہنے لگے "دیکھیے یا اخی۔ دنیا کا ہر مسئلہ جنگ کے بغیر حل ہو سکتا ہے تو پھر بلاوجہ جنگ کرنے کا کیا فائدہ ہے۔ انسانوں کو آپس میں دوستی اور بھائی چارے کے ساتھ رہنا چاہیے۔"

ہم نے کہا تو پھر آپ لوگ اسرائیل کے ساتھ دوستی اور بھائی چارے کے ساتھ کیوں نہیں رہتے اور آپ عربوں نے اسرائیل سے جنگ کیوں کی تھی؟"

بولے۔"وہ حماقت تھی۔"

ہم حیران رہ گئے۔"اس کا مطلب یہ ہے کہ اسرائیل کو پھیل کر سارے عرب ملکوں پر قبضہ کرنے کی اجازت دے دینی چاہیے؟"

کہنے لگے۔" اسرائیل تو اب ایک حقیقت ہے۔ اسے تسلیم نہ کرنا حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔ یہ تو فلسطینیوں نے بلاوجہ کا فساد پھیلا رکھا ہے جس کی وجہ سے

دوسرے عرب ممالک بھی مشکل میں پڑے ہوئے ہیں۔"

بٹ صاحب نے بلند آواز میں لاحول پڑھی۔ ہم تو سمجھ گئے مگر قاسم اور عتیق نے حیران ہو کر بٹ صاحب کی طرف دیکھا اور پوچھا" یا اخی ان کو کیا ہو گیا؟"

ہم نے کہا۔" دراصل یہ وظیفہ پڑھتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھار بلند آواز بھی نکل جاتی ہے۔"

عتیق نے بڑے غور سے بٹ صاحب کو دیکھا اور کہا۔" سبحان اللہ" پھر کہنے لگے" مگر آپ تسبیح کیوں استعمال نہیں کرتے۔ اجازت ہو تو میں ایک تسبیح پیش کروں؟"

یہ کہہ کر اس نے جیب سے ایک تسبیح نکال کر بٹ صاحب کی خدمت میں پیش کی۔ بٹ صاحب نے بڑی ناگواری سے منہ بنایا مگر ہم نے ان کی طرف سے فوراً" تسبیح قبول کر لی اور بہت بہت شکریہ ادا کیا۔ پوچھا۔" کیا آپ بھی کوئی وظیفہ پڑھتے ہیں؟"

وہ ہنسنے لگا۔" وظیفہ تو نہیں پڑھتا بس ایک رواج ہے یہاں کا۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ اکثر لوگ تسبیح ہاتھ میں رکھتے ہیں۔"

ہم نے کہا" جی ہاں۔ ہم نے تو نائٹ کلب اور مے خانے میں بھی لوگوں کو تسبیح گھماتے ہوئے دیکھا ہے۔"

کہنے لگا" یہ فیشن میں داخل ہے۔"

خاں صاحب اور بٹ صاحب کو عتیق کی باتیں بالکل پسند نہیں تھیں۔ بٹ صاحب نے اردو میں ہم سے کہا۔" میرا خیال ہے کہ یہ اسرائیل کا ایجنٹ ہے۔"

ہم نے کہا لعنت بھیجو۔ ہمیں کیا۔ یوں ہی سر راہ مل گیا ہے اور پھر ہر شخص کے اپنے نظریات اور خیالات ہوتے ہیں۔"

موضوع تبدیل کرنے کے لئے ہم نے ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں۔ عتیق سے پوچھا کہ وہ کہاں کا رہنے والا ہے۔ اس نے بتایا کہ اسکندریہ کے قریب ایک قصبے میں پیدا ہوا تھا۔ ماں باپ وہیں رہتے ہیں۔

"اور بیوی بچے؟"

وہ ہنسنے لگا " ارے بیوی بچوں کا کیا سوال ہے ۔ ابھی ہم اس قابل کہاں ہیں کہ شادی کرلیں؟"

یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی ۔ ایک اچھے خاصے معقول کھاتے کماتے نوجوان کے لئے شادی کرنے میں کون سی مشکل حائل تھی؟

قاسم نے کہا ۔ " یااخی ۔ ابھی یہ بے سروسامان ہے ۔کرائے کے فلیٹ میں رہتا ہے ۔ سواری کے لئے اسکوٹر نہیں ہے۔ گھر میں گھرداری کا سامان تک نہیں ہے ۔ بیوی گھر میں آئے گی تو اس کے لئے کپڑے لتے زیورات فرنیچر اور میک اپ کا سامان بھی ہونا چاہیے۔ پہلے یہ سب چیزیں اکٹھی کرے گا اس کے بعد شادی کرے گا۔"

خاں صاحب نے کہا " یہ سب چیزیں اسے جہیز میں مل جائیں گی ۔ پیسے والی سسرال ہوگی کوئی فلیٹ اور اسکوٹر بھی مل جائے گا۔"

وہ دونوں حیران ہو کر ہمیں دیکھنے لگے۔

" جہیز' وہ کیا ہوتا ہے؟"

ہم نے انہیں جہیز کے بارے میں مختصر طور پر بتایا کہ شادی کے موقع پر دلہن کے گھر والے سارا سامان دیتے ہیں یہاں تک کے دلہا کے گھر والوں کے لئے بھی کپڑے اور زیور دیتے ہیں۔

"اور دلہا کیا کرتا ہے "

" دلہا شادی کرتا ہے اور کیا کرتا ہے؟"

یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی۔ جب ذرا تفصیل سے سمجھائی تو وہ بہت پریشان ہوگئے۔ بولے۔ " یااخی۔ یہ تو بے غیرتی ہے کہ شوہر بیوی کے ماں باپ سے یہ سب چیزیں حاصل کرے۔ یہ تو اسلامی رواج بھی نہیں ہے۔"

ہم نے کہا ۔ "شکر ہے کہ کسی معاملے میں تو آپ لوگ اسلام پر عمل پیرا ہیں۔ ہمارے ہاں یہ تمام رواج اور رسمیں ہندوؤں کی دین ہیں۔ ان کی دیکھا دیکھی مسلمان بھی وہی کچھ کرنے لگے بلکہ ذات برادری کا چکر بھی شروع ہوگیا ہے"

انہوں نے بتایا کہ مصر میں بلکہ تمام دنیائے عرب میں اس کے برعکس ہوتا ہے جو شخص شادی کرنا چاہتا ہے وہ پہلے گھرداری کا بندوبست کرتا ہے اور بیوی کے

لئے تمام لوازمات خریدتا ہے بلکہ بعض اوقات تو لڑکی والوں کی خدمت میں نقد رقم بھی پیش کی جاتی ہے۔

" یااخی آپ خود سوچئے کہ آپ کسی کا لخت جگر اٹھا کر لے آتے ہیں۔ اس کی تو محبت سے دیکھ بھال کرنی چاہئے اور لڑکی کے ماں باپ کی اشک شوئی کرنا بھی ضروری ہے۔"

خاں صاحب نے کہا " اس کے ان خیالات کے بدلے اس کے تمام پچھلے قصور معاف کردینے چاہئیں۔"

ہم نے کہا ۔"اس میں اس کوئی ذاتی خوبی نہیں ہے۔ یہ عربوں کا دستور ہے شکر ہے کم ازکم بعض معاملات میں تو عرب اسلام کے اصولوں پر قائم ہیں۔"

شادی کے بارے میں قاسم اور عتیق نے ہمیں کچھ اور معلومات بھی فراہم کیں ۔ مثلاً" یہ کہ شادی سے پہلے لڑکے اور لڑکی کا معائنہ ہوتا ہے۔

بٹ صاحب نے کہا کہ یہ دستور تو ہمارے ملک میں بھی ہونا چاہیے ۔ اس طرح کم سے کم بیویوں پر یہ الزام عائد نہیں کیا جائے گا کہ وہ بے اولاد ہیں اس لیے لڑکے کی دوسری شادی ہونی چاہئے۔

عرب معاشرے کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہاں عورت کو کمتر اور مجبور نہیں سمجھا جاتا اور نہ ہی شوہروں کو بیویوں پر برتری حاصل ہوتی ہے ۔ اس کے برعکس وہ لوگ اپنی بیویوں کو بہت عزت و احترام دیتے ہیں اور ان کی قدر کرتے ہیں ۔

قاسم اور عتیق دونوں کا یہ مشورہ تھا کہ ہمیں دریائے نیل میں بحری سفر ضرور کرنا چاہئے اس کے بغیر ہم اصلی مصر نہیں دیکھ سکیں گے۔ نیل مصری شہ رگ ہے ۔ زندگی کی تمام حرارت اور خوبصورتی اسی دریا سے نکلتی ہے ۔ قاہرہ سے ایک بحری سفر سوان ڈیم تک اگر کیا جائے تو اس میں کم سے کم چھ دن لگتے ہیں لیکن راستے میں معروف یادگاریں مندر اور فرعونوں کے محلات بھی دیکھنے کو ملتے ہیں ۔ آبادیاں دریائے نیل ہی کے کنارے آباد ہیں کیونکہ جہاں دریا کی حد ختم ہوتی ہے وہاں صحرا شروع ہو جاتا ہے ۔ یعنی زندگی کے آثار معدوم ہوجاتے ہیں ۔ دریائے نیل ان لوگوں کو پینے اور زراعت کے لیے پانی فراہم کرتاہے ۔ ان کی زندگی کا انحصار ہی نیل پر ہے۔ اس لیے

پرانے زمانے میں لوگ نیل کو بھی دیوتا اور ان داتا سمجھا کرتے تھے اور اس کی پرستش کرتے تھے ۔ نیل کے کنارے گاؤں کو دیکھ کر محسوس ہی نہیں ہوتا کہ آپ جدید زمانے میں ہیں اس لیے کہ یہاں کا رہن سہن اور کھیتی باڑی قدیم انداز کی ہے ۔ مٹی کے جھونپڑے، دریا سے پینے کا پانی لے جانے والی عورتوں کی قطاریں، دریا کے گھاٹ پر کپڑے دھوتی ہوئی عورتیں، یہاں تک کہ کھیتی باڑی کے لیے بھی وہی آلات استعمال کیے جاتے ہیں جو فرعونوں کے زمانے میں مروج تھے ۔ مصریوں کی بد قسمتی یہ ہے کہ ان کے شہروں میں تو جدید تہذیب کی روشنی پہنچ گئی ہے مگر دیہات بدستور جہالت، لاعلمی اور غربت کے اندھیروں میں ڈوبے ہوئے ہیں ۔

لیکن نیل کا یہ بحری سفر مصر کی تہذیب کے بارے میں بھی بہت دلچسپ اور حیرت انگیز معلومات فراہم کرتا ہے۔ قاسم نے ہمیں اس بارے میں بہت کچھ بتایا ۔ فرعونوں کو مندر بنانے کا بہت شوق تھا ۔ یا پھر وہ اپنے مقبرے بنایا کرتے تھے لیکن خدائی کا دعویٰ کرنے والے یہ فرعون اس بات سے ہمیشہ خوف زدہ رہتے تھے کہ ان کے مرنے کے بعد چور اور ڈاکو ان کے مقبروں میں گھس کر ان کے زیورات اور نوادرات پر قبضہ کرلیں گے ۔ یہی وجہ ہے کہ چوروں کو دھوکا دینے کے لیے صحرا کو منتخب کیا جاتا تھا اور یہ لاشیں ریت کے اندر دفن کی جاتی تھیں مگر فرعونوں کی بے بسی اور قدرت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ چوروں سے وہ پھر بھی محفوظ نہ رہ سکے چوروں نے ایک بھی فرعون کی قبر نہ چھوڑی ۔ فرعونوں کے اصل مقابر بادشاہوں کی وادی میں پائے جاتے ہیں اور وہیں سے کھود کر دریافت کیے گئے ہیں۔

کرنک کے بارے میں قاسم نے بتایا کہ یہ دنیا کا سب سے بڑا مندر ہے اور دیکھنے کے قابل ہے اس مندر کی تعمیر دو ہزار سال تک جاری رہی تھی اور مختلف زمانے میں ہر فرعون اس کو بہتر بنانے کی کوشش کرتا رہا۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں مصر کے سب سے نامور اور طاقت ور فرعون رعمس دوئم نے خود کو لازوال بنانے کے لیے اپنا عظیم الشان مجسمہ بنوایا تھا ۔ رعمس دوئم نے ۶۳ سال تک مصر پر حکومت کی تھی اس کے مجسمے کو ابو سمبل کہا جاتا ہے اور یہ ایک نادر الوجود چیز ہے مگر فرعونوں کی بے بسی ملاحظہ ہو کہ جب اسوان ڈیم کی تعمیر شروع ہوئی تو بہت سی قدیم یادگاروں کے ساتھ ساتھ

ابو سمبل کا مجسمہ بھی اس کی زد میں آگیا لیکن اقوام متحدہ کی کوششوں سے اس مجسمے کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے اپنی جگہ سے اکھاڑا گیا اور دو سو فٹ کی مزید بلندی پر از سر نو "اسمبل" کردیا گیا جو آج بھی سیاحوں کے لئے حیرت کا سامان فراہم کرتا ہے۔ تمام فرعونوں میں صرف توتن خامین ایسا فرعون ہے جس کا مقبرہ محفوظ رہ سکا۔ توتن خامین ۱۹ سال کی عمر میں اللہ کو پیارا ہوگیا تھا اور اس کا مقبرہ بھی سائز میں کافی چھوٹا تھا۔ شاید اسی لیے چوروں کی دست برد سے محفوظ رہا۔ اسے ۱۹۶۴ء میں کھود کر دریافت کیا گیا تھا۔ فرعونوں کو مغربی ماہرین آثار قدیمہ کا احسان مند ہونا چاہئے جنھوں نے ریگستانوں اور صحراؤں میں کھدائی کرکے ان کے مقبرے، محلات اور دوسری یادگاریں دریافت کیں ورنہ یہ تو ریگستان کے بے کراں دامن میں ہی گم ہوکر رہ جاتے۔

شہر میں ایک تو "ویلی آف کنگز" ہے۔ یہ بادشاہوں کی وادی کہلاتی ہے کیونکہ قریب قریب سبھی فرعونوں نے اسی جگہ کو اپنی آخری آرام گاہ کے طور پر پسند کیا تھا اور یہاں بہت کچھ تعمیر کرایا تھا لیکن دریائے نیل کے مغربی کنارے پر ایک "ملکاؤں کی وادی" بھی ہے اس کی وجہ غالباً" یہ ہے کہ اس وادی میں ملکہ شپ شپو کا مندر موجود ہے۔ قدیم مصر کی تاریخ میں وہ واحد "خاتون فرعون" تھی۔ یعنی آپ فرعونوں کو یہ الزام نہیں دے سکتے کہ انہوں نے خواتین کو نمائندگی نہیں دی تھی۔ یہ بات اور ہے کہ صرف ایک ہی خاتون فرعون بن سکی۔

بٹ صاحب فوراً" بول پڑے۔"مگر قلوپطرہ بھی تو تھی۔"

قاسم سے کہا"یا اخی۔ قلوپطرہ صرف ملکہ تھی ۔ وہ فرعون نہیں تھی۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ بہت سے فرعونوں سے زیادہ مشہور ہے۔"

قاسم نے مزے کی بات یہ بتائی کہ مصر کی یہ واحد خاتون فرعون بھی اپنے مقبرے میں دفن نہیں کی گئی تھی ۔ اس نے بھی دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے کئی مندر و مندر بنوائے ۔ شاندار یادگاریں تعمیر کیں ۔ اپنا مقبرہ بھی تعمیر کرایا مگر اسے بھی اس کے اصلی مقبرے میں دفن نہیں کیا گیا بلکہ "بادشاہوں کی وادی" ہی میں اس کا تابوت حوالہ زمین کیا گیا جسے بعد میں چوروں نے نقب لگا کر نکال لیا۔

خاں صاحب کافی دیر سے یہ گفتگو سن رہے تھے آخر چپ نہ رہ سکے اور

بولے "بھائی ہم تو خواہ مخواہ فرعونوں سے" ڈرتے تھے۔ یہ کس قسم کے فرعون تھے جو بذات خود چوروں سے خوف کھاتے ہے اور ان کے ڈر سے اپنے اصلی مقبرے میں بھی دفن نہیں ہوتے تھے۔"

بٹ صاحب نے کہا۔"کم ازکم یہ کہنا غلط ہے کہ فرعون اپنے آپ کو خدا سمجھتے تھے۔ میرے خیال میں تو وہ بہت نیک لوگ تھے ہر وقت اپنی موت کو یاد رکھتے تھے اور مرنے سے پہلے ہی اپنے مقبرے بھی بنوالیا کرتے تھے اور پھر تابوت چرانے والوں سے ڈرتے بھی رہتے تھے۔"

عتیق کو ان کی گفتگو کا ترجمہ سنایا گیا تو وہ ہنسنے لگا اور بولا۔ "آپ یہ کیوں نہیں کہتے کہ اس زمانے کے چور فرعون سے بھی زیادہ طاقت ور تھے۔ فرعون بچارے تو خواہ مخواہ بدنام ہیں۔ اصل فرعون تو اس زمانے کے چور تھے جن کا تذکرہ تاریخ میں نہیں ملتا۔"

یوں تو مصر ہر اعتبار سے ایک پراسرار اور انوکھی سرزمین ہے۔ اس کی یادگاریں' تہذیب' تاریخ سبھی کچھ ساری دنیا سے نرالا اور مختلف ہے لیکن ہمارے خیال میں دنیاکا سب سے زیادہ عبرت انگیز مقام بھی ہے۔انسانوں کی بے بسی اور بے وقعتی اور خدا کی قدرت کا اس سے بڑا ثبوت کہیں اور نہیں ملتا اور کسی ایک آدھ جگہ بھی نہیں بلکہ قدم قدم پر عبرت کی داستانیں ریت کے ذروں کی طرح بکھری ہوئی ہیں۔ ذرا آج کے فرعونوں پر نظرڈالیے تو قدیم مصر کے فرعونوں کے مقابلے میں ان کی اوقات ہی کیا ہے مگر یہ اپنے "اجداد" کے انجام سے بھی کوئی سبق اور عبرت حاصل نہیں کرتے ۔دراصل عبرت اور سبق حاصل کرنا حضرت انسان کی سرشت ہی میں نہیں ہے۔ خاں صاحب نے درست فرمایا کہ "انسان سے زیادہ ڈھیٹ اور ناشکری خدا کی کوئی اور مخلوق نہیں ہے۔"

بٹ صاحب نے اس پر مزید تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا۔"کسی سردار جی نے بالکل درست ہی تو کہا تھا کہ "کیا یہی بندہ بنایا ہے ؟" ان کا یہ قول سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے مگر ہم لوگ لطیفہ سمجھ کر اس پر ہنستے ہیں۔"

خاں صاحب بولے۔" ہنسنے کا کیا ہے بٹ جی۔ لوگ تو آپ کی باتوں پر بھی ہنستے ہیں۔حالانکہ غور کریں تو آپ کے قول بھی سردار جی کی طرح سونے کے حروف میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔"

کافی دیر ہو گئی تھی۔ ہوٹل جاکر سونا بھی تھا اور دوسرے دن پھر قاہرہ نوردی کرنی تھی اس لیے سوچا کہ اب واپس چلنا چاہیے۔ عتیق الاسدید نے یا وہ جو بھی تھے' بہت خلوص سے ہمیں رخصت کیا۔مصافحہ کیا۔ بغلگیر ہوئے اور رخساروں کو بوسے بھی دیئے یہ ان کے اخلاص کا ثبوت تھا لیکن بٹ صاحب بہت کھنچے کھنچے رہے۔ بعد میں انہوں نے بتایا کہ عتیق سے گلے ملتے ہوئے انہیں کراہت آرہی تھی۔

"آپ لوگ میری بات لکھ کر رکھ لیجئے۔ یہ شخص یہودی اور اسرائیل کا ایجنٹ ہے۔ ایک نہ ایک دن اس کی حقیقت کھل جائے گی۔"

خاں صاحب بڑی سنجیدگی سے کہنے لگے۔" بٹ صاحب کیاخیال ہے،ہم حکومت مصر کو اس کے بارے میں مطلع نہ کردیں؟"

بٹ صاحب اس تجویز کے حق میں تھے لیکن رکاوٹ صرف یہ تھی کہ گواہی وغیرہ کے لیے قاہرہ میں قیام کرنا پڑے گا۔

خاں صاحب نے کہا"اور اسرائیلی ایجنٹ بھی آپ کے پیچھے لگ جائیں گے۔"

واپسی پر ہمیں پھر دو ٹیکسیاں لینی تھیں۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ قاہرہ میں ایک ٹیکسی میں صرف تین مسافر سوار ہو سکتے ہیں چوتھا خود ڈرائیور ہوتا ہے۔

خاں صاحب اسے فضول خرچی سمجھ رہے تھے یکایک انہیں ایک خیال سوجھا۔"کیونکہ نہ ہم بس یا ٹرام وے کے ذریعے ہوٹل چلیں۔"

بسیں ہم نے قاہرہ کی سڑکوں پر دیکھ رکھی تھیں۔ خاصی ٹوٹی پھوٹی اور خستہ حال تھیں۔ مسافروں کا ہجوم بھی ویسا ہی تھا جیسا کہ ہمارے ہاں کی بسوں میں ہوتا ہے لیکن قاہرہ کی ٹرام میں ہم نے سفر نہیں کیا تھا۔ قاسم سے کہا کہ اگر اس وقت ٹرام چلتی ہے تو کیوں نہ ہم ٹرام کے ذریعے سفر کریں؟

قاسم نے گھڑی دیکھی' پھر کہا۔ "شاید ہمیں ٹرام مل جائے مگر کچھ دور ہمیں پیدل چلنا ہو گا اور ٹرام ہمیں ہوٹل سے کچھ فاصلے تک لے جاسکے گی۔"

ٹرام کی کھوج میں ہم قاسم کی قیادت میں چل پڑے ۔ زیادہ دور نہیں جانا پڑا کہ کہ ہمیں ٹرام کی پٹڑی نظر آ گئی ۔

"وہ رہی!" بٹ صاحب بے اختیار چلائے۔

"کون ہے؟ کہاں ؟" خاں صاحب نے بے تابی سے پوچھا۔

"ٹرام کی پٹڑی۔"

رات کافی گزر چکی تھی ۔ اس لیے سڑکوں پر زیادہ ہجوم نہیں تھا ۔ ٹریفک بھی کم تھی ۔ قاسم نے ہمیں ایک جگہ لے جا کر کھڑا کر دیا۔" ابھی کچھ دیر میں ٹرام یہیں آجائے گی۔"

"کیا یہ ٹرام کا اسٹیشن ہے ؟" ہم نے پوچھا۔

"نہیں ۔ ٹرام تو اتنی آہستہ چلتی ہے کہ چلتی ٹرام پر بھی لوگ سوار ہو جاتے ہیں اور پھر ٹریفک کا رش زیادہ ہو تو ٹرام اکثر خود ہی رکتی رہتی ہے۔"

یکا یک کھڑ کھڑاہٹ کی آواز سنائی دی ۔ یوں لگا جیسے کوئی ہوائی جہاز ساؤنڈ بیریئر توڑ رہا ہے پھر ٹرام نمودار ہوئی۔ خراماں خراماں چلی آ رہی تھی ۔ ٹرامیں ہم نے یورپ کے شہروں میں بھی دیکھی تھیں اور یہ ٹرام بھی اسی قبیل سے تعلق رکھتی تھی مگر شکل و صورت میں قدرے مختلف تھی ۔ شاید اس لیے کہ وہ نئے ماڈل کی ٹرامیں تھیں اور یہ پرانے ماڈل کی تھی لیکن جب ٹرام ہمارے سامنے آکر رک گئی تو اندازہ ہوا کہ اسے بھی پرانی یادگاروں میں ہی شامل کرنا مناسب ہوگا۔

خاں صاحب بولے ۔"شاید فرعون کے زمانے کی ہے۔"

ٹرام ڈرائیور نے چند مسافروں کو کھڑا ہوا دیکھ کر ازراہ عنایت ٹرام روک دی تھی اور سب سے علیک سلیک بھی کی تھی۔

"اہلا" وسہلا"۔"

شاید وہ صبح سے ٹرام چلا رہا تھا مگر اتنی رات گئے بھی اتنا خوش مزاج اور ہنس مکھ نظر آ رہا تھا کہ جی خوش ہوگیا۔ ٹرام میں مسافر زیادہ نہیں تھے۔ اس لیے سب کو بیٹھنے کے لیے جگہ مل گئی۔ قاسم نے چند پیاسٹر دے کر ٹکٹ خرید لیے ۔مقامی لوگوں کے مقابلے میں ٹرام کے مسافروں میں غیر ملکیوں کی تعداد زیادہ تھی ۔ شاید وہ لوگ بھی، ہجوم کم ہونے کی وجہ سے رات کے وقت قاہرہ کی ٹرام سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہوں گے۔

خاں صاحب ایک سیٹ پر تشریف فرما ہوگئے ان کے برابر بھی دو نشستیں خالی تھیں جن میں سے ایک پر تو انہوں نے ازراہ عنایت ہمیں بیٹھنے کی دعوت دے دی اور دوسری سیٹ ایک خاتون کی خدمت میں پیش کردی۔ یہ ایک مصری خاتون تھیں۔ ملا جلا عربی اور مغربی لباس پہنے ہوئے تھیں۔ ایک اسکرٹ نما لمبی سی عبا تھی جو ان کی پنڈلیوں تک پہنچی ہوئی تھی، کمر میں انہوں نے ایک ڈوری باندھی ہوئی تھی جس کی وجہ سے ان کی دراز قامتی اور جسم کی خوبصورتی نمایاں ہوگئی تھی۔ بال جدید فیشن کے مطابق تراشے ہوئے تھے اور شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ کھلتا ہوا سانولا رنگ ، مناسب ناک نقشہ، خاصی دلکش خاتون تھیں ۔ انہوں نے انگریزی میں "تھینک یو" کہا اور بے تکلفی سے ہم دونوں کے درمیان فروکش ہوگئیں ۔ بھینی بھینی خوشبو نے ماحول کو خاصا خوشگوار بنا دیا اور خاں صاحب نے مغربی خواتین کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ بٹ صاحب اور قاسم قدرے فاصلے پر تھے مگر جب قاسم کی نظر ان صاحبہ پر پڑی تو وہ بڑھ کر ان کے نزدیک پہنچا اور "اہلا" وسہلا" کے بعد عربی زبان میں گفتگو کا سلسلہ شروع کردیا۔ وہ دونوں بار بار ہماری طرف دیکھ رہے تھے جس سے اندازہ ہوا کہ قاسم انہیں ہم لوگوں کے بارے میں بتا رہا تھا۔ خدا خدا کرکے ان کی عربی بول چال ختم ہوئی تو قاسم نے ہم لوگوں سے ان کا تعارف کرایا ۔ وہ ایک مصری خاتون تھیں ۔ ان کے والد مصری اور والدہ فلسطینی تھیں۔ ستائیس اٹھائیس سال کی عمر ہوگی ۔ کسی ٹریول ایجنسی میں ملازم تھیں ۔ انگریزی کے علاوہ فرنچ بھی جانتی تھیں یعنی خاصی پڑھی لکھی تھیں اس لیے پاکستان کے بارے بھی واقفیت رکھتی تھیں ۔ وہ کوئی فلم دیکھ کر واپس آئی تھیں اور خاصی ناراض نظر آ رہی تھیں۔

یہ مغرب والے فلموں میں بھی اپنا پراپیگنڈہ کرنے سے باز نہیں آتے ۔ جنگ کے زمانے کی فلموں میں خود کو معصوم اور بہادر بنا کر پیش کرتے ہیں ۔ اور جرمنوں کو بزدل ، ظالم اور بہادر بنا کر پیش کرتے ہیں ۔ آپ ہی بتائیے اگر جرمنی قوم واقعی نالائق تھی تو اس نے سارے یورپ کو کیسے فتح کرلیا تھا۔ ہٹلر اگر پاگل آدمی تھا تو اس نے

جرمنوں کو اتنی مضبوط قوم کیسے بنادیا تھا؟ اگر قسمت ساتھ دیتی تو وہ ان کی اینٹ سے اینٹ بجادیتا ۔"وہ خاصی پر جوش تھیں۔

دیکھیے ہم عربوں نے خود ہی زیادہ قیمت پر اپنی بہترین زمینیں یہودیوں کے ہاتھ فروخت کرکے انہیں قدم جمانے کا موقع دیا تھا۔ کسی بھی عرب ملک نے اس وقت توجہ نہیں دی۔ بعد میں بھی کون سیریس ہے ؟ بس فلسطینی غریب ' اسرائیل اورامریکا دونوں سے لڑ رہے ہیں ۔ کسی عربی ملک نے ان کے لیے کیا کیا ہے؟"

ہم نے کہا۔"مگراب تو اسرائیل ایک حقیقت ہے۔"

وہ بات کاٹ کر جوشیلے انداز میں بولیں۔"اگر جسم پر کوئی پھوڑا نکل آئے تو آپ اسے حقیقت نہیں کہہ سکتے۔ اسکا علاج آپریشن ہے ۔ یہ نہیں کہ اسے تسلیم کرکے صبر کرلیا جائے ۔ ایک دن آئے گا جب ہم اسرائیل کو بحرعرب میں پھینک دیں گے۔"

"مگر کیسے؟"

"آخر ایک نہ ایک دن تو اللہ ہماری تقدیر بدلے گااور عربوں کو صحیح لیڈر عنایت کرے گا۔"

بٹ صاحب نے جھک کر ہمارے کان میں کہا۔" اس کا نام تو پوچھا ہی نہیں۔"

اتنی سیریس گفتگو کے درمیان اچانک نام پوچھنا انتہا درجے کی حماقت ہوتی مگر قاسم نے یہ مشکل بھی آسان کردی اور کہا۔"یہ بہت سچی اور پکی محب وطن عرب لڑکی ہے۔ اس کانام عزیزہ ہے۔ عربوں کو عزیزہ جیسی لڑکیوں کی ضرورت ہے۔ ایسی مائیں ہی یاسرعرفات جیسے بیٹوں کو جنم دے سکتی ہیں۔"

عزیزہ سے مل کر اور باتیں کرکے طبیعت خوش ہوگئی۔ کہاں تو عقیق کی باتوں نے بدمزگی پیدا کردی تھی مگر عزیزہ نے عرب قوم پر ہمارا اعتماد بحال کردیا۔

ہماری منزل آنے سے پہلے ہی عزیزہ راستے میں اتر گئی۔ بٹ صاحب فوراً اس کی جگہ پر بیٹھ گئے۔ وہ بھی اس سے بہت متاثر معلوم ہورہے تھے۔ کہنے لگے" اس کا پتا پوچھنا چاہیے تھا۔"

"وہ کس لیے؟" ہم نے پوچھا۔

"بھئی اس کو کھانے پر بلانا چاہیے۔ مجھے تو یہی ایک اصلی عرب لڑکی نظر آئی ورنہ یہاں تو سبھی فرعونوں کے جانشین پائے جاتے ہیں۔"

خان صاحب نے کہا۔" بٹ صاحب اگر آپ اپنے خرچے پر عزیزہ کی دعوت دینا چاہتے ہیں تو اس کا پتہ آپ کو قاسم سے بھی مل سکتا ہے۔"

بٹ صاحب سوچ میں پڑ گئے پھر بولے۔" ہمارے پاس وقت کم ہے۔ انشاء اللہ اگلی بار آئیں گے تو عزیزہ کو ضرور کھانے پر لے جائیں گے۔"

ٹرام کا سفر خاصا پر لطف اور دلچسپ تھا۔ اس کی آوازیں اور حرکات ایسی تھیں کہ لگتا تھا کوئی لوری دے رہا ہے۔ نیند سی آنے لگی۔ مغربی سیاح خواتین بھی اس تجربے سے کافی لطف اندوز ہورہی تھیں۔ عزیزہ کے رخصت ہونے کے بعد خاں صاحب نے ان خواتین کی طرف توجہ دی اور ایک آہ سرد بھرکر کہا۔" آخر ہمارے ملک میں ایسی عورتیں کیوں نہیں آتیں؟"

ہم نے کہا۔" اس لئے کہ وہاں ٹرام چلنی بند ہوگئی ہے۔"

وہ بہت دیر تک حکومت کی پالیسی پر اظہار افسوس کرتے رہے۔" اتنا خوبصورت ملک ہے۔ اتنی بہت سی تاریخی یادگاریں ہیں ۔ قابل دید مقامات ہیں مگر ہماری حکومت سیاحت کی ترقی کیلئے کچھ بھی نہیں کررہی۔ دوسرے ملک سیاحت سے کتنا پیسہ کما رہے ہیں؟"

" اور اس بہانے خوبصورت عورتوں کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہیں۔"

ایک جگہ ٹرام سے ہم لوگ اتر گئے مگر خاں صاحب کا دل ٹرام ہی میں اٹکا رہ گیا۔ کیونکہ مغربی سیاح خواتین کی خاصی تعداد ٹرام میں سفر کررہی تھی۔ وہ بار بارپلٹ کرٹرام کی طرف دیکھتے رہے پھربولے۔" اچھی سواری ہے۔ سستی بھی ہے۔"

ہم نے کہا" فکر نہ کریں۔ ہم کل پھرٹرام میں سفر کریں گے۔ بلکہ جب تک قاہرہ میں رہیں گے' ٹرام ہی میں پھرا کریں گے۔"

ہوٹل کے باہر قاسم نے ہمیں"اللہ حافظ" کہا اور ہم نے بڑے زور وشور سے اس کا شکریہ ادا کیا۔ وہ غریب بلاوجہ ہماری خاطر اپنا قیمتی وقت ضائع کررہاتھا جبکہ ہم سے شناسائی بھی نہ تھی اور نہ کوئی مطلب تھا۔

ہوٹل کے لاؤنج میں جاکر ہم صوفوں پر بیٹھ گئے۔ استقبالیہ پر ایک تومند اور خاصے گہرے سانولے رنگ کے صاحب تشریف فرما تھے۔

خاں صاحب نے بیزاری سے منہ بنایا۔ "کیا مشکل ہے!"

"کیوں کیا ہوا؟"

"ملک سے باہر بھی اگر ایسے ہی لوگوں سے واسطہ پڑنا ہے تو پھر اس سے بہتر ہے کہ پاکستان ہی میں رہیں۔"

ہم نے کہا۔ "خاں صاحب ۔ آپ شاید بھول رہے ہیں کہ آپ یہاں لوگوں کے چہرے نہیں' اہرام مصر اور قاہرہ کی تاریخی یادگاریں دیکھنے آئے ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر بندے کو یہ بھی تو پتا چلنا چاہیے کہ وہ کسی فارن کنٹری میں ہے۔"

"بھائی تمہاری تو عادتیں بگڑ گئی ہیں۔ اخلاق کا دیوالیہ نکل چکا ہے۔ تم صرف گوری عورتوں کو تکتے رہتے ہو۔ تم جیسے لوگوں کے ملک سے باہر جانے پر پابندی لگادینی چاہیے۔ تم ہمیشہ انگریزوں کے غلام ہی رہوگے۔" بٹ صاحب نے اچھی خاصی تقریر کردی۔

خاں صاحب آنکھیں موند کر بیٹھ گئے اور کہا۔ "بٹ جی آپ جاکر اس اللہ دین کے جن کمروں کی چابیاں لے آیئے۔ ورنہ میں ساری رات یہیں بیٹھا رہوں گا۔"

بٹ صاحب ناراض تو ہوئے مگر خاں صاحب کا کہا ٹال بھی نہیں سکتے تھے۔

" استقبالیہ پر ایسی شکل کے لوگوں کا تقرر ممنوع قرار دینا چاہئے۔" خاں صاحب بڑبڑائے۔

دوسرے دن غسل خانے سے خاں صاحب چادر لپیٹ کر برآمد ہوئے۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے۔ دیکھنے والے کیا کہیں گے۔ صرف چادر لپیٹے پھر رہے ہو!"

"یہاں دیکھنے والا ہے کون؟ اور چادر لپیٹنا کوئی بری بات تو نہیں ہے۔ یہ عربوں کے کلچر میں شامل ہے۔ احرام بھی تو چادر ہی ہوتی ہے۔"

"مگر وہ ایک خاص موقعے کے لئے ہے۔ یہ مطلب تو نہیں کہ آپ ہر وقت چادر لپیٹے پھرتے رہیں۔"

"آپ نے قاہرہ کی سڑکوں پر لوگوں کو نہیں دیکھا۔ کیسے کیسے لباس پہن کر پھرتے ہیں۔ انہیں کون ٹوکتا ہے۔۔۔۔؟"

یکایک خاں صاحب بولتے بولتے خاموش ہوگئے۔ چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ کچھ سونگھنے کی کوشش کی اور پھر بولے۔ "مانس گند۔ مانس گند"

ہم نے حیران ہوکر انہیں دیکھا۔

بولے "مجھے انگریز عورت کی خوشبو آرہی ہے۔"

ہم نے کہا۔ "تمہیں تو شاید خواب میں بھی انگریزی عورتیں ہی نظر آتی ہیں۔"

مگر اسی وقت بٹ صاحب بہت تیزی سے آئے اور بولے۔ "خان صاحب جلدی سے کمرے میں جاکر کپڑے بدل لو۔ جلدی کرو۔ جلدی۔"

"بات کیا ہے؟"

" اس ہوٹل میں ایک انگریز عورت ٹھہری ہوئی ہے اور وہ اسی طرف آرہی ہے۔"

خاں صاحب بلا تاخیر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ کچھ دیر بعد آئے تو خاصے بنے سنورے تھے۔ گلے میں ٹائی بھی لگا رکھی تھی۔ آفٹر شیولوشن کی خوشبو بھی آرہی تھی۔ بال بہت سلیقے سے بنے ہوئے تھے۔

"کون ہے۔ کہاں ہے؟ کب آئی ہے؟" انہوں نے آتے ہی بٹ صاحب سے سوالات شروع کردیے۔

"پتا نہیں کون ہے' مگر میم ہے۔ رات ہی کو اس ہوٹل میں آئی ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اچھے اسٹینڈرڈ کا ہوٹل ہے۔"

ہم نے کہا۔ "پہلے تو نہیں تھا مگر اب ہوگیا ہے۔"

"چلو ۔ اسے تلاش کرتے ہیں۔"

ہم ہوٹل کی لابی میں پہنچ گئے۔ کوک کا ایک ڈبہ منگایا اور آرام سے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھ گئے۔

خاں صاحب بولے "پتا کرو کہیں باہر تو نہیں چلی گئی؟"

"کیسی باتیں کرتے ہو۔ میں وہاں جاکر پوچھوں کہ وہ انگریز عورت کہاں گئی؟"

چند منٹ اسی طرح انتظار میں گزر گئے۔ آخر کار گوہر مقصود نظر آگیا۔

گیلری میں سے ہمیں وہ جوڑا آتا نظر آگیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ خاتون میم تھیں۔ ان کے ساتھ جو صاحب تھے' وہ بھی انگریز تھے مگر دونوں کا حلیہ عجیب تھا۔ خاتون نے جینز اور ڈھیلی سے قمیص پہن رکھی تھی۔ بھورے بالوں میں شاید کئی دن سے کنگھی نہیں کی تھی۔ کپڑے بھی اجلے نہیں تھے۔ ان کے ہمراہ جو صاحب تھے۔ وہ بھی اسی قسم کے لباس میں تھے۔ فرق صرف یہ تھا۔ کہ ان کی سرخی مائل داڑھی بھی تھی۔ وہ دونوں ہپی تھے۔ لڑکی خاصی دلکش تھی لیکن اس کا ساتھی بہت لمبا' دبلا پتلا اور بے ڈھنگا سا تھا۔ انہوں نے اپنے کندھوں پر چھوٹے چھوٹے تھیلے لٹکائے ہوئے تھے جو شاید ان کا کل سامان تھا۔

"لیجئے' تھا جس کا انتظار وہ شاہکار آگیا۔"

خاں صاحب کچھ دیر خاموش رہے پھر اپنی ٹائی اتار دی بولے۔ "میں خواہ مخواہ ڈریس اپ ہوا۔"

بٹ صاحب نے مشورہ دیا "ٹائی تو خیر آپ نے یہاں اتار دی ہے مگر باقی کپڑے اتارنے سے پہلے اپنے کمرے میں چلے جائیے گا۔"

ہپی جوڑا ہمارے سامنے والے صوفے پر آکر براجمان ہوگیا۔

خاں صاحب نے رائے زنی کرتے ہوئے کہا۔ "کچھ بھی ہو مگر لڑکی خوبصورت ہے۔"

ہم لوگ قاسم کے منتظر تھے جس کے ساتھ ہمیں عجائب گھر اور قاہرہ کی مساجد دیکھنے کیلئے جانا تھا۔ چند منٹ بعد قاسم بھی آگیا۔ "اہلاً" "وسہلاً" کا تبادلہ ہوا۔

قاسم کی نظر ان دونوں پر پڑی تو معذرت کرکے ان کی طرف چلا گیا اور کچھ دیر تک ان سے باتیں کرتا رہا۔ واپس آیا تو ہم نے پوچھا۔ "تم انہیں جانتے ہو؟"

بولا۔ "صرف لڑکی کو۔ یہ اکثر آیا کرتی ہے اور اسی ہوٹل میں ٹھہرتی ہے۔"

"اور لڑکا؟"

وہ ہنسنے لگا۔ "لڑکا ہر بار نیا ہوتا ہے۔ یہ ناروے کا ہے۔ اس کو تل ابیب میں ملا تھا۔"

"تل ابیب میں؟"

"ہاں فی الحال یہ اسرائیل سے آئے ہیں۔ جب یہ قاہرہ آتی تو تل ابیب بھی ضرور جاتی ہے۔"

بٹ صاحب کے کان کھڑے ہوگئے۔ "میرے خیال میں تو یہ اسرائیلی ایجنٹ ہے۔ تمہیں چاہئے تھا کہ اس کے بارے میں پولیس میں رپورٹ کرتے۔"

قاسم ہنسنے لگا "کس بات کی رپورٹ۔ اس نے کون سا جرم کیا ہے؟ جو سیاح یہاں آتے ہیں' ان میں سے بہت سے اسرائیل سے ہوکر آتے ہیں یا پھر قاہرہ سے ہوکر اسرائیل بھی جاتے ہیں۔ سیاحوں کی آمدورفت پر تو کوئی پابندی نہیں لگائی جاسکتی۔"

بٹ صاحب نے کہا۔ "مگر وہ یہاں کے راز اسرائیل والوں کو جاکر بتاتے ہوں گے۔"

"کون سے راز؟ ہماری کوئی بات اسرائیل سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اچھا اب اٹھئے' کافی دیر ہوگئی ہے۔"

ہم لوگوں نے رات کے پروگرام کے مطابق ٹرام سے سفر کرنے کا ارادہ کیا مگر اس وقت ٹرام مسافروں سے لدی پھندی تھی جن میں بیشتر مقامی لوگ یا "کلاحین" تھے۔ چنانچہ ٹرام کا سفر ملتوی کردیا گیا اور دو ٹیکسیوں میں سوار ہوگئے۔

ہپی ایک زمانے میں ہر جگہ پائے جاتے تھے اور ان کی تعداد میں اتنی تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا کہ یوں لگتا تھا جیسے کچھ عرصے بعد ساری دنیا ہپی ہوجائے گی۔ یورپ اور امریکا میں تو خیر یہ غول در غول پائے ہی جاتے تھے مگر ایشیائی ملکوں میں بھی ان کی آمدورفت تھی۔ وجہ یہ تھی' کہ ان ملکوں میں منشیات آسانی اور انتہائی سستے داموں مل جاتی تھیں۔۔ ترقی پذیر ملکوں میں منشیات کا رواج دراصل ان ہی ہپیوں کا مرہون منت ہے۔ ان کی دیکھا دیکھی قبائلی نوجوانوں نے بھی اس کیفیت کا مزہ چکھنے کی کوشش کی۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ اس کے عادی ہوگئے۔ اب یہ حال ہے کہ ہر ملک میں

منشیات استعمال کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس کے سبب سے منشیات کی قیمتیں بھی بڑھنے لگی ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب ہپی صرف گوری نسل کے لوگ ہی ہوا کرتے تھے۔ باقی سب ان کا تماشا دیکھا کرتے تھے۔

بٹ صاحب نے ایک نکتہ پیدا کیا اور بولے "ہم یورپ کے اتنے بہت سے شہر گھوم کر آئے ہیں مگر ہم نے ایک بھی کالا ہپی نہیں دیکھا۔"

ہم نے کہا "ہاں۔ فی الحال یہ گوروں کی بیماری ہے۔ آگے اللہ مالک ہے"۔

خاں صاحب کو یہ فکر پڑی ہوئی تھی کہ یہ ہپی لوگ تولیے کے بغیر کیا کرتے ہوں گے۔

"بھائی' ان گوروں کے لئے تو ہوٹل والوں نے ضرور نہانے کے تولیے رکھے ہوں گے۔" بٹ صاحب بولے۔

"مگر وہ تو کہہ رہے تھے کہ ان کے ہوٹل میں بڑے سائز کے تولیے ہوتے ہی نہیں ہیں۔"

"پھر یہ بے چارے کیا کرتے ہوں گے؟"

خان صاحب نے تجویز پیش کی "میرے خیال میں ہم دو بڑے تولیے لاکر انہیں تحفے کے طور پر پیش کردیں۔"

"یار کچھ عقل کی بات کرو۔ جان نہ پہچان' بڑی خالہ سلام۔ وہ پوچھیں گے نہیں کہ آپ کون ہیں' تولیے پیش کرنے والے۔"

یہ بحث کچھ دیر اور جاری رہتی اگر ابوالقاسم بروقت نہ تشریف لے آتے۔

"آپ سب لوگ تیار ہیں؟" قاسم نے آتے ہی سوال کیا۔

"کس کام کیلئے"

"ارے بھائی' آج قاہرہ کی مسجدیں دیکھنے کا پروگرام ہے نا؟"

واقعی' ہم لوگ تو ان ہپیوں کی فکر میں یہ بھول ہی گئے تھے۔

بٹ صاحب نے کہا "قاسم سے کہو کہ ہوٹل والوں کو ان دونوں کے لئے بڑے تولیے منگانے کا کہے۔"

یہ مسئلہ قاسم کے سامنے پیش کیا گیا تو وہ ہنسنے لگا "آپ لوگ بلاوجہ فکر مند نہ

ہوں۔ انہیں تولیوں کی ضرورت نہیں ہے۔"

"کیوں؟ تو کیا یہ تولیے کے بغیر ہی نہا لیتے ہیں؟"

"جی نہیں۔ یہ نہاتے ہی نہیں ہیں۔ نہانا شاید ہپیوں کے مذہب میں جائز نہیں ہے۔ کم سے کم میں نے تو آج تک کسی ہپی کو نہاتے ہوئے نہیں دیکھا' نہ سنا۔"

ہپی جوڑا اس عرصے میں ہوٹل کی لابی میں ایک صوفے پر فروکش ہو چکا تھا۔

"کتنی خوبصورت لڑکی ہے" خاں صاحب نے ترس کھا کر کہا۔

"اور لڑکا اس قدر بدصورت ہے' پہلوئے حور میں لنگور ہی لگتا ہے۔"

خان صاحب نے بڑی فلسفیانہ بات کی "بات دراصل یہ ہے کہ کسی بھی خوبصورت لڑکی کے ساتھ چلنے والا مرد لنگور ہی نظر آتا ہے۔ کم از کم میرا تو یہی خیال ہے۔"

"آپ اپنی آنکھوں کا معائنہ کرائیں' شاید کمزور ہو گئی ہیں۔"

"آنکھیں اگر کمزور بھی ہو جائیں تو انسان پھر بھی لنگور نظر نہیں آتے۔"

اس پر خان صاحب نے فوراً ایک پرانا لطیفہ سنا دیا ایک صاحب کو ڈاکٹر نے عینک لگانے کا مشورہ دیا' وہ عینک لگا کر خاصے کارٹون نظر آتے تھے' ایک بار ان کے ایک دوست نے کہا

"بھائی صاحب' آپ یہ عینک لگانا چھوڑ دیں"

"کیوں؟"

"کیونکہ آپ یہ عینک لگا کر مجھے بجو نظر آتے ہیں"

وہ صاحب بڑے اطمینان سے بولے "اگر میں نے عینک اتار دی تو آپ مجھے بجو نظر آئیں گے"

یہ لطیفہ ہم لوگ درجنوں بار سن چکے تھے' اس لیے بالکل نہیں ہنسے۔

"لطیفے پر نہ ہنسنا بداخلاقی ہے" خان صاحب نے ٹوکا۔

"مگر یہ لطیفہ تو ہم سینکڑوں بار سن چکے ہیں۔ ہماری تو ہنسی بھی ختم ہو گئی ہے۔ آخر آپ ہر بار یہ لطیفہ سناتے ہی کیوں ہیں؟"

بولے "میرے عزیز۔ اچھا لطیفہ ایک اچھے شعر کی طرح ہوتا ہے۔ جسے ہزار

بار بھی حسب حال استعمال کیا جاسکتا ہے۔ یہ بتائیے کہ لطیفہ حسب حال ہے یا نہیں ؟"

"ہو گا۔ مگر آپ ہم سے ہنسنے کی توقع نہ رکھیں۔"

"آپ لوگوں نے ناشتا کرلیا؟"

"ہاں۔ سوکھی روٹی کھالی ہے۔ مکھن لگاکر۔"

"تو پھر اب چلیں۔"

خان صاحب کی نظریں نمی جوڑے پر لگی ہوئی تھیں، بولے "ان دونوں کو بھی ساتھ نہ لے چلیں۔ بے چارے قاہرہ میں اجنبی معلوم ہوتے ہیں اور یہ تو عربی زبان بھی نہیں جانتے۔ بہت مشکل ہوگی انہیں۔"

بٹ صاحب نے کہا "اور آپ تو جیسے عربی کے ماہر ہیں۔"

قاسم نے کہا "یا اخی۔ آپ لوگ بلاوجہ ان لوگوں کے لیے پریشان نہ ہوں۔ یہ لڑکی ہر سال قاہرہ آتی ہے اور اکثر اسی ہوٹل میں ٹھہرتی ہے۔ یہ قاہرہ کے چپے چپے سے واقف ہے۔"

"تو پھر اسے گائیڈ کیوں نہ بنالیں؟" خاں صاحب نے تجویز پیش کی۔ "ان لوگوں کے بھی چار پیسے کی آمدنی ہوجائے گی۔"

بٹ صاحب نے خاں صاحب کو اتنی زور سے گھورا کہ وہ سٹپٹا کر رہ گئے لیکن نمی لڑکی ان کے دل کو بھاگئی تھی۔ ان کی نگاہیں اسی کے چہرے کا طواف کرتی رہیں۔

ہم لوگ ہوٹل سے باہر نکلے تو دن چڑھ چکا تھا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ گرمی کا وقت شروع ہوگیا تھا۔ ہمارا تو خیال تھا کہ بس میں سفر کرنا چاہیے مگر خاں صاحب اس تجویز کے خلاف تھے۔ ان کا مقولہ تھا کہ یورپ میں بس یا ٹرام کے سوا کسی اور سواری میں سفر نہیں کرنا چاہیے اور قاہرہ میں بس اور ٹرام میں سفر نہیں کرنا چاہیے۔

"مگر کیوں؟"

"بھائی آپ نے فرق نہیں ملاحظہ کیا۔ یورپ کی بسوں میں کیسی خوبصورت اور خوشبودار عورتیں ہوتی ہیں۔ دھکے کھا کر بھی انسان بدمزہ نہیں ہوتا۔ یار ماننا پڑے گا کہ خوب صورتی تو یورپ میں ختم ہے۔"

"خوبصورتی تم نے دیکھی کہاں ہے!" بٹ صاحب کا یہ پسندیدہ موضوع تھا "بدقسمتی یہ ہے کہ تم نے کشمیر نہیں دیکھا اس لئے تمہیں خوبصورتی کا مطلب ہی معلوم نہیں ہے۔"

6

قاسم کی سمجھ میں یہ نوک جھونک بالکل نہیں آ رہی تھی۔ اسی لئے وہ بے چارہ حیران ہو کر باری باری سب کی شکلیں دیکھ رہا تھا۔ خاں صاحب نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں اسے گفتگو کا خلاصہ سنایا تو وہ بھی سر ہلانے لگا۔" یہ تو سچ ہے۔ یورپ کی عورتیں بہت گوری ہوتی ہیں۔ مجھے تو بچپن ہی سے یورپ کی عورتیں اچھی لگتی ہیں۔"

"بچپن سے؟ کیا تمہارا بچپن یورپ میں گزرا تھا؟"

"نہیں۔ مگر بچپن میں بھی یورپ کی بنی ہوئی گڑیاں دیکھا کرتا تھا اور وہ مجھے بہت اچھی لگتی تھیں۔ بڑا ہوا تو دیکھا کہ یورپ کی عورتیں بالکل گڑیوں کی طرح ہوتی ہیں۔ اس لیے میں انہیں بھی پسند کرنے لگا۔"

خاں صاحب بولے" ان کے بارے میں تو وہ شعر بالکل درست ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ میں بچپن میں بھی عاشق مزاج تھا۔"

"آپ کا مطلب اس شعر سے ہے
میرا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ تھا؟"

"ہاں ہاں، بالکل وہی۔"

"مگر بھائی ایک بات سمجھ میں نہیں آئی" بٹ صاحب نے فٹ پاتھ پر چلتے چلتے کہا۔

"وہ کیا؟"

"ہم نے یورپ میں بہت ہپی دیکھے مگر آج تک کوئی کالا ہپی نہیں دیکھا۔ نہ عورت نہ مرد اور نہ ہی کبھی کوئی اکیلا ہپی دیکھا، آخر یہ کیا بات ہے؟"

"یہ بھی ایک راز ہے۔" خاں صاحب بولے" مگر یہ بتانے کا نہیں ہے۔"

قاسم کو ایک بار پھر اس گفتگو کا ترجمہ سنایا گیا تو اس نے جواب میں تصوف جھاڑنا شروع کر دیا" یا اخی۔ یورپ والے بے دین ہیں، روحانیت سے دور ہیں۔ اس لیے سکون کی تلاش میں نشہ کرتے ہیں اور ساری دنیا میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ اگر خدا سے لو لگائیں اور نماز روزہ قائم کریں تو انہیں ہپی بننے کی ضرورت نہ پڑے۔"

ہم نے کہا" مگر جو مسلمان نماز روزہ نہیں کرتے وہ ہپی کیوں نہیں بن جاتے؟"

"اس لیے کہ انہیں اسلام کا سہارا ہوتا ہے۔ خدا اور رسول پر ان کا یقین ہوتا ہے۔ مشکل وقت میں وہ اللہ کو یاد کرتے ہیں۔ مگر یہ کم بخت انگریز تو مصیبت کے وقت میں بھی اللہ کو یاد نہیں کرتے۔ نشے میں رہ کر غم غلط کرنا چاہتے ہیں۔ اسی لئے تو ساری دنیا میں ذلیل و خوار ہیں۔"

یکایک بٹ صاحب نے نعرہ لگایا" وہ رہی!"

ہم سب نے تیزی سے پلٹ کر اس طرف دیکھا جدھر انہوں نے انگلی سے اشارہ کیا تھا۔ سب کا خیال تھا کہ انہوں نے کوئی خوبصورت لڑکی دیکھ لی ہے۔ مگر وہ ایک اونٹ گاڑی تھی۔

"ہم کیوں نہ اونٹ پر سوار ہو کر جائیں؟" انہوں نے کہا۔

"اس سے بہتر تو گدھا گاڑی ہوگی۔ ہم سب کے سب ایک گاڑی میں سما جائیں گے۔"

"بالکل نہیں" قاسم نے ہمیں یاد دلایا" گدھا گاڑی میں پانچ آدمیوں کا بیٹھنا ممنوع ہے۔"

"مگر ہم تو چار ہیں؟"

"ڈرائیور کے بارے میں آپ کا کیاخیال ہے۔ وہ بھی اتفاق سے آدمی ہی ہوتا ہے۔"

بہرحال ایک بگھی نما گھوڑا گاڑی نظر آگئی اور فیصلہ ہوا کہ اس میں سوار ہوکر چلتے ہیں۔ دراصل ہمیں کئی مقامات پر جاناتھا جو سب کے سب قدیم مصر میں واقع تھے۔ جگہ جگہ ہمیں قیام کرنا تھا۔ اس لیے ٹیکسی بلکہ ٹیکسیوں کا سفر ہمیں کافی مہنگا پڑتا۔

ہم نے قاسم سے پوچھا"گھوڑا گاڑی میں ہم سب کے بیٹھنے پر ڈرائیور کو اعتراض تو نہیں ہوگا؟"

کہنے لگے"ڈرائیور کو تو نہیں ہوگا لیکن گھوڑے کو ہوسکتا ہے مگر وہ ہم سب کو سوار ہوتے ہوئے دیکھ نہیں سکے گا" بے چارہ۔"

اس پر ہمیں ایک لطیفہ یاد آگیا۔ایک بہت موٹے صاحب نے تانگے والے کو آواز دے کر روکا اور کہا"کیوں بھائی چلو گے۔"

اس نے کہا"بابو جی۔ ڈبل کرایہ ہوگا"

بولے "کوئی بات نہیں۔ دے دیں گے۔"

تانگے والا کہنے لگا"توپھر گھوڑے سے آنکھ بچا کر پیچھے سے تانگے میں بیٹھ جائیں۔"

سب سے پہلے قاسم نے ہمیں کٹ کیٹ مسجد دکھائی۔ یہ قاہرہ کی تاریخی مسجد ہے۔ خاصی پرانی ہے۔

ہم نے کہا"مگر یہ کیانام ہے۔ مسجد کانام کٹ کیٹ؟"

بولا " بس اس کا یہی نام ہے۔ دراصل پہلے یہاں نائٹ کلب ہوا کرتا تھا۔ بعد میں آس پاس کے لوگوں کا جذبہ ایمانی جوش میں آیا تو انہوں نے اس کلب کو خرید کر اسے مسجد بنادیا۔ یہ اسی نام سے مشہور ہے۔"

یہ زیادہ بڑی مسجد نہیں تھی۔ بہت زیادہ قدیم بھی نہیں لگتی تھی۔ قاسم نے بتایا کہ یہاں عام طور پر نماز نہیں ہوتی کیونکہ سیاحوں کا جمگھٹا رہتا ہے۔ اگر یہاں باقاعدہ نماز ہونے لگے تو سیاح ڈسٹرب ہوں گے۔"

" اور نمازیوں کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"بولا نمازیوں کا دھیان تو عبادت میں لگا رہتاہے۔ وہ کسی چیز سے ڈسٹرب نہیں ہوتے۔"

اس وقت بھی مسجد میں تھوڑے سے سیاح موجود تھے دو تین گائیڈ حضرات بھی تھے جو بہت زور و شور سے انہیں معلومات فراہم کررہے تھے۔ سیاحوں کی دو تین ٹولیاں تھیں جنہیں تین گائیڈ مسجد کے بارے میں بتا رہے تھے اور اس قدر بلند آواز میں بول رہے تھے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

خاں صاحب نے کہا"کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ ایک ہی گائیڈ ان کو بتا دیتا۔"

"مگر اس طرح دو گائیڈ بے روزگار ہوجاتے" قاسم نے کہا۔

ان دنوں مصر پر دنیا کے سیاحوں کی یورش تھی۔ سیاحت ملک کی بہت بڑی صنعت تھی جس سے اربوں ڈالر سالانہ کی آمدنی ہواکرتی تھی۔ آج کل تو حالات اس کے برعکس ہیں۔ اسلامی جماعتوں نے نہ صرف حکومت کے خلاف مہم چلارکھی ہے بلکہ سیاحوں کو بھی وارننگ دے رکھی ہے کہ وہ مصر کا رخ نہ کریں ورنہ ان کے جان ومال کی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔سیاحوں کی کئی ٹولیاں اور بسوں پر حملہ کرکے انہیں ہلاک وزخمی بھی کردیا ہے ۔ ان کا مقصد حکومت وقت کو نقصان پہنچانا ہے اور وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب بھی ہورہے ہیں۔ غیر ملکی سیاح اب مصر جاتے ہوئے خوف کھاتے ہیں۔ اس وجہ سے سیاحوں کی تعداد بہت کم رہ گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی مصر اور قاہرہ کی رونق بھی ختم ہوکر رہ گئی مگر جس زمانے کا ذکر کررہے ہیں وہ سیاحوں کے رش کا زمانہ تھا۔ قدم قدم پر غیرملکی سیاحوں سے واسطہ پڑتا تھا۔ قاہرہ ' اسکندریہ ' اہرام اور دوسرے قابل ذکر مقامات پر خوب چہل پہل رہا کرتی تھی۔ ہوٹل اور ریستوران بھرے رہتے تھے۔ دکان داروں ' ٹیکسی والوں اور نائٹ کلبوں کی چاندی تھی۔ ہزاروں ' لاکھوں افراد کی روزی سیاحت سے وابستہ تھی اور تو اور مانگنے والوں کے بھی مزے تھے۔ اس زمانے میں گائیڈ بھی بہت کماتے تھے۔غیر ملکی خصوصاً" یورپ اور امریکی سیاحوں کی یہ نفسیات ہے کہ وہ گائیڈ کے بغیر سیاحت کو نامکمل سمجھتے ہیں۔ انہیں بذات

خود تو کچھ معلومات ہوتی نہیں ہیں۔ گائیڈ جو کچھ بتا دیتے ہیں وہ اس پر یقین کر لیتے ہیں اور گائیڈ بھی ان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر خوب گپیں لگاتے ہیں۔

قاہرہ میں مساجد کی کمی نہیں ہے۔ جن میں قدیم تاریخی مسجدوں کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے۔ ان مسجدوں میں عام طور پر نماز ادا نہیں کی جاتی۔ عیدین کے موقع پر ان میں سے بعض مسجدوں میں نماز ہوجاتی ہے مگر عام طور پر یہ تاریخی یادگاروں کے طور پر سیاحوں کے لئے مخصوص کردی گئی ہیں۔ دوسری مسجدوں میں نمازیوں کی خاصی رونق رہتی ہے۔ جمعہ کے روز تو مسجد کے باہر سڑکوں پر بھی صفیں قائم ہوجاتی ہیں۔ عید کے موقع پر رونق اور زیادہ ہوتی ہے۔ قاسم نے بتایا کہ رمضان المبارک بہت جوش وخروش اور اہتمام کے ساتھ منایا جاتا ہے۔ رمضان شریف..... میں رات بھر چہل پہل رہتی ہے اور جشن کا سا سماں ہوتا ہے۔

جامع ازہر کی مسجد کے بارے میں ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں۔ جو لوگ دنیا کی اس قدیم ترین یونیورسٹی کو دیکھنے جاتے ہیں وہ جامعہ کی مسجد کو بھی ضرور دیکھتے ہیں۔ الازہر یونیورسٹی تو 970ء میں قائم ہوئی تھی۔ غالباً مسجد بھی عمارت کے ساتھ ہی تعمیر کی گئی ہوگی۔ یونیورسٹی اور مسجد کی عمارتیں خاصی اچھی حالت میں ہیں اور اس علاقے میں ہر وقت میلہ لگا رہتا ہے۔

اس روز ہمیں قاسم نے جو مساجد دکھائیں ان میں مسجد محمد علی، مدرسہ سلطان حسین (یہاں مسجد بھی ہے) مسجد عمرو بن العاص (یہ مشہور فاتح اور سپہ سالار حضرت عمرو بن العاص نے تعمیر کروائی تھی) معید مسجد، ابہ مسجد پندرہویں صدی میں تعمیر کی گئی تھیں۔ احمد بن تولون کی مسجد قابل ذکر ہیں۔ احمد بن تولون کی مسجد نویں صدی میں تعمیر کی گئی تھی۔ مسجد کی شان وشوکت اپنی جگہ لیکن اس کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس مسجد کا صحن بہت وسیع ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کا صحن دوسری تمام مساجد سے بڑا ہے۔ کسی زمانے میں یہاں کھوے سے کھوا چھلتا ہوگا اور مسجد کا صحن نمازیوں سے بھر جاتا ہوگا مگر آج کل یہاں صرف سیاحوں کے دم قدم سے رونق اور چہل پہل ہے۔

پرانی مساجد میں نگہداشت کا انتظام بھی زیادہ اچھا نہیں ہے۔ بعض مقامات پر

مرمت ہوتی ہوئی نظر آئی۔ یورپ والوں نے اپنی تاریخی یادگاروں کو جس طرح سنبھال کر اور بنا سنوار کر رکھا ہے قاہرہ کی تاریخی عمارتوں میں وہ بات نظر نہیں آتی۔ ایک مسجد میں گئے تو دیکھا کہ صحن کے مختلف حصوں میں مختلف عالم تشریف فرما ہیں اور ان کے گرد لوگوں کا اجتماع ہے۔ ایک نورانی صورت کے بزرگ کے آس پاس زیادہ لوگ جمع تھے۔ وہ نہایت خوش الحانی سے تلاوت فرما رہے تھے۔ ہم بھی ان کے پاس جاکر کھڑے ہوگئے۔ سیاحوں کی کئی ٹولیاں وہاں کھڑی ہوئی تھیں۔ بٹ صاحب نے بڑے خشوع وخضوع سے آنکھیں بند کرکے سر جھکا لیا۔ ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوگئے اور جس جگہ وہ بزرگ وقفہ فرماتے، یہ فوراً" آمین داغ دیتے۔ ہمیں بھی انہوں نے "آمین" کہنے پر آمادہ کرلیا۔ قاسم نے آکر یہ منظر دیکھا..... تو بہت ہنسا اور بتایا کہ یہ حضرت دعا نہیں مانگ رہے بلکہ تقریر فرما رہے ہیں۔ آپ لوگ بلاوجہ آمین آمین کررہے ہیں۔

خاں صاحب باربار کہتے رہے کہ اگر تھوڑی سی عربی پڑھ لیتے تو یہ حماقتیں سرزد نہ ہوتیں۔

ہم نے کہا" خاں صاحب۔ تھوڑی سی عربی پڑھنے سے آپ کی یہ مشکل آسان نہیں ہوسکتی تھی۔ دراصل جدید عربی پرانی عربی سے کافی مختلف ہے اور لب لہجے کا جہاں تک تعلق ہے اس کا سمجھنا بھی کچھ آسان نہیں ہے۔"

بٹ صاحب نے کہا" دیکھئے خاں صاحب۔ یہ باربار عربی کی بات نہ کیجئے۔ یہ بے ادبی ہے۔"

"بے ادبی وہ کس طرح؟"

بولے" عربی سمجھنے کے لئے نہیں، صرف ادب سے سننے کے لئے ہوتی ہے۔ اگر سمجھنا چاہتے ہیں تو اردو ترجمہ پڑھ لیا کیجئے۔ کتنی عجیب سی بات ہے کہ کوئی قاری تلاوت کررہا ہے اور آپ اس میں معنی اور مطلب تلاش کررہے ہیں۔"

بٹ صاحب کے خیالات اور جذبات کے وہ خود مالک ہیں۔ ان میں کسی کے کہنے سے تبدیلی واقع نہیں ہوسکتی۔ ان کا خیال یہ ہے کہ عربی سمجھنا صرف عربوں کا کام ہے۔ دوسروں کو اس میں دخل نہیں دینا چاہیے۔

ایک نہایت شاندار عمارت دکھانے کے بعد قاسم نے بتایا یہ مدرسہ سلطان

حسین ہے۔ خاصی خوب صورت عمارت تھی۔ اگرچہ شکستگی کا شکار تھی۔ محرابیں بہت ستواں اورنازک تھیں۔ درمیان میں بہت بڑا اور وسیع صحن تھا۔ چاروں اطراف میں حجرے سے بنے ہوئے تھے۔

خاں صاحب نے پوچھا" یہاں کلاسیں کس وقت ہوتی ہیں؟"

ہم نے کہا"بھائی۔ یہ پرانے زمانے میں مدرسہ ہوا کرتا تھا۔ آج کل تو بس ایک تاریخی عمارت ہے۔"

"ٹھیک کہا آپ نے" قاسم نے بتایا" اس مدرسے میں ہزاروں طالب علم پڑھا کرتے تھے۔ دنیا کے دور دراز ملکوں سے بھی طلباء آیا کرتے تھے اور علماء سے مختلف علوم کی تعلیم حاصل کیا کرتے تھے۔"

ہم نے چشم تصور سے ان طلباء کے مودب ہجوم کو دیکھا۔ درمیان میں اونچی جگہ پر استاد مکرم بیٹھے ہیں اور علم وحکمت کے موتی لٹارہے ہیں۔ وہ مسلمانوں کے عروج کا زمانہ تھا۔ جب وہ محض تلوار ہاتھ میں لے کر اور گھوڑوں کی پشتوں پر سوار ہوکر ملک در ملک فتح کرتے نہیں پھرتے تھے بلکہ علوم اور سائنس میں بھی بڑا مقام رکھتے تھے۔ آج کے مغربی مفکر اور فلسفی ان کے تجربات سے فائدہ اٹھاکر اور تحقیق وتفتیش کرکے کہیں سے کہیں پہنچ گئے۔ اب ساری دنیا کے علوم اور سائنس کی تمام ایجادات مغرب میں ہوتی ہیں۔ ہم مسلمان صرف ان کو دیکھ دیکھ کر حیران ہوتے رہتے ہیں اور ان کی برکات سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ہمارے اس تصور کو ایک آواز نے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ دیکھا تو ایک عباپوش بزرگ سامنے کھڑے تھے۔ سر پر سفید عمامہ بندھاہوا تھا۔ چہرے پر بھری بھری داڑھی تھی۔ نہایت فصیح وبلیغ عربی بول رہے تھے۔ یوں لگا جیسے ہمارے سوالات کا جواب مل گیا اور قدرت نے ایک حکیم ودانا کو ہماری رہنمائی کے لئے بھیج دیا۔ اس نورانی پیکر کو دیکھ کرہم سب تو باادب ہوکرکھڑے ہوگئے۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ ان کی باتوں کے جواب میں کیا کہیں۔ آمین کہنا تو غالبا مناسب نہ تھا" جی ہاں' جی ہاں" کہہ سکتے تھے۔ان کی خوش الحانی اور قادر الکلامی میں کوئی کلام نہ تھا۔ کچھ دیر یہی کیفیت طاری رہی۔ اتنی دیر میں قاسم بھی لوٹ کر آگئے۔ وہ باہر بازار میں سگریٹ لینے گئے ہوئے تھے۔ ان بزرگ کی گفتگو سنی تو عربی میں ان سے مصروف تکلم ہوگئے۔ دوچار فقروں کے بعد بات چیت کا سلسلہ ختم ہوگیا اور وہ بزرگ "اہلا" وسہلا" کہہ کر رخصت ہوگئے۔ ہمارا تو خیال تھا کہ کسی حجرے کی سمت جائیں گے مگر وہ بیرونی دروازے سے باہر نکل گئے۔ ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے مدرسہ خالی خالی ساہوگیا۔ لمحہ بھرکیلئے علم وعرفان کی جوبارش ہوئی تھی وہ یک لخت بند ہوگئی پھر وہی ویرانی تھی اور ہم چاروں۔ اس وقت تو مدرسے میں کوئی دوسرا سیاح تک نہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ سیاح حضرات اس مدرسے کا ذرا کم ہی رخ کرتے تھے کیونکہ مسجدوں میں تو وہ ہمیں کافی تعداد میں نظر آئے لیکن مدرسے میں کوئی ایک بھولا بھٹکا سیاح بھی دیکھنے کو نہیں ملا۔

ہم نے قاسم سے پوچھا" یہ کون بزرگ تھے۔ اتنی اچھی عربی میں تقریر فرما رہے تھے۔ کاش ہم ان کی باتیں سمجھ سکتے۔"

قاسم مسکرایا' کہا"ایسے بزرگ گردونواح میں کافی تعداد میں مل جاتے ہیں۔"

پوچھا"کیا یہ تبلیغ کرتے ہیں یا سیاحوں کو تعلیم دیتے ہیں؟"

بولا"یہ صرف ترغیب دیتے ہیں۔"

"کس بات کی؟"

"نائٹ کلبوں میں چلنے کی۔"

"لاحول ولاقوۃ" بٹ صاحب کی زبان سے بے اختیار نکلا۔

"یہ صاحب ایک نائٹ کلب کے ایجنٹ ہیں۔ آپ لوگوں کے سامنے اس کی خوبیاں بیان کررہے تھے۔"

ہم نے کہا"مگر انکی زبان کون سمجھتاہوگا؟"

کہنے لگا"جو نہیں سمجھتا' یہ اس کا ہاتھ تھام کر ساتھ لے جاتے ہیں اور بخوبی سمجھادیتے ہیں۔"

اس قدر نورانی چہرہ اس قدر غیراخلاقی کام؟

خاں صاحب نے اس مسئلے پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا "اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے؟ قاہرہ میں اور بھی بہت سے غلط کام ہوتے ہیں۔ چوریاں' ڈاکے'

بدمعاشیاں، عیاشیاں، ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ اسی لباس اور اسی زبان میں کیاجاتاہے۔ آپ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ آپ قاہرہ میں ہیں۔ عربی ان لوگوں کی مادری زبان ہے۔ یہ لباس جو ہمارے ملک میں عالم اور خطیب جمعے کے خطبے کیلئے زیب تن کرتے ہیں یہ ان کا روز مرہ کا لباس ہے جیسے انگریزوں کا لباس کوٹ پتلون ہے۔ یاہم لوگ شلوار قمیض پہنتے ہیں۔"

بات تو بالکل درست اور معقول تھی مگرپھر بھی کچھ بے یقینی سے رہی۔

قاسم ہمیں "باب النصر" دکھانے لے گیا۔ کسی زمانے میں بہت پرشکوہ عمارت رہی ہوگی۔ مگر اب شکست وریخت کا شکار ہے۔ یقیناً کسی فتح کی یادگار کے طور پر یہ دروازہ تعمیر کیاگیاہوگا۔ تب ہی تو "باب النصر" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ گیارہویں صدی میں بنایاگیاتھا۔ پرانے زمانے میں فتوحات کی یادگاریں تعمیر کی جاتی تھیں۔ اب وہ رواج باقی نہیں رہا۔ شاید یہ وجہ بھی ہے کہ اول تو اتنی جنگیں نہیں ہوتیں مثلاً" جنگ عظیم میں امریکا اور اتحادیوں کو فتح حاصل ہوئی مگر خود فاتح ملکوں کا حال بھی مفتوح سے کچھ بہتر نہ تھا۔ دونوں ہی برباد اور تباہ حال تھے۔اب کوئی یادگار بناتا توکس بل بوتے پر بناتا؟ پھربھی یورپ والوں نے فتح کی یادگاریں تعمیر کیں مگر دیکھنے والوں کو مزہ نہ آیا۔

"باب النصر" کے پاس ہی مسجد الحلیم واقع ہے۔ یہ بھی اب محض دیکھنے دکھانے کی چیز رہ گئی ہے۔ نہ کوئی اسکالر نظر آیا نہ استاد۔ چند مانگنے والے البتہ پیچھے پڑ گئے اور عربی میں دست سوال دارز کرتے رہے۔ ہم سب نے احتراماً ان سب کو چند پیاسٹر دے دیے

قاسم نے فوراً" ٹوکا" یہ کیاغضب کردیا"

ہم نے گھبراکر پوچھا"کیوں کیا ہوا"

قاسم کے جواب دینے سے پہلے مسجد کے درو دیوار نے ہمارے سوال کا جواب فراہم کردیا۔ جب ہرطرف سے مانگنے والوں کا تانتا سا بندھ گیا۔ ٹخنوں تک عباؤں میں ملبوس۔ پیروں اور سروں سے ننگے، کم عمرلڑکوں کا ایک غول بیابانی تھا۔جو "یااخی، یا اخی" پکارتا ہوا ہمارے تعاقب میں تھا۔ خدا جانے یہ سب لوگ چمگادڑوں کی طرح کہاں چھپ کر بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک نمودار ہوگئے۔ بڑی مشکل سے ہم مسجد سے باہر نکلے۔ باہر گلی میں بھی دور تک انہوں نے ہمارا پیچھا کیا۔

خان صاحب نے کہا"اسلام نے اسی لیے بھیک مانگنے اور بھیک دینے کی مخالفت کی ہے۔"

ہم نے قاسم سے پوچھا"اتنے بہت سارے فقیر یہاں کیسے اکٹھے ہوگئے کیا آس پاس میں ان کا کوئی ہیڈ کوارٹر ہے؟؟"

وہ ہنسنے لگا، بولا"یہ فقیر تو نہیں ہیں۔ ایسے ہی آوارہ گردی کرتے رہتے ہیں۔ کسی کو بھیک دیتے ہوئے دیکھتے ہیں تو سوچتے ہیں کہ مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے؟گویا آپ انہیں پیشہ ور فقیر نہیں کہہ سکتے۔پارٹ ٹائم مانگنے والے کہہ سکتے ہیں۔"

ویسے قاہرہ میں فتوحات کے حوالے سے ایک اور دروازہ بھی ہے۔ جس کا نام "باب الفتوح" ہے اس زمانے میں مسلمانوں کی فتوحات اتنی زیادہ تھیں کہ اگر ان کی یادگار کے طور پر دروازے بنائے جاتے تو قاہرہ میں سینکڑوں دروازے نظر آتے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کے فاتح اپنی فتوحات کا ڈھول پیٹنے کے اتنے زیادہ شوقین نہیں تھے اور پھر جو چیز معمول میں داخل ہوجائے اس کا جشن کیا منایاجائے؟

جہاں تک تاریخی یادگاروں اور عمارتوں کا تعلق ہے ہمارا خیال ہے کہ قاہرہ اور مصران سے لبالب بھرا ہوا ہے۔ ہرقدم پر کوئی تاریخی عمارت یا تاریخی یادگار موجود ہے اور افسوسناک بات یہ ہے کہ ان کی دیکھ بھال اور نگرانی پر بھی زیادہ توجہ نہیں دی جاتی۔ یورپ کے شہروں میں قدیم گرجاگھروں کو بہت اچھی حالت میں رکھاگیاہے۔ ان کے گردونواح میں سیاحوں کی دلچسپی اور تفریح کا سامان فراہم کیاگیا ہے۔ مگر قاہرہ میں یہ بات دیکھنے میں آئی ۔ حالانکہ سیاح یہاں بھی کچھ کم نہیں آتے۔ یا پھر شاید محکمہ سیاحت کا یہ خیال ہے کہ کیونکہ سیاحوں کی بہت بڑی تعداد مغرب سے آتی ہے، اس لئے وہ شاید مساجد میں زیادہ دلچسپی نہیں لیں گے۔ ورنہ مساجد کی قاہرہ میں کمی نہیں ہے۔ ان کو اگر بناسنوار کر رکھا جائے اور ان کے آس پاس کے علاقوں کو صاف ستھرا بنادیاجائے۔ تو یہ بھی سیاحوں کی دلچسپی کا مرکز بن سکتے ہیں۔

مساجد کی تعمیر میں بڑی خوبصورتی، نزاکت اور نفاست پائی جاتی ہے جو دیکھنے

والوں کو محسور کردیتی ہے۔ یہ مسجدیں مختلف ادوار میں تعمیر ہوئی ہیں اور مختلف حکمرانوں کی تعمیر کی ہوئی ہیں اس لئے طرز تعمیر میں فرق بھی نمایاں ہے۔ عربوں کی بنائی ہوئی مساجد، ترکوں کی بنائی ہوئی مساجد سے قدرے مختلف ہیں۔ قاہرہ کے وسط میں ''مسجد ابن طلبون'' بہت پرانی عمارت ہے مگر دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ مسجد 827 میں ترک گورنر کے حکم پر بنائی گئی تھی اور اس عہد کے خلیفہ کے نام سے مشہور ہوئی۔

خان صاحب نے فرمایا'' ہمیں تومعلوم ہی نہیں تھا کہ ابن طلبون بھی کوئی خلیفہ تھا۔ ہم تو بس ابن خلدون ہی کے نام سے واقف ہیں۔''

ہم نے کہا''مگر ابن خلدون خلیفہ نہیں تھا۔''

بولے ''بھائی، اب ہم اتنے جاہل بھی نہیں کہ ابن خلدون کو بھی نہ جانیں۔ وہ بڑا فلسفی اور عالم تھا۔ سائنس دان بھی تھا۔''

''اس نے ایجاد کیا کیا تھا؟'' بٹ صاحب نے پوچھا۔

خان صاحب سر کھجانے لگے، پھر بولے''اس زمانے میں سائنس دان ایجادیں نہیں کرتے تھے۔ صرف فارمولے دریافت کرتے تھے۔

قاہرہ کی قدیم یادگاروں میں جدید ترین عمارت مسجد محمد علی ہے۔ یہ مسجد 1848ء میں تعمیر ہونی شروع ہوئی تھی۔1857ء میں مکمل ہوئی۔ یونانی ماہر تعمیر نے اس کا نقشہ بنایا تھا۔

خان صاحب نے بڑے غور سے اس کا معائنہ کیا پھر بولے''نہ تو یہ یونانی لگتی ہے اور نہ ہی اتنی نئی نظر آتی ہے۔''

بٹ صاحب نے کہا'' کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہم لوگوں نے اتنی بہت سی مسجدیں دیکھ لی ہیں مگر کسی ایک مسجد میں نماز پڑھنے کی توفیق نہیں ہوئی۔''

واقعی بہت شرمندگی کی بات تھی۔ گھڑی دیکھی اور پھر خاں صاحب نے قاسم سے پوچھا''کیوں بھائی، ابھی نماز کا وقت ہے یا نہیں؟''

اس نے پوچھا''کون سی نماز کا؟''

ہم نے کہا''کسی نماز کا تو وقت ہوگا؟''

اس نے بڑی سادگی سے کہا''مجھے اچھی طرح معلوم نہیں ہے۔ ٹھہریئے، کسی سے پوچھ کر بتاتا ہوں۔''

ہم نے کہا'' اس کی ضرورت نہیں ہے۔ نفل تو کسی وقت بھی پڑھے جاسکتے ہیں۔''

اب سوال یہ تھا کہ وضو کہاں سے اور کیسے کیا جائے۔ مسجد کے صحن میں جو حوض تھا، وہ خشک پڑا تھا۔ آس پاس کوئی نلکا یا پائپ ہی نظر نہیں آیا۔ مسجد کے باہر والی گلی میں ایک قہوہ خانہ نظر آیا۔ ہم لوگ آستین چڑھائے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ ایک نوعمر عباپوش ویٹر نے''اہلا''وسہلا'''' کہتے ہوئے ایک خالی میز کی طرف اشارہ کیا مگر ہم نے اس سے اشارے سے پوچھا کہ منہ ہاتھ دھونے کی جگہ کہاں ہے۔ کچھ دیر تو وہ ہمارے اشارے دیکھتا رہا اور خاموش رہا۔ اس کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

ہم نے کہا''اس سے تو بہتر تھا کہ قاسم کو ساتھ لے آتے۔ وہ مسجد میں بیٹھا کیا کررہا ہے!''

بولے'' وہ کبوتروں کی تصویریں بنارہا ہے۔''

بٹ صاحب بولے''ہم تو اشارے ہی کرتے رہ جائیں گے اور نماز کا وقت نکل جائے گا۔''

''ہم نے کہا ہم نفل پڑھنے جارہے ہیں۔ وہ کسی وقت بھی پڑھے جاسکتے ہیں۔''

جب ہم عباپوش ویٹر سے بالکل مایوس ہوکر واپس لوٹنے والے تھے اس وقت ایک کیم شحیم عمامہ پوش بزرگ تشریف لے آئے۔ وہ استقبالیہ کی میز پر بیٹھے کافی دیر سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔

آخر انگریزی میں پوچھا''یووانت توایلت'' (آپ کو ٹائلٹ کی ضرورت ہے؟

ہم نے فوراً اثبات میں سرہلادیا۔ وہ ہمیں بازو سے پکڑ کر ایک جانب لے گئے۔ یہ غسل خانہ تھا۔ بلکہ حمام سمجھ لیجئے۔ ایک جانب نل بھی لگا ہوا تھا۔ ہم سب نے باری باری وضو کیا۔ ان بزرگ کا انگریزی میں شکریہ ادا کیا اور بھاگے بھاگے مسجد کی طرف گئے۔ دیکھا کہ نہ صفیں نہ قالین، نہ جائے نماز، لے دے کر مسجد کا فرش ہی تھا جس پر کبوتروں کی بیٹیں پڑی ہوئی تھیں۔ خاں صاحب نے کچھ پس وپیش کیا مگر بٹ

صاحب نے فوراً" ایک مسئلہ پیش کردیا' کہنے لگے "مسجد کی ہر جگہ پاک ہوتی ہے اور کبوتر تو ویسے بھی مقدس جانور ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ ہر مسجد' درگاہ اور مزار پر کبوتروں کا جمگھٹا ہوتا ہے۔"

خان صاحب نے کہا" آپ کی دوسری باتیں تو خیر کسی حد تک درست ہیں مگر آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ کبوتر جانور نہیں' پرندہ ہوتا ہے۔"

"تو پھر کیا ہوا۔ ایک ہی بات ہے۔"

"جی نہیں ۔ ایک بات نہیں ہے۔ پرندے کے پر ہوتے ہیں اور وہ ہوا میں اڑ سکتا ہے جبکہ جانور کی ٹانگیں ہوتی ہیں اور وہ زمین پر دوڑتا ہے اور چلتا ہے۔ حیرت ہے کہ آپ کو پروں اور ٹانگوں میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔"

بحث میں پڑنے کا وقت نہیں تھا اس لیے صحن مسجد میں ہی نفل ادا کرنے کھڑے ہوگئے اور دل کو عجیب سا سکون ملا۔ قاسم نے کبوتروں کی طرف سے توجہ ہٹاکر ہماری تصویریں اتارنی شروع کردیں۔ اس مسجد کے کبوتر بھی خاصے بے تکلف تھے۔ نماز کے دوران میں وہ ہمارے سروں اور کندھوں پر بیٹھتے رہے۔

سلام پھیرنے کے بعد بٹ صاحب نے بلند آواز میں درود ریف پڑھا اور پھر بولے "پتا نہیں ہماری نماز قبول ہوگی یا نہیں۔ میرا دھیان تو سارا وقت کبوتروں کی طرف ہی لگا رہا۔"

خاں صاحب نے کہا"بٹ صاحب۔ آپ بھول رہے ہیں کہ کبوتر مقدس جانور ہے۔ آپ کے ساتھ ساتھ اس کی بھی نماز ہوگئی۔ یعنی دوگنا ثواب۔"

"بیان القصریان" قاہرہ میں ایک معروف جگہ ہے۔ قاسم کا اصرار تھا کہ آپ وہ جگہ ضرور دیکھیں۔

"وہ کوئی عمارت ہے؟"

"جی نہیں۔ وہ زمانہ قدیم کا نیلام گھر ہے۔"

"نیلام گھر جاکر کیا کریں گے؟" خان صاحب نے دبی زبان سے کہا۔

وہ ایک زمانے میں غلاموں کی مارکیٹ تھی ۔ وہاں کنیزوں اور غلاموں کی خرید وفروخت ہوا کرتی تھی۔"

یہ سنتے ہی بٹ صاحب اور خاں صاحب کے کان کھڑے ہوگئے۔"پھر تو وہ جگہ ضرور دیکھنی چاہیے۔"

ہم نے کہا " مگر اب وہ غلام اور کنیزیں نہیں ہوتیں وہ تو بیچتے تھے دوائے دل
وہ دکان اپنی بڑھا گئے۔

مگر وہ مچل گئے" ہم نے کبھی غلاموں کی مارکیٹ نہیں دیکھی۔ دیکھنی تو چاہیے کہ کیسی ہوتی ہے؟"

چلئے ۔ غلاموں کی مارکیٹ چلتے ہیں۔ کسی زمانے میں بڑی رونق اور چہل پہل کی جگہ ہوتی ہوگی ۔ قاسم نے اس کا نقشہ کھینچ کر دکھایا کہ چاروں طرف کمرے یا حجرے ہوا کرتے تھے ۔ درمیان میں ایک چبوترہ سا ہوتا تھا۔ جس پر باری باری غلاموں اور کنیزوں کی نمائش کی جاتی تھی۔ اور فروخت کرنے والا ان کی خوبیاں بیان کرتا تھا۔ جسمانی حسن وجمال کے علاوہ ان کی دیگر خوبیوں کا بیان بھی بہت تفصیل کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ کہ یہ کنیز کس قدر اچھی مغنیہ ہے' رقاصہ ہے' سگھڑ اور تعلیم یافتہ ہے۔ کتنی اچھی باتیں کرتی ہے۔ آداب محفل سے پوری طرح آشنا ہے۔ اسی طرح مردوں کے بارے میں ان کی عقلمندی' دانائی اور طاقت وبہادری کا بیان ہوتا تھا۔ ان ہی غلاموں میں ایسے لوگ بھی ہوا کرتے تھے۔ جو آگے چل کر افواج کے سپہ سالار اور ملکوں کے حکمران بن گئے ۔ ایک خاندان غلاماں تو ہمارے ہندوستان میں بھی ہوا کرتا تھا۔

"کیا جدامجد کو بھی اسی بازار میں خریدا گیا تھا" بٹ صاحب نے سوال کیا۔

"یار' کبھی تو عقل کی بات بھی کرلیا کرو۔ اس زمانے میں ہر ملک میں غلاموں کے بازار ہوا کرتے تھے۔"

"اچھا!" وہ حیران ہوکر بولے"اتنے بہت سے غلام اور کنیزیں آیا کہاں سے کرتے تھے؟"

"فیکٹریوں سے " خاں صاحب نے جل کر کہا"ہر ملک میں بہت بڑے بڑے کارخانے ہوا کرتے تھے جن میں غلام اور کنیزیں بنائے جاتے تھے اور باہر کے ملکوں کو

بھی برآمد کیے جاتے تھے۔"

"مجھے اتنا بے وقوف نہ سمجھیں؟" بٹ صاحب مسکرائے "فیکٹریوں میں آدمی نہیں بنتے۔ کیا یہ مجھے معلوم نہیں ہے۔"

"تو پھر غلام کہاں سے آیا کرتے تھے؟" خاں صاحب نے پوچھا۔

وہ سوچ میں پڑ گئے پھر بولے۔ "بھائی بازاروں میں بکنے کے لیے سامان کہاں سے آتا ہے' وہیں سے یہ لوگ بھی آتے ہوں گے۔"

خاں صاحب نے انہیں بتایا کہ اس زمانے میں جنگیں بہت ہوا کرتی تھیں اور جنگ میں جو فاتح ہوا کرتا تھا' وہ مفتوحہ ملک کے لوگوں کو غلام اور کنیزیں بنالیا کرتا تھا۔ یہ غلام اور کنیزیں فوجیوں میں تقسیم کردیے جاتے تھے۔ وہ چاہتے تو اپنے پاس رکھ لیتے یا انہیں فروخت کردیتے تھے۔ شاہی خاندان کے لوگوں کو بھی نہیں بخشا جاتا تھا۔"

ہم نے کہا "دنیا نے بہت ترقی کرلی ہے۔ جنگیں تو آج بھی ہوتی ہیں مگر لوگوں کو غلام یا کنیزیں نہیں بنایا جاتا۔"

چنانچہ اس تمہید کے بعد قاسم کی قیادت میں ہم لوگ غلام مارکیٹ دیکھنے چل پڑے۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا مگر دو ٹیکسیاں کرائے پر حاصل کی گئیں۔

خاں صاحب نے قاسم سے کہا "بھئی یہ ٹیکسی والا آپ کا ہم زبان اور ہم قوم ہے۔ اس سے کہو کہ ایک سواری زیادہ بٹھالے۔ تھوڑی دور کی تو بات ہے۔"

قاسم نے کہا "بلاوجہ شرمندہ ہونے کا کیا فائدہ ۔ وہ یہ بات ہرگز نہیں مانے گا۔"

ہم چند سڑکوں سے گزرتے ہوئے غلام مارکیٹ پہنچ گئے۔ جس ٹیکسی میں قاسم ' خاں صاحب اور ہم سوار تھے۔ اس کا ڈرائیور انتہائی باتونی تھا۔ کیامجال جو ایک منٹ کے لئے بھی اس کی زبان تالو سے لگی ہو۔ ریڈیو پر اس نے ام کلثوم کے نغمات چھیڑ رکھے تھے مگر گانا سننے کے بجائے باتیں کرنے میں مصروف تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ ام کلثوم کے گانے کی خوبیاں بیان کررہاہے۔ جب ہم منزل مقصود پر پہنچے تو اس نے قاسم سے دریافت کیا کہ ہم لوگوں نے ام کلثوم کے نغمات کیسے لگے؟

ہم نے کہا "بھائی اس شخص نے ام کلثوم کی آواز سننے کا موقع ہی نہیں دیا اپنی آواز ہی سناتا رہا۔ ویسے ہمارے ملک میں بھی ایک ایسی ہی گلوکارہ ہے جن کا نام ملکہ ترنم نورجہاں ہے۔"

قاسم نے پوچھا "کیا انہوں نے جنگی نغمے بھی گائے ہیں۔ ام کلثوم کی طرح؟"

ہم نے کہا" انہوں نے 1965ء کی جنگ میں بہت سے نغمات گائے اور اتنے اچھے گائے کہ فوجیوں میں جوش و خروش پھیل گیا۔ وہ مورچوں میں بھی ان نغمے سنا کرتے تھے اور بہت بہادری سے لڑتے تھے۔"

خاں صاحب نے کہا" ان کے گائے ہوئے نغمے اتنے اچھے تھے کہ دشمنوں کے فوجی بھی انہیں سن کر لڑتے تھے۔"

قاسم حیران رہ گیا" یہ کیا بات ہوئی۔ آپ کے نغمے سن کر دشمن کیسے جوش میں آجاتے؟؟"

ہم نے کہا "بھئی نغموں میں کسی کا نام تو ہوتا نہیں تھا۔ ہماری اور ہندوستان والوں کی زبانیں بھی ایک جیسی ہیں۔ ہندوستانی فوجی یہ فرض کرلیتے تھے کہ یہ نغمے نورجہاں نے ان کے لئے گائے ہیں۔"

"یہ تو بہت عجیب بات ہے" قاسم نے کہا "جنگی نغمے تو ام کلثوم نے بھی گائے ہیں مگر دشمنوں کے لئے ' وہ بے کار تھے۔"

خاں صاحب نے اردو میں کہا" پھر بھی انہیں سن سن کر تمہارے دشمن جیت گئے اور تمہارے فوجیوں پر کوئی اثر نہ ہوا۔"

ہم نے قاسم کو اس فقرے کا ترجمہ نہیں بتایا۔ بلاوجہ زخموں کو ہرا کرنے سے فائدہ؟

غلام مارکیٹ کے آس پاس بازار اور دکانیں تھیں مگر درمیان میں ایک چبوترہ نما جگہ ابھی تک باقی تھی ۔ ایک جانب کچھ پرانے کمروں یا حجروں کے کھنڈرات بھی نظر آرہے تھے۔ مگر چبوترے پر نہ غلاموں اور کنیزوں کے جمگھٹے تھے اور نہ ہی خریداروں اور بولی لگانے والوں کا ہجوم تھا لیکن یہ کمی چند ہی جوڑوں نے پوری کردی تھی جو چبوترے کے مختلف کونوں میں بیٹھے ہوئے تھے' یہاں تک کہ غلاموں کی مارکیٹ میں

بھی نظر آگئے۔

خاں صاحب نے ایک چکر لگا کر ان سب کا بغور جائزہ لیا پھر یہ خیال کیا کہ وہ لڑکیاں اچھی شکل کی ہیں اگر صاف ستھرا لباس پہن کر تھوڑی بن سنور جائیں تو پریاں نظر آئیں۔

ہم نے کہا" آپ کی نظر کی داد دینی چاہیے کہ ہپیوں میں بھی آپ نے پریاں تلاش کرلی ہیں۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ صورت شکل کے اعتبار سے لڑکیاں خاصی دلکش تھیں۔ دراز قامت، گورے رنگ، سنہرے یا بھورے بال، جسم بھی پر کشش اور متناسب حالانکہ انتہائی بے ڈھنگے کرتوں میں ملبوس تھیں۔ کرتا اور جینز ہپی لڑکیوں کا پسندیدہ پہناوا تھا۔ کبھی کبھی مقامی لباس میں بھی نظر آتی تھیں۔ پاکستان میں شلوار قمیض میں ملبوس ہپی لڑکیاں آپ نے بھی دیکھی ہوں گی۔ ان میں سے بھی ایک لڑکی نے لمبا سادہ لبادہ پہن رکھا تھا۔ پیروں میں ربر کی چپلیں تھیں۔ تمام ہپیوں میں ایک خصوصیت مشترک تھی گندگی، نہانا تو خیر ان کے مسلک میں ممنوع ہی تھا۔ مگر ہاتھ منہ دھونا بھی گناہ کبیرہ سے کم نہ تھا۔کم از کم ہم نے کبھی کسی ہپی کو منہ دھوتے ہوئے نہیں دیکھا۔یہ بھی غنیمت تھا کہ یہ لڑکیاں گوری چٹی ہوا کرتی تھیں اس لئے چہروں کی چمک دمک اور آب و تاب ہرحال میں برقرار رہتی تھی۔ اگر کالی کلوٹی قوموں سے ان کا تعلق ہوتا تو شاید بھتنیاں اور چڑیلیں ہی نظر آتیں۔ اللہ نے دنیا والوں پر بہت کرم فرمایا تھا کہ ہپی بننے کی توفیق گورے گوریوں کے سوا کسی اور نسل کے لوگوں کو عطا نہیں فرمائی۔بقول خاں صاحب کہ "اللہ تعالیٰ کا کوئی کام مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔"

خاں صاحب کو قاسم کچھ دیر تک غلاموں کی مارکیٹ کے بارے میں سنی سنائی باتیں سناتا رہا۔ چند واقعات بھی سنائے کہ بعض غلاموں اور کنیزوں نے کس قدر عروج حاصل کیا تھا اور کون کون سے خلفا کی منظور نظر بن کر انہوں نے حکمرانی کی تھی مگر خاں صاحب کی توجہ ہپیوں کی طرف لگی ہوئی تھی۔ ہپیوں کی ڈھٹائی اور بے خوفی ملاحظہ ہو کہ کھلے عام بیئر کے ڈبوں سے منہ لگا کر مشروب پی رہے تھے اور سگریٹوں کا دھواں اڑا رہے تھے۔ آس پاس سے گزرنے والے ان پر ایک نگاہ غلط ڈال کر آگے بڑھ

جاتے۔ انکے پاس کھڑے ہو کر گھورنے کی زحمت گوارا نہ کرتے ۔ اگر ہمارے ملک میں یہ نظارہ ہوتا تو تماشائیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے۔

خاں صاحب ہپیوں سے باتیں کرنے کیلئے بہت بے تاب نظر آرہے تھے۔ پوچھا' آخر اس بے تابی کا سبب کیاہے' بولے" اچھی انگریزی بولے ہوئے بہت دن ہوگئے ہیں ۔ کتنے دنوں کے بعد تو کچھ گورے نظر آئے ہیں۔ کیونکہ ان کے ساتھ تھوڑی دیر بات چیت کرلی جائے۔"

"مگر بات کیا کریں گے؟"

"اہرام کے بارے میں ان کے تاثرات معلوم کریں گے۔"

بہرحال ' وہ ٹہلتے ہوئے ان کے نزدیک پہنچ گئے۔ ایک ٹھگنے قد کا لڑکا اور لمبے قد کی لڑکی جو فرش پر کہنیاں ٹیکے سگریٹ کے کش لگانے میں مصروف تھے انہیں خاں صاحب نے اچھی انگریزی بولنے اور سننے کیلئے منتخب کرلیا۔ پہلے ان کے پاس جاکر کھڑے رہے پھر انہیں مخاطب کیا"ہیلو۔ آریو ٹورسٹ؟" (کیا آپ سیاح ہیں؟)

لڑکے نے بڑی اعتنائی سے انہیں دیکھا اور بولا "نہیں 'ہم ہپی ہیں۔"

"ایک ہی بات ہے۔ ٹورسٹ بھی دنیا دیکھتے پھرتے ہیں اور ہپی بھی۔"

وہ کہنے لگے۔"مگر ٹورسٹ پیسے خرچ کرکے دنیا دیکھتے ہیں۔ہم خرچ کیے بغیر دیکھتے ہیں اور دیکھنا' دیکھنا ہمارا مقصد بھی نہیں ہے۔ ہم تو بس آزادی کا نعرہ لگاتے ہیں۔"

خاں صاحب نے کہا" آپ کو پتا ہے کہ جس جگہ آپ اس وقت بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ سلیو مارکیٹ ہوا کرتی تھی۔ یہاں غلام مرد اور عورتیں فروخت ہوتی تھیں۔"

لڑکا دونوں شانے اچکا کر رہ گیا۔لڑکی نے برا سامنہ بنایا اور کہا "کس قدر خوفناک بات ہے۔ ہم لوگ اسی لئے جنگوں کے خلاف ہیں۔ ہم کہتے ہیں ' جنگ نہ کرو۔ محبت کرو۔ اگر ساری دنیا اس فلسفے پر عمل کرنے لگے تو یہ کتنی اچھی جگہ بن جائے۔"

بٹ صاحب نے کہا"میرا خیال ہے کہ ہمیں بھی ان کے پاس چلنا چاہیے۔"

"کس لیے؟"

"اگر خاں صاحب انگریزی میں فیل ہونے لگیں تو ہم ان کی مدد کریں گے۔"

ہم نے کہا "صاف کیوں نہیں کہتے کہ اس خوبصورت لڑکی دیکھنا چاہتے ہو' قریب سے۔"

بولے "خیر اتنی زیادہ خوبصورت بھی نہیں ہے۔ گورے رنگ کے سوا اس میں رکھا ہی کیا ہے۔"

ہم لوگ ان کے نزدیک پہنچے تو خاں صاحب انہیں فرعونوں اور اہرام کے بارے میں بتا رہے تھے۔ وہ خاموشی سے سرہلاتے رہے۔ قاسم نے بھی حتی المقدور انہیں مصری تاریخ کے بارے میں بتانے کی کوشش کی۔ ہم نے کہا بھی کہ بلاوجہ وقت ضائع کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ بھلا ہپیوں کو مصر کی قدیم تاریخ سے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے مگر قاسم نے کہا کہ ایک اچھے مصری کی حیثیت سے میرا فرض ہے کہ غیر ملکیوں کو اپنے ملک اور اپنی قدیم تہذیب کے بارے میں بتاؤں۔ ہم لوگ بھی فرش پران کے پاس ہی بیٹھ گئے۔ کافی دیر تک تاریخ کا یہ سبق جاری رہا اور وہ دونوں غور سے سنتے رہے اور سرہلاتے رہے۔ ان کا انہماک دیکھ کر قاسم صاحب نے کچھ زیادہ ہی لن ترانی شروع کردی لیکن صاف نظر آرہا تھا کہ ان کی توجہ فراعنہ اور قدیم مصر کی تہذیب سے زیادہ خوش شکل لڑکی کی طرف تھی جو اپنے عجیب وغریب حلیے کے باوجود اچھی لگ رہی تھی۔۔ خدا خدا کرکے قاسم صاحب درمیان میں سانس لینے کو رکے تو ہپی صاحب نے سگریٹ کا ایک کش لگایا اور انہیں یہ بتانا شروع کردیا کہ فرعونوں کے زمانے سے بھی پہلے مصری تہذیب کیا تھی۔ ان لوگ اس علاقے پر حکمرانی کیا کرتے تھے۔ پہلے تو ہم یہی سمجھے کہ حضرت نشے کی ترنگ میں بڑبڑا رہے ہیں مگر کچھ دیر بعد احساس ہوا کہ وہ تو باقاعدہ لیکچر دے رہے ہیں اور وہ اس میں حق بجانب بھی تھے کیونکہ ہپی بننے سے پہلے وہ فلوریڈا یونیورسٹی میں قدیم تاریخ پڑھایا کرتے تھے۔ جب ان کی ساتھی نے یہ معلومات فراہم کیں تو ہم سب واقعی مرعوب ہوکررہ گئے۔ وہ کچھ دیر اپنا لیکچر پلاتے رہے پھر بہت بزرگانہ انداز میں بولے کہ میرے عزیزو' ریت اور پتھر کی ان یادگاروں میں کچھ نہیں رکھا ہے۔ اگر ان کی اصلیت جاننا چاہتے ہو تو کتابیں پڑھو۔

قاسم کو ان کا یہ مشورہ پسند نہیں آیا۔ بولا۔ "خود اپنی آنکھوں سے کوئی چیز دیکھنے میں جو بات ہوتی ہے' وہ کتاب پڑھنے سے تو حاصل نہیں ہوتی۔"

ہپی پروفیسر نے جواب دیا۔ "دیکھنے والے کی آنکھ پتھروں کے پیچھے نہیں دیکھ سکتی۔ جبکہ پڑھنے والی نگاہ حقائق کی گہرائیوں تک پہنچ جاتی ہے۔ جو لوگ یہاں تماشا دیکھنے آتے ہیں' وہ گائیڈز کی جھوٹی سچی گپوں سے زیادہ کچھ نہیں جان سکتے۔ اصلیت انکی نظروں سے بھی پوشیدہ رہتی ہے۔ ہاں سیرو سیاحت کے لئے گھومنے پھرنے کی بات اور ہے۔"

پروفیسر ہپی کی ساتھی لڑکی غالباً" اس گفتگو سے بور ہوچکی تھی۔ اس نے ایک لمبی سی انگڑائی لی اور پروفیسر صاحب سے کہا۔ "ہنی۔ اب ہمیں کہیں اور چلنا چاہیے۔ تم شاید بھول گئے ہو کہ تم اس وقت فلوریڈا یونیورسٹی کی کلاس میں نہیں پڑھا رہے ہو۔ اپنی دنیا میں واپس آجاؤ۔"

پروفیسر صاحب نے بڑی سعادت مندی سے اپنا تھیلا سنبھالا اور ہم لوگوں کو "بائی" کہہ کر لڑکی کے ساتھ قاہرہ کی سڑکوں میں گم ہوگئے۔

بٹ صاحب کچھ دیر تک ان لوگوں کو جاتے ہوئے دیکھتے رہے پھر بولے۔ "اتنے قابل اور لائق فائق آدمی کو ہپی بننے کی کیا ضرورت تھی؟"

ہم نے کہا" وہ علم وعرفان کی اس منزل تک پہنچ چکا ہے کہ اگر ہپی نہ بنتا تو شاید پاگل ہوجاتا۔ تاریخ کی کتابوں میں بھلا وہ نشہ اور لذت کہاں ہوسکتی ہے جو اس کی ہم سفر میں ہے۔"

آج کے دن کیلئے کافی سیاحت ہوچکی تھی ابوالقاسم نے ہمیں اتنی بہت سی مسجدیں دکھادی تھیں کہ ہمیں انکے نام تک ٹھیک سے یاد نہیں رہے تھے مگر ان کا اصرار تھا کہ ابھی بہت سی مسجدیں باقی ہیں جنہیں دیکھنا بہت ضروری ہے۔

خاں صاحب تنگ آکر بولے۔ "بھائی صاحب۔ ہمیں ان مسجدوں کو دیکھنے سے سوائے عبرت کے کیا ملا ہے جو باقی مسجدوں کو دیکھ کر حاصل ہوجائے گا۔"

قاسم نے کہا "سلطان محمد شاہ کی مسجد تو کم ازکم دیکھ ہی لو۔ یہاں سے نزدیک ہی ہے۔ ہم پیدل ہی وہاں پہنچ جائیں گے۔"

مرتا کیا نہ کرتا۔ ہم ان کے شہر میں تھے اور وہ ہمارے راہبر تھے۔ مجبوراً ان کے پیچھے چل پڑے۔ پرانے شہر کے راستے الف لیلہ کی داستانوں کی یادیں تازہ کررہے تھے۔ بے پردہ اور باپردہ خواتین بھی سڑکوں پر محو خرام نظر آئیں مگر پردے کا انداز تھا کہ باریک کپڑے سے چہرے کا نیچے کا نصف حصہ ڈھکا ہوا تھا۔ جگ مگ کرتی سیاہ آنکھیں اور دمکتی ہوئی پیشانیاں صاف نظر آرہی تھیں اور اسکرٹ کے نیچے ٹانگیں بھی ننگی تھیں۔ یہ بھی پردے کا ایک انداز ہے!

سلطان محمد شاہ کی مسجد ایک گلی نما سڑک پر واقع تھی۔ خاصی پرشکوہ اور شاندار عمارت ہے، بہت کشادہ صحن۔ اونچی اونچی محرابیں اور درمیان میں ایک اونچا سا منبر۔ اس مسجد میں بھی مرمت کا کام جاری تھا۔ ریت پتھر، اور سنگ مرمر وغیرہ کے علاوہ سیمنٹ بھی جابجا بکھری ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس عالم میں مسجد میں نماز تو کیا ہوتی ہوگی؟

ہم نے قاسم سے پوچھا کہ یہ مرمت کب سے شروع ہوئی اور کب ختم ہوگی۔

وہ مسکرایا اور بولا ”میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے، اسے زیر مرمت ہی دیکھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ جب تک تعمیرات کا محکمہ ختم نہیں ہوگا اس کی مرمت کا سلسلہ جاری رہے گا۔“

گویا ہمارا والا ہی حساب تھا۔ مطلب یہ کہ پی ڈبلیو ڈی کا محکمہ مصر میں بھی ہوتا ہے۔ قاسم نے شکستہ منبر کی طرف اشارہ کیا اوربتایا کہ کیسے کیسے بزرگوں، علما اور بادشاہوں نے اس منبر پر کھڑے ہوکر خطبہ پڑھا ہے۔ جب خطبہ پڑھنے کا سلسلہ ختم ہوا تو مصر میں بادشاہت کا خاتمہ ہوگیا۔ اس منبر پر سے آخری خطبہ شاہ فاروق کے والد کے نام کا پڑھا گیاتھا۔ شاہ فاروق کے زمانے میں اس کی مرمت کا آغاز ہوا اور اس کے ساتھ ہی فاروق کی بادشاہت کا بستر گول ہوگیا۔

واپسی میں ابو القاسم ہمیں یہ سمجھاتے رہے کہ اگر ہم نے مصر کا دیہاتی علاقہ نہیں دیکھا تو سمجھئے کے کچھ بھی نہیں دیکھا۔ ہمارے پاس اتنا زیادہ وقت نہیں تھا کہ اچھی خاصی گرمی میں ریگستانی دیہات میں مارے مارے پھرتے۔ یہ درست ہے کہ ہم

مصر کے دیہات نہیں دیکھ سکے تھے مگر دیہاتیوں کو دیکھ لیا تھا۔ جس طرح ہمارے شہروں میں دیہاتی اپنے مخصوص لباس میں گھومتے نظر آتے ہیں قاہرہ، میں بھی فلاحین جگہ جگہ نظر آجاتے ہیں۔ کاشتکاروں کو وہاں فلاحین کہاجاتا ہے لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ آج تک ان کی فلاح کا کوئی بندوبست نہیں کیاگیا۔ ہم نے تو مصر کے دیہات نہیں دیکھے مگر سید راجندر ناتھ نے ہمیں بتایا کہ مصر کے دیہات میں جائیں تو یوں لگتا ہے جیسے وقت کی رفتار تھم گئی ہے۔ زمانہ جامد ہوکر رہ گیا ہے۔ گاؤں دیہات میں وہی منظر دیکھنے کوملتا ہے جو شاید فرعونوں کے زمانے میں ہوگا۔ مٹی کے بنے ہوئے کچے مکانات، کہیں کہیں اینٹوں اور پتھروں کے گھر بھی نظر آجاتے ہیں۔ یہ بہت خوش حال لوگوں کے ہیں۔ اب فرعونوں کے دور کے مقابلے میں یہ تبدیلی ضرور ہوئی ہے کہ بجلی کے ذریعے دریائے نیل کا پانی دیہات تک پہنچایا جاتاہے مگر آب پاشی کی قدیم ترین طریقے بھی عام طورپر دیکھنے میں آجاتے ہیں۔کنوؤں سے رسیوں اور بالٹیوں کے ذریعے پانی نکالا جاتاہے۔ رہٹ بھی دیکھ لیجئے جن میں بیلوں کی جگہ اونٹ جتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جس طرح فرعونوں کے زمانے کی عمارتیں، مندر، اہرام، مقبرے، معبد اور دوسری یادگاروں کے آثار قدم قدم پر مصر میں بکھرے ہوئے ہیں اسی طرح قدیم رہن سہن کی نشانیاں بھی جگہ جگہ موجود ہیں

7

انقلاب کے بعد کرنل ناصر نے مصر کے فلاحین کے حالات بہتر بنانے کی کوشش کی تھی ۔ مگر اس غریب کو بین الاقوامی اور بین العربی معاملات سے اتنی فرصت نہ تھی کہ اپنے ملک کے لوگون کی حالت زار کی طرف توجہ دیتا۔ وہ قوم پرستی کا ڈھنڈورا پیٹنے اور اسرائیل، سے مقابلہ کرنے کیلئے جدید ترین ہتھیار بنانے میں مصروف رہا لیکن جب برا وقت آیا تو نہ قوم پرستی کام آئی اور نہ ہی ہتھیاروں نے ساتھ دیا۔ چند دن کے اندر اسرائیل نے اینٹ سے اینٹ بجاکر رکھ دی۔ اگر بین الاقوامی طاقتیں مداخلت نہ کرتیں تو شاید سارے مصر پر اسرائیل کا قبضہ ہوجاتا۔ بہرحال اس زمانے میں جہاں تک اسرائیل نے چاہا اپنے پیر پھیلا لیے اور آج تک نہیں سمیٹے۔ قصہ مختصر یہ کہ مصر کے عوام کی تقدیر پچھلے پانچ ہزار سال میں بھی نہیں بدلی ۔ دیکھیے اب اس کو بدلنے کیلئے اور کتنے ہزار سال درکار ہیں۔ مصر کی دوسری سب سے زیادہ دولت کمانے والی صنعت سیاحت تھی مگر پچھلے چند سالوں میں وہ بھی ٹھپ ہوکر رہ گئی ہے۔

تھکے ماندے ہوٹل واپس پہنچے تو سب کو غسل کرنے کی خواہش تھی۔ سارا دن گرمی میں گھومے پھرے تھے اور قاہرہ کی سڑکوں اور گلیوں کی خاک چھانی تھی مگر ظاہر ہے کہ غسل خانہ صرف ایک ہی تھا اس لئے باری باری غسل کرنا پڑا۔ خاں صاحب نے تو یہ مشورہ دیا تھا کہ کیوں نہ ہم جاپانیوں کی طرح ایک ہی غسل خانے میں

گھس جائیں۔

ہم نے کہا۔"مگر آپ یہ بھول رہے ہیں کہ جاپانی غسل خانے میں نہیں ، ایک حوض میں نہاتے ہیں اور وہ بھی کپڑے اتار کر۔"

بٹ صاحب نے کہا۔"واقعی اس معاملے میں جاپانی بہت بے شرم ہوتے ہیں۔ بلکہ خاندانی بے شرم ہوتے ہیں۔ سارا خاندان کپڑے اتار کر ایک حوض میں گھس جاتا ہے اور جب تک جی چاہے سب نہاتے رہتے ہیں۔"

ہم نے کہا۔" جاپانیوں کو کیوں الزام دیتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی "ایک حمام میں سب ننگے ہیں" کا محاورہ ہے۔"

خاں صاحب سر پکڑ کر بیٹھ گے۔"بھائی کس قدر لاعلمی کی باتیں کرتے ہو۔ یہ تو محاورہ ہے ۔ اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ حمام میں سب ننگے ہوکر نہاتے ہیں۔"

ہم نے کہا۔"آپ دونوں فی الحال حماموں ، غسل خانوں اور جاپانیوں کے بارے میں تبادلہ خیال کریں ، اتنی دیر میں ہم غسل کرکے آتے ہیں۔"

"ویسے یہ بات اصول کے خلاف ہے۔ ٹاس کر لیجئے۔ جس کی باری آئے وہ جاکر نہائے ۔" ہم نے سوچا کہ دیکھیے ضرورت اور مجبوری انسان کو کس قدر خود غرض بنا دیتی ہے۔ محض پہلے غسل کرنے کے سوال پر یہ ہم لوگوں میں اختلاف پیدا ہوگیاتھا۔ اگر کوئی بڑا مسئلہ ہوتا تو شاید سرپھٹول تک نوبت پہنچ جاتی ۔

ہم نے کہا۔"اتنی سی بات پر ٹاس کرنا اچھا نہیں لگتا۔ آپ پہلے نہالیجئے ۔ میں بعد میں نہالوں گا۔"

تب بٹ صاحب نے نعرہ لگایا۔"بالکل ٹھیک ہے۔ اب آپ سب لوگ اپنی اپنی چادریں اٹھائیں اور اپنی باری پر غسل خانے پہنچ جائیں۔ میں کیونکہ کشمیری ہوں اور مجھے گرمی بہت زیادہ لگتی ہے اس لئے سب سے پہلا حق میرا ہے۔" یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔

خاں صاحب صوفے پر بیٹھ گئے۔ بولے۔ "آج ہم لوگوں نے کتنی مسجدیں دیکھی ہوں گی۔ پاکستان میں توشاید ساری زندگی میں اتنی بہت سے مسجدوں میں نہیں گئے ہوں گے۔ جتنی ہم نے یہاں ایک دن میں دیکھ لی ہیں۔"

ہم نے کہا۔ "مگر نماز پڑھنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ صرف ایک مسجد میں دو نفل ادا کیے۔"

بولے۔ " ہم مسافرت میں ہیں اور سفر میں اللہ نے اپنے بندوں کو کافی رعایتیں دی ہوئی ہیں۔" ملاحظہ فرمایا آپ نے! ویسے کوئی دین ومذہب کے بارے میں کچھ جانے یا نہ جانے ' اپنے مطلب کی باتیں سب یاد رکھتے ہیں۔

قاسم ہمیں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ ان کا بیان تھا کہ وہ ایک ضروری کام کے سلسلے میں جارہے ہیں ۔ ایک دو گھنٹے بعد واپس آجائیں گے اور پھر ایک نوادرات والے کی دکان پر جائیں گے۔

"وہاں سے آپ کو فرعون کا مجسمہ خریدنا ہے؟" خان صاحب نے پوچھا۔

"ارے نہیں۔ دراصل اس کی بیٹی سے میری شادی طے ہونے والی ہے۔ کبھی کبھی حاضری تو دینی ہی پڑتی ہے۔"

"آپ کی ہونے والی بیوی کیا کرتی ہے؟"

بولے۔ "ابھی تو یونیورسٹی میں پڑھتی ہے مگر اسے بھی نوادرات کا بہت شوق ہے اور پھر اپنے باپ کی اکلوتی اولاد ہے۔ اس لیے وہ بھی یہی کام کرے گی۔"

خاں صاحب نے کہا۔ "آپ کو نئی اور پرانی دونوں چیزوں کی مبارک باد!"

"نئی اور پرانی کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ نئی آپ کی ہونے والی بیوی اور پرانی نادر اشیا۔"

خاں صاحب کو یہ فکر تھی کہ صبح جس ہپی جوڑے کو دیکھا تھا وہ اس وقت نظر نہیں آرہا۔

"کیوں۔ آپ کو ان سے کوئی کام ہے یا انٹرویو لینا ہے؟"

بولے۔ "بہت اچھا آئیڈیا ہے۔ کیوں نہ ہم ان دونوں سے ایک انٹرویو لے لیں۔"

"چھاپیں گے کہاں؟"

" چھاپنے کی کیا ضرورت ہے اور اگر کہیں چھپ بھی گیا تو وہ کہاں پڑھیں گے۔ دراصل مجھے ہپیوں سے بہت دلچسپی ہے۔ میں ان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ

جاننا چاہتا ہوں۔ آخر یہ زمانہ حاضر کی بالکل نئی اور انوکھی دریافت ہے۔ ان کے بارے میں معلومات تو رکھنی چاہئیں۔"

ہمیں لابی میں بیٹھے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ خاں صاحب کی مراد بر آئی۔ کیا دیکھتے ہیں کہ سامنے والے دروازے سے ہپی جوڑا اندر داخل ہورہا ہے۔ ہم نے آنکھیں مل کر دیکھا اور پھر خاں صاحب سے تصدیق چاہی۔ "خاں صاحب ۔ یہ لڑکی تو وہی ہے مگر کیا اس کا ساتھی آپ کو بدلا ہوا نہیں لگ رہا؟"

خاں صاحب اس وقت تک لڑکی کو دیکھنے میں مصروف رہے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ تھی بھی دیکھنے کے قابل۔ کسی شاعر نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ حسن کسی بھی روپ میں ہو' آخر حسن ہوتا ہے۔ افسوس اس بات کا تھا کہ اس قدر حسین وجمیل طرح دار لڑکی یوں اپنے شباب کے دن بے دردی سے ضائع کررہی تھی۔

خاں صاحب نے کہا۔ "آپ ہی کے خیال میں ضائع کررہی ہے نا' ہوسکتا ہے وہ اپنی موجودہ زندگی سے مطمئن ہو اور اس سے پوری طرح لطف اندوز ہورہی ہو۔"

خاں صاحب کا اندازہ درست بھی ہوسکتا تھا۔ بہرحال جب ہمارے توجہ دلانے پر انہوں نے لڑکی کے ساتھی کوغور سے دیکھا تو وہ بھی اسی نتیجے پر پہنچے کہ لڑکی کا ہمراہی واقعی بدل گیا تھا ۔ لیکن خوشی کی بات یہ تھی یہ پہلے والے کے مقابلے میں قدرے خوش شکل تھااور اچھی شخصیت کا مالک تھا۔ لباس اس کا بھی وہی تھا۔ یعنی جینز اور کرتا۔ بالوں کی لمبائی میں بھی زیادہ فرق نہ تھا ۔ البتہ داڑھی قدرے مختصر تھی لیکن بنیادی طور پر اسی مخلوق سے تعلق رکھتا تھا۔

وہ دونوں لابی میں داخل ہونے کے بعد اپنے کمرے میں جانے کے بجائے وہیں ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ شاید کہیں دور سے چل کر آئے تھے۔ اس لیے غالباً تھکن دور کرنے کے لئے تمباکو نوشی میں مصروف ہوگئے۔ خاں صاحب کچھ دیر تک سونگھتے رہے پھر بولے۔ "خالی سگریٹ پی رہے ہیں۔"

ہم نے کہا۔ "ظاہر ہے ۔ ہوٹل کی لابی میں بیٹھ کر تو نشہ آور سگریٹ نہیں پی سکتے ۔"

کہنے لگے۔ " ان سے کوئی بعید نہیں ہے۔ آپ نے یورپ میں دیکھا نہیں

کس قدر دیدہ دلیری سے باغوں اور بازاروں میں سوٹے اور انجکشن لگاتے ہیں۔"

ہم نے کہا۔" وہ یورپ ہے ۔ یہ مصر ہے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب ۔"

"سنا کیا۔ اب تو آنکھوں سے دیکھ لیا ہے بلکہ دیکھ رہے ہیں۔ اچھا یہ بتائیں کہ ان سے بات چیت کے لئے کیا بہانہ تلاش کیاجائے؟؟"

ہم نے کہا۔"انہیں بیئر وغیرہ آفر کریں۔ فوراً" ملاقات کا وقت مل جائے گا۔ ان لوگوں کو شراب 'کھانے اور پیسوں کی ہروقت ضرورت رہتی ہے۔"

خاں صاحب نے کچھ دیر غورو فکر فرمایا پھراس نتیجے پر پہنچے کہ اچانک کسی کے پاس جاکر اسے کھانے وغیرہ کی پیشکش کرنا اچھا نہیں لگتا۔ اس کیلئے کوئی مناسب اور معقول بہانہ ہونا چاہیے اور سوچنے کیلئے کچھ مہلت بھی درکار ہے۔

ہم نے مشورہ دیا کہ بٹ صاحب کو غسل کرکے آلینے دیں ۔ وہ تازہ دم اور ترو تازہ ہوں گے اور نہایت معقول مشورہ دے سکیں گے۔

" وہ کہیں اس کی مخالفت ہی شروع نہ کردیں۔" خاں صاحب نے شبہ ظاہر کیا۔

ہم نے کہا۔" اس مسئلے میں ایک خوبصورت لڑکی بھی ملوث ہے اس لیے بٹ صاحب سے یہ امید نہیں کی جاسکتی۔ بہرحال وہ غسل کرکے آجائیں گے تو پھر ہماری باری آئے گی۔ اتنی دیر میں آپ دونوں کوئی ترکیب سوچ رکھیے گا۔"

کچھ دیر بعد بٹ صاحب تازہ دم ہوکر آئے تو ہم نے اپنے کمرے کی راہ لی اور بستر کی چادر سمیٹ کر غسل خانے میں پہنچ گئے۔ یہ غسل خانہ خاصا صاف ستھرا اور معقول تھا۔ ہر چیز موجود تھی اگر کمی تھی تو بڑے تولیوں کی' یہ مصلحت ہماری سمجھ میں نہ آئی۔

غسل اور لباس تبدیل کرنے کے بعد ہم لابی میں گئے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ جس گول سے صوفے پر خاں صاحب کو ہم چھوڑ کر گئے تھے اب وہاں بٹ صاحب اور ہپی جوڑا بھی براجمان تھا اور خوب گھل مل کر باتیں ہورہی تھیں۔ ہم پہنچے تو ہمارا بھی باقاعدہ تعارف کرایاگیا۔ خاتون امریکی تھیں لیکن اب ان کے ہم سفربدل گئے تھے اوران کا تعلق آسٹریلیا سے تھا۔ وہ تین سال سے اپنے ملک سے نکلے ہوئے تھے اور گھاٹ گھاٹ کاپانی پی رہے تھے۔

یہ ان کا پہلا دورۂ مصر تھا۔ اس سے پہلے وہ مشرق اور مغرب کے بہت سے ملکوں کی خاک چھان چکے تھے۔ آسٹریلیا میں وہ ایک کاشت کار تھے پھردل میں نہ جانے کیا سمائی کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کریعنی فروخت کرکے ہپی بن گئے۔

"مگر آپ کو ہپی بننے کا خیال کیسے آیا؟" ہم نے پوچھا۔

"دراصل میں ایک بار سڈنی گیا تو وہاں میں نے پہلی بار ہپی دیکھے۔ ان سے ملاقات بھی ہوئی اور ان کا طرز زندگی مجھے بہت پسند آیا۔ سوچا کھیتی باڑی اور گائے بکری میں زندگی ضائع کرنے سے بہتر ہے کہ آزاد پنچھی کی طرح دنیا میں گھوما جائے۔ دیکھیے نا ۔ زندگی صرف ایک بار ملتی ہے اور دنیا بہت بڑی ہے۔ ہپی بننے کا ایک فائدہ یہ ہے کہ آپ نہ صرف نئے نئے ممالک اور تہذیبیں دیکھتے ہیں بلکہ نئی نئی لڑکیوں سے بھی ملتے ہیں۔ اگر کوئی نارمل زندگی بسر کرے تو عمر بھر میں زیادہ سے زیادہ تین چار شادیاں کرلے گا اور اگر توفیق ہوئی تو دو چار گرل فرینڈز بھی بنالے گا لیکن ہپی بن کر ہم کائنات کا ایک حصہ بن جاتے ہیں اور ہماری رسائی بھی بہت دور تک ہوجاتی ہے۔ برادرز نئی دوستیاں اور نئے تعلقات بنائے جاسکتے ہیں۔ اس طرح انسان کو صحیح معنوں میں تجربہ حاصل ہوتا ہے۔

ہم حیران ہوکر ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ہپی بننے کا یہ فائدہ اس سے پہلے ہمیں کسی نے نہیں بتایاتھا۔ وہ خاصے باتونی آدمی تھے۔ کہنے لگے۔"آپ کو شاید یہ تو معلوم ہوگا کہ مغرب میں شادی کرنا آسان ہے مگر طلاق دینا بہت مشکل ہے ۔ شوہر کو اپنی آدھی جائیداد اور آمدنی بیوی کے حوالے کرنی پڑتی ہے اور اس کے بہت سے اخراجات بھی برداشت کرنے پڑتے ہیں لیکن ہپیوں پر ایسی کوئی پابندی نہیں ہے۔ نہ شادی نہ جھنجھٹ ہے نہ طلاق کے مسائل ہیں ۔ انسان پرندوں کی طرح آزاد ہوتاہے۔" یہ کہہ کر انہوں نے ایک لمبی سانس لے کر اپنے پھیپھڑوں میں ہوا بھری اور پھر سانس روک کر بیٹھ گئے۔ ہم تو ڈر گئے کہ شاید ان کا دم اندر ہی اندر رہ جائے مگر کچھ دیر بعد انہوں نے آہستہ آہستہ اپنے نتھنوں سے ہوا خارج کی تو کچھ اطمینان

ہوا کہنے لگے۔"یہ بھی ایک ورزش ہے جو مجھے لندن میں ایک انڈین جوگی نے بتائی تھی۔"

"مگر آپ اپنا خرچہ کیسے پورا کرتے تھے؟" خاں صاحب نے پوچھا۔" کام تو آپ کچھ کرتے نہیں ہیں۔"

بولے۔"کبھی کبھی کوئی چھوٹا موٹا کام بھی کرلیتا ہوں مگر زیادہ تر بے کار ہی رہتا ہوں۔ کام سے بچنے کے لئے ہی تو میں ہپی بنا ہوں ورنہ وہاں ٹریکٹر چلاچلاکر اورگایوں کی پرورش کر کرکے تھک گیاتھا۔"

"بے کاری میں آمدنی کاکیا ذریعہ ہوتاہے؟"

کہنے لگے۔" ہپی ہونا بذات خود ایک کام ہے۔ اللہ ہر ہپی کو کسی نہ کسی طرح کھانا دے ہی دیتاہے۔ رہنے کاکوئی مسئلہ نہیں ہے جہاں بیٹھ گئے وہی گھر بن گیا۔"

"مگراس ہوٹل میں تو کرایہ دینا پڑتا ہے۔" خاں صاحب نے کہا۔

وہ ہنسنے لگے۔ کہنے لگے۔"آپ میری کو دیکھ رہے ہیں۔ یہ میری نئی پارٹنر ہے۔ کمرے کا کرایہ تو یہ دے ہی رہی ہے پھر مجھے بلاوجہ کرایہ دینے کی کیا ضرورت ہے۔"

میری اس دوران میں سگریٹ کاکش لگا رہی تھی اور خلاء میں گھورتی ہوئی بہت بھلی لگ رہی تھی' سچ تو یہ ہے کہ وہ ان لڑکیوں میں سے تھی جو ہر حال میں بھلی لگتی ہیں۔

"میں ایک انگلش لڑکی کے ساتھ نیل کے کنارے رہتا تھا آج ہی میری سے میری ملاقات ہوگئی مجھے بہت اچھی لگی' کافی ذہین لڑکی ہے۔ میری پارٹنر میریلین کو اس کا دوست پسند آگیا۔ اس طرح ہم لوگوں نے ساتھی تبدیل کرلیے۔"

جب میری نے خلاؤں میں گھورنے کا سلسلہ بند کیاتو ہم نے اس کو مخاطب کیا اور پوچھا" اگر آپ کواعتراض نہ ہو تو یہ بتائیں کہ آپ ساری دنیا میں پھرتی رہتی ہیں تو اخراجات کیسے پوری کرتی ہیں۔ کیا ہر ملک میں آپ کا کاروبار موجود ہے؟"

وہ ہنسنے لگی۔"آپ کو شاید معلوم نہیں ہے کہ میرا باپ کتنا دولت مند آدمی ہے۔ اگر اس کے دو درجن بیٹیاں ہوتیں اور وہ سب ہپی بن جاتیں تب بھی اسے کوئی

زتی نہ پڑتا۔ وہ ان سب کا خرچہ اٹھا سکتا ہے۔ میں اس سے رقم منگواتی رہتی ہوں۔ بھی کمی پڑجائے تو ادھر ادھر سے کچھ نہ کچھ کما لیتی ہں۔ دراصل میں اپنے باپ کی بہت لاڈلی اور اکلوتی بیٹی ہوں۔ ماں تو میرے بچپن میں ہی مرگئی تھی۔ میرے باپ کی خواہش ہے کہ میں کیمپوں اور فضول جگہوں پر نہ رہوں۔ جہاں بھی جاؤں کسی ہوٹل میں قیام کروں۔ اب دیکھئے ناآخر وہ اولڈ مین میراباپ ہے۔ اس کی خواہش کا احترام کرنا بھی تو آخر فرض ہے نا!"

واقعی ہم نے سوچا۔ فرض شناس بیٹی ہوتو ایسی ہو۔

خاں صاحب نے ایک انتہائی ذہانت کا سوال پوچھا۔"یہ بتائیے کہ آپ ہپی لوگ ایک دوسرے کے ساتھ ہی کیوں رہتے ہیں میرا مطلب ہے کہ جو شخص ہپی نہ ہو اس کے ساتھ رہنا پسند کیوں نہیں کرتیں؟"

میری مسکرائی۔ ووہ کسی قدر نشے میں معلوم ہوتی تھی کیوں کہ اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھااور آنکھوں میں گلابی ڈورے نظر آرہے تھے۔

کہنے لگی۔" اگر عام لوگوں کی طرح ان کے ساتھ رہنا ہو تو بندہ اپنا گھراور ملک کیوں چھوڑے۔ ہماری اور دوسرے لوگوں کی سوچ میں' رہن سہن میں' فلسفہ زندگی میں' غرض یہ کہ ہرچیز میں فرق ہوتاہے۔"

"توکیا ساری زندگی ہپی رہنے کا ارادہ ہے؟"

بولی۔"کل کی خبر کون جانتا ہے۔ زمانہ بدلتا رہتاہے۔ موسم بدلتے رہتے ہیں۔ انسانوں کے خیالات بھی بدلتے رہتے ہیں۔ کون جانے کل میرے کیا خیالات ہوں گے؟"

ان کے ساتھی اس گفتگو سے کافی بیزار معلوم ہورہے تھے۔ کہنے لگے۔"ہنی ہمیں چلنا چاہیئے"

"اوکے ۔ اوکے۔" ہنی نے اپنا بیگ اٹھایا اور اس کے ساتھ رخصت ہوگئی۔

خاں صاحب نے ایک سرد آہ بھری اور کہا۔"مجھے تو ان پر رشک آتا ہے۔ کاش ہم بھی ہپی بن جاتے اور آزاد پرندوں کی طرح انہیں دیکھتے۔"

"مگر کالے آدمیوں کو اللہ میاں ہپی نہیں بناتا۔ اگر اللہ کو ہپی بنانا مقصود

ہوتا تو آپ کو کسی یورپی ملک میں پیدا کرنا اس کی قدرت سے باہر نہیں تھا۔"

اتنی دیر میں ابو القاسم واپس آگئے اور گھڑی دیکھ کر بتانے لگے کہ مقررہ وقت ہوچکا ہے اس لیے ہمیں فوراً چلنا چاہیے۔

ہم نے کہا۔" ابھی خاں صاحب کو غسل کرنا ہے۔ اگر تھوڑی بہت مہلت مل جائے تو کوئی حرج تو نہیں ہے۔"

بولے۔"کوئی مضائقہ نہیں ہے۔"

خاں صاحب فوراً غسل خانے کی طرف چل پڑے۔

"کیا آپ لوگوں کے ہاں وقت کی پابندی کا بہت خیال رکھا جاتا ہے؟" ہم نے پوچھا۔

بولے۔"اتنا زیادہ خیال بھی نہیں رکھا جاتا۔ ایک دو گھنٹے کی تاخیر تو کوئی بات نہیں ہے، اس سے زیادہ دیر ہوجائے تو معذرت کرنی پڑتی ہے مگر مشکل یہ ہے کہ میں پہلے ہی تین چار گھنٹے لیٹ ہوچکا ہوں، خیر آپ لوگ ہوں گے تو بات بن جائے گی۔"

قاسم نے ہونے والے سسر کا نام یحییٰ بتایا تھا۔ اچھی طرح یاد نہیں رہا لیکن کسی پیغمبر کے نام پر ہی تھا۔ ان کی نوادرات کی دکان کے بارے میں ہمارے خیالات بہت بلند تھے۔ خیال تھا کہ کسی بڑی سڑک پر شیشیوں سے آراستہ عمارت ہوگی جس میں دنیا بھر کے اور خصوصاً" مصر کے قیمتی نوادرات سجے ہوں گے مگر جب قاسم صاحب ہمیں چند جگہوں میں سے گزار کر چند اور گلیوں میں لے گئے تو ہم پریشان ہوگئے۔ بعض گلیاں تو اتنی تنگ تھیں کہ بیک وقت دو آدمی نہیں گزر سکتے تھے۔ خاں صاحب کا خیال تھا کہ ان گلیوں کو"ون وے" بنا دینا چاہیے لیکن ان نیم تاریک اور افسانوی گلیوں میں ایک دوسرے سے ٹکرانے کے جو امکانات تھے اس کے بعد وہ باقی نہ رہتے۔ ہم لوگ بھی اس سفر کے دوران میں کئی بار مختلف لوگوں سے ٹکرائے۔ بعض سے تو بچ کر نکل گئے مگر بعض کے ساتھ تصادم میں ہی بہتری تھی۔ مطلب آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ ان گلیوں میں بھی دکانیں اور مسجدیں تھیں۔ کہیں محراب نما دکان کے اندر کوئی درزی صاحب بیٹھے کپڑے سی رہے ہیں۔ کہیں پرچون فروش پڑیاں بنا بنا کر بچوں کو دے رہے ہیں۔

جو گلیاں ذرا کشادہ تھیں ان میں دیگر اقسام کی دکانیں تھیں۔ کہیں صراف تھے تو کہیں کپڑا فروخت کرنے والے۔ ایک دو جگہ سوئٹر فروخت کرنے والے بھی نظر آئے۔ یہاں دکانیں اور مکانات ملے جلے تھے۔ کبھی کسی مکان سے کوئی البیلی سانولی گداز جسم کی لڑکی تیزی سے نکل کر گلی سے گزرتی ہوئی کسی دوسرے مکان میں یا ایک دکان سے دوسری دکان میں جاتی ہوئی نظر آجاتی۔ اجنبیوں پر نظر پڑتی تو ان کی سیاہ چمکدار آنکھوں میں مسکراہٹ سی نمودار ہو جاتی۔ داڑھیوں والے، جبوں، چوغوں اور عماموں والے بزرگ بھی ان گلیوں میں نظر آئے۔ ایک مکان کے سامنے سے گزرے تو نہایت خوش الحانی کے ساتھ قرات کی آواز کانوں میں پڑی۔ بٹ صاحب تو "سبحان اللہ۔ سبحان اللہ" کہتے ہوئے وہیں رک گئے۔

بولے۔"گھڑی دو گھڑی یہاں بھی رک جاؤ۔ خدا جانے پھر عربوں سے تلاوت سننے کا موقع ملے یا نہ ملے۔"

قاسم تیزی میں آگے نکل گیا تھا۔ ہم لوگوں کو رکا ہوا دیکھا تو پلٹ کر آگیا۔" کیا بات ہے؟"

ہم نے کہا"ذرا تلاوت سننے کے لیے رک گئے تھے۔"

وہ مسکرایا۔"یہ تلاوت نہیں ہے۔ برہان ہادی نغمہ سرا ہے۔"

ہم نے یہ نام پہلی بار سنا تھا۔ خان صاحب بہت متاثر ہوئے کہنے لگے۔" ایک گمنام شخص کی اتنی اچھی آواز دیکھ لینا ایک دن بہت ترقی کرے گا۔"

قاسم نے کہا۔" یہ بہت زیادہ ترقی کر چکا ہے۔ مصر کا مقبول ترین گلوکار ہے۔ میں آپ کو اس کے گانوں کے ریکارڈ خرید کر دے دوں گا۔"

تنگ گلیاں پرانے انداز کے بالکونیوں والے مکان محرابوں والے دروازے اور کھڑکیاں چوغہ اور عمامہ پہنے ہوئے لوگ، ہنستی ہوئی چلبلی لڑکیاں، مکانوں کے جھروکوں سے لٹکتے ہوئے کپڑے یا جھانکتے ہوئے دلربا چہرے ڈیوڑھیاں، طاقچے ایک عجیب ہی ماحول تھا۔ ہمیں تو الف لیلیٰ کی کہانیاں یاد آگئیں۔ الف لیلہ کے بعض کردار اور واقعات قاہرہ سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔ کیا عجب کہ وہ کہانیاں ان ہی گلیوں میں رونما ہوئی ہوں یا ہو سکتا ہے وہ کردار سچ مچ کے کردار ہوں۔ آخر لکھنے والے بھی تو

کرداروں اور واقعات کے لیے اپنے ارد گرد کے واقعات اور لوگوں سے انسپائیر ہوتے ہیں ۔ ایک چھوٹی سی دکان میں قہوے کا سامان تھا۔ سماوار میں قہوہ ابل رہا تھا۔ آس پاس روٹیوں اور کلچوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔

خان صاحب مچل گئے کہ اس دکان میں چائے یا قہوہ پئیں گے۔

ہم نے کہا کہ بٹ صاحب یہ کشمیری چائے نہیں ہے۔ مصری قہوہ ہے جس کا ذائقہ آپ چکھ چکے ہیں ۔ اور پچھتا بھی چکے ہیں مگر بٹ صاحب کا اصرار تھا کہ کلچے ضرور کھائیں گے ۔قاسم سے کہا تو وہ بھی دکان کے سامنے رک گیا۔ ایک لبادہ پوش سر سے ننگے بزرگ سماوار کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ نزدیک ہی ایک نو عمر لڑکا بھی اسی لباس میں ملبوس بیٹھا کسی کام میں مصروف تھا۔ اس سے ذرا ہٹ کر ایک نوجوان لڑکی آستینں چڑھائے ایک تسلے نما برتن میں مٹھیاں مار رہی تھی ۔ شاید آٹا گوندھ رہی ہوگی ۔ ہم لوگ جا کر لکڑی کی بینچوں پر بیٹھ گئے ۔ دکان میں موجود سب لوگوں نے دلچسپی سے ہمیں دیکھا۔ قاسم نے عربی میں تعارف کرایا اور فرمائش کی کہ یہ لوگ کلچے کھانا چاہتے ہیں ۔ ایک ایک پیالہ قہوہ بھی ہو جائے۔

دکاندار نے شیریں بیانی کا مظاہر شروع کر دیا ۔ قاسم نے بتایا کہ کہہ رہا ہے کہ اگر کچھ دیر پہلے آجاتے تو تازہ کلچے کھانے کو مل جاتے ۔ بہر حال باسی بھی بہت مزیدار تھے ۔قہوہ تو ہم نے پیا نہیں ۔بڑے میاں بار بار کہتے رہے کہ قہوے میں ڈبو کر کلچے کھاؤ تو بہت مزہ آئے گا مگر قہوہ کا ذائقہ ہمیں پسند نہیں تھا۔ یکایک وہ لڑکی جو شاید آٹا گوندھ رہی تھی اٹھ کر ہمارے پاس آکھڑی ہوئی ۔خاصی دراز قد اور صحت مند لڑکی تھی۔ چہرہ بھی کلچے کی طرح گول تھا ۔ اس نے اپنے آٹے سے لتھڑے ہوئے ہاتھ ہماری طرف ہلاہلا کر قاسم سے کچھ کہنا شروع کر دیا پھر دونوں ہاتھ اپنی موٹی کمر پر رکھ کر کھڑی ہوگئی۔

وہ ہمارے بارے میں پوچھ رہی تھی کہ کون ہیں ' کہاں سے آئے ہیں ۔ قاسم نے بتایا تو " باکستان باکستان" کہہ کر مسکرائی اور سر ہلاتی ہوئی واپس لوٹ گئی۔

بٹ صاحب نے ایک سرد آہ بھری اور کہا ۔"مجھے کشمیر یاد آگیا ہے۔"

ہم نے چاروں طرف دیکھا نہ پہاڑ تھے 'نہ جھیلیں ۔ سرو کے درختوں کا بھی

دور دور تک پتا نہیں تھا۔ اس گلی کی دکان کو دیکھ کر کشمیر یاد آجانا بہت حیرت انگیز تھا۔

" بھئی آپ کو کشمیر کیوں یاد آگیا؟" خان صاحب نے پوچھا۔

بولے " سماوار دیکھ کر ذرا ان سے پوچھ کر دیکھو باقر خانیاں مل سکتی ہیں ؟"

ہم نے قاسم کو باقر خانیوں کے بارے میں بتایا مگر اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ مجبوراً" بٹ صاحب کو کلچوں پر ہی گزرا کرنا پڑا۔

بل ادا کرنے کا وقت آیا تو قاسم نے مشرقی روایات کا مظاہر کرتے ہوئے جیب سے رقم نکال کر بڑے میاں کے حوالے کر دی ۔اندر سے لڑکی دوڑی دوڑی آئی اور دونوں ہاتھ ہلا ہلا کر کچھ کہتی رہی ۔ وہ اپنے باپ سے (غالباً" باپ ہی تھے) یہ کہہ رہی تھی کہ پہلی بار ہماری دکان میں پاکستان سے کچھ مہمان آئے ہیں ۔ ان سے پیسے وصول نہیں کرنے چاہیں ۔بڑے میاں بڑے غور سے اس کی باتیں سنتے رہے پھر ایک فقرہ بول کر قاسم سے پیسے لے کر جیب میں ڈال لیے قاسم ہنسنے لگا۔

ہم نے پوچھا۔"کیا ہوا؟"

بولا۔" بڑے میاں کہہ رہے ہیں کہ پیسے پاکستانیوں کے نہیں ہیں مصری کے ہیں۔ اس لیے قبول کرنے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔"

کلچے کھانے کے بعد کچھ جان میں جان آئی تو ہم نے قاسم سے پوچھنا شروع کر دیا کہ ابھی اور کتنی دور جانا ہے؟

"بس۔ وہ رہا سامنے۔"

ہم نے بعد میں بھی دیکھا۔ سنا اور اندزہ لگایا کہ " وہ رہا سامنے " کہنا قاہرہ والوں کی عادت ہے میلوں دور کے فاصلے کے بارے میں بھی یہی کہیں گے کہ وہ رہا سامنے لیکن اب قاسم کے ساتھ جائے بغیر چارہ نہ تھا۔ اگر واپس لوٹتے تو شاید اس سے کہیں زیادہ فاصلہ طے کرنا پڑتا۔ جتنا کہ منزل پر پہنچنے کے لیے طے کرنا تھا۔

چند اور گلیوں سے گزر کر ہم بالا آخر اس جگہ پہنچ گئے۔راستے میں کئی جگہ سامنے سے آنے والوں سے ٹکرائے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نگاہیں بالکونیوں اور جھروکوں کی طرف لگی ہوئی تھیں۔

خاں صاحب نے ڈانٹا بھی' تنبیہہ بھی کی مگر بٹ صاحب یہی کہتے رہے کہ

کتنی خوبصورت بالکونی ہے ۔ ہمارے پرانے لاہور میں بھی بہت بالکونیاں اور جھروکے ہیں مگر کبھی جاکر دیکھنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ اب جاکر ضرور دیکھیں گے۔ ویسے اپنے پرانے لاہور کی گلیوں میں بھی کافی رونق ہوتی ہے مگر ہم لوگ قدر نہیں کرتے۔ کیونکہ گھر کی مرغی دال برابر ہوتی ہے۔

جس دوکان کے سامنے جاکر ہم رک گئے تھے وہ ایک بوسیدہ سی عمارت تھی۔ پتھر کی دو سیڑھیاں چڑھنے کے بعد لکڑی کے نقشین دروازے تک پہنچے تھے ۔ یہ دروازہ بند تھا گھنٹی وغیرہ تو نظر نہیں آئی ۔ لوہے کا ایک کنڈا قاسم نے دو چار بار دروازے پر مارا تو اچانک دروازہ کھل گیا اور یوں لگا جیسے بدلی میں سے چاند نکل آیا۔ ایک گوری چٹی' تیکھے ناک ' نقشے اور انتہائی پرکشش جسم والی ایک نوجوان لڑکی کرتا اور جینز پہنے ہمارے سامنے کھڑی تھی ۔ اس کے بالوں کا رنگ شربتی تھی۔ آنکھیں بھی شاید اسی رنگ کی تھیں۔ قاسم کو دیکھتے ہی وہ مسکائی اور "اہلا" و سہلا"" کہہ کر دروازہ کھول دیا۔ ہم تو اسے یورپین سمجھے تھے مگر معلوم ہوا کہ دیسی تھی اور یہی قاسم کی ہونے والی بیوی تھی۔ اس کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر حیرانی ضرور ہوئی مگر بعد میں قاسم نے بتایا کہ اس کی ماں لبنانی اور نانی فلسطینی تھی ۔ باپ کے خون میں بھی شامیوں کا رنگ تھا۔ گویا افریقہ سے اس کا کوئی واسطہ نہیں تھا۔ اس لیے اس پر غیر ملکی کا گمان گزرتا تھا۔ قاسم نے دروازے میں داخل ہونے سے پہلے ہی ہم سب کا تعارف کرا دیا۔ اس نے "اہلا" و سہلا"" کہہ کر ہم سب کا خیر مقدم کیا مگر اس کے ساتھ ہی ہاتھ بھی ملایا اور اس کے بعد اتنی اچھی انگریزی بولنی شروع کی کہ ہم سب بوکھلا گئے ۔ آواز اس کی انتہائی شیریں تھی اور اس نے بیروت کی امریکن یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی تھی۔ اتنی بہت سی خوبیاں ایک دم ہی ظاہر ہوئیں تو ہم سب بہت متاثر ہوئے اور قاسم کی قسمت پر رشک کرنے لگے۔

لڑکی کا نام عمارہ تھا۔ قاسم اسے "عم ۔ عم" کہہ کر مخاطب کررہا تھا۔

بٹ صاحب نے چپکے سے پوچھا۔ "یہ اسے مم مم کیوں کہہ رہا ہے؟"

ہم نے کہا۔ "مم نہیں ۔ عم کہہ رہا ہے۔"

"اس کا کیا مطلب ہے؟"

"عمارہ کا مخفف ہے اور شاید اس کا پیار کا نام ہوگا۔"

کہنے لگے۔ "کتنا پیارا نام ہے!"

ہم نے کہا۔ "خیال رہے کہ وہ قاسم کی منگیتر ہے اور وہ بھی سامنے ہی کھڑا ہے۔"

کہنے لگے۔" تعریف ہی تو کررہا ہوں ۔ اس میں ناراض ہونے کی کیابات ہے!"

"خاں صاحب نے کہا ۔ "دروازہ بھی دیکھ لیا اور لڑکی سے بھی واقفیت ہوگئی۔ اب اس کے آگے چل کر بھی دیکھنا چاہیے۔"

ہم نے قاسم تک ان کے خیالات پہنچا دیے تو وہ مسکرائے اور ہمیں لے کر عمارت کے اندر پہنچ گئے۔ یہ ایک کافی بڑا ہال سا تھا جس کے ایک جانب محرابوں والے دالان سے بنے ہوئے تھے ۔ ہم تو سمجھ رہے تھے کہ بہت چمک دمک والا شاندار شو روم ہوگا دیکھا تو اس پر کباڑ خانے کا گمان گزرا۔ ہر طرف میزیں اور کواڑوں اور بغیر کواڑوں والی الماریاں رکھی ہوئی تھیں ۔ جن میں انواع و اقسام کی اور مختلف سائز کی اشیاء بھری ہوئی تھیں۔ سامان رکھنے میں کسی قسم کا سلیقہ'قرینہ یا ترتیب نہیں تھی۔ بس مختلف اشیاء کے ڈھیر سے لگے ہوئے تھے۔

قاسم نے عمارہ سے ان کے والد بزرگوار کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ چند نہایت اہم خریداروں کے ساتھ اندر مصروف ہیں۔ ہم نے حیران ہوکر چاروں طرف دیکھ کر فرمایا۔ "اس کباڑخانے میں بھی اہم خریدار آتے ہیں؟"

عمارہ بھی ہم سب سے انتہائی امریکی لب و لہجے میں معذرت طلب کرکے رخصت ہوگئی۔ اب ہم تھے اور چاروں طرف بکھرا ہوا کاٹھ کباڑ۔

قاسم نے ہم سے سوال کیا۔ "آپ جانتے ہیں کہ اس دکان میں کتنی مالیت کا سامان ہوگا؟"

ہم اپنے تصور میں لاہور کے لنڈے بازار کو لائے اور پھر دل ہی دل میں موازنہ کرنے کے بعد اندازاً" کہا۔ "پانچ دس ہزار ڈالر کا تو ہوگا۔"

ہم نے اپنی دانست میں اس کا دل رکھنے کے لیے کافی بڑی رقم بتائی تھی مگر

قاسم یہ سن کر ہنسنے لگا۔"یار فیقی ۔ کیسی بچوں جیسی باتیں کرتے ہیں۔ آپ نے پہلے کبھی نوادرات کی کوئی دکان نہیں دیکھی!"

اب ہم اسے کیا جواب دیتے۔ کباڑیوں کی دکانیں ہم نے اپنے ملک میں بہت سی دیکھ رکھی تھیں مگر قاہرہ میں یہ پہلا اتفاق تھا اس لیے سرہلا کر چپ ہوگئے۔

وہ بولا۔ "یا اخی ۔ یہ لاکھوں ڈالر کی نوادرات ہیں۔ یوں سمجھئے کہ ایک خزانہ ہے۔ مجھے تو صحیح طور پر کچھ اندازہ بھی نہیں ہے کہ یہاں کیا کیا چیزیں ہوں گی مگر پھر بھی قدیم مصر سے تعلق رکھنے والا تمام سامان یہاں موجود ہے۔"

یہ کہا اور سامنے والی میز پر پڑا ہوا ایک مٹی یا پتھر سے بنا ہوا چھوٹا سا کھلونا اٹھاکر بولا وہ "یہ مسیح سے بھی دو ہزار سال پرانا کھلونا ہے۔ قدیم مصر میں ایسے کھلونے ہوا کرتے تھے۔ بڑی مشکل سے زمین کی کھدائی کر کے احتیاط سے نکالے گئے ہیں۔"

ہم نے اس بے ہنگم سی چیز کو ذرا غور سے دیکھا۔ ہمیں تو وہ کھلونا بھی نظر نہیں آیا مگر قاسم نے بتایا تھا تو درست ہی ہوگا۔

"جانتے ہیں اس کی قیمت کیا ہے؟"

"نہیں۔"

بولا۔ ٹھیک سے تو میں بھی نہیں جانتا مگر میرے خیال میں ہزار دو ہزار ڈالر سے کم نہ ہوگا۔"

اتنی دیر میں عمارہ دوبارہ وارد ہوگئی۔ قاسم نے اس سے کھلونے کی قیمت دریافت کی تو اس نے کچھ دیر توقف کیا پھر بولی۔ "سات سو ڈالر کا ہے ۔ آپ کے دوستوں کے لیے سو ڈالر کی رعایت ہوجائے گی۔"

ہم نے جلدی سے کہا۔ "نہیں نہیں۔ ہم اسے خرید تو نہیں رہے۔ بس ویسے ہی قیمت پوچھ رہے تھے۔"

بولی۔ "خرید لیں۔ بڑی نادر چیز ہے۔ کچھ اور رعایت بھی کردوں گی۔"

ہم نے کہا۔ "ایسی چیزیں ہمارے ملک میں بھی بہت مل جاتی ہیں۔"

خاں صاحب بولے۔ "آپ نے کبھی گھگھو گھوڑے کا نام سنا ہے؟"

وہ انکار میں سرہلانے لگی۔

بولے۔ "وہ اس سے بھی زیادہ خوبصورت کھلونے ہوتے ہیں۔"

کہنے لگی۔ ہوتے ہوں گے ۔ آخر آپ کے ملک میں وادی سندھ کی تہذیب بھی تو پانچ چھ ہزار سال پرانی ہے۔"

یہ کہا اور معذرت طلب کر کے دوبارہ ایک برتن اٹھا کر لپک جھپک رخصت ہوگئی۔

ہم نے بتایا کہ ممیوں کے سوا اس جگہ پر ہر چیز مل سکتی ہے۔ آپ جو طلب کریں گے یہ دونوں باپ بیٹی پل بھر میں نکال کر دے دیں گے۔

"مگر کیسے؟"

"انہیں پتا ہے کون سی چیز کہاں رکھی ہے۔ ان کے دماغوں میں کیٹلاگ بنے ہوئے ہیں۔"

"یہ سب چیزیں یہ لائے کہاں سے ہیں؟" خاں صاحب نے پوچھا۔

قاسم ہنسنے لگا۔ پھر کہا۔ "یار فیقی اب آپ سے کیا پردہ! یہ تمام نوادرات چوری کے ہیں۔ یا تو لوگ خود ہی کھود کھاد کر نکال لاتے ہیں یا پھر پیشہ ور چوروں نے اہرام اور مقابر میں نقب لگا کر جو چیزیں چرائی تھیں وہی ہاتھوں ہاتھ بکتی رہتی ہیں۔ عجائب خانوں سے بھی یار لوگ سامان اڑالاتے ہیں اور سستے داموں نوادرات کے دکان داروں کو فروخت کردیتے ہیں۔ غیر ملکی سیاح ان چیزوں کے منہ مانگے دام ادا کرتے ہیں۔"

اتنی دیر میں باتیں کرنے کی آواز آئی اور بائیں جانب کی محراب سے چند لوگ برآمد ہوکر ہال میں تشریف لے آئے۔ ان میں ایک بوڑھی امریکن اور ایک نوجوان حسینہ تھیں۔ ایک بزرگ بھی چھڑی ہاتھ میں لیے مونو کل لگائے اور تھری پیس سوٹ زیب تن کیے ان کے ہمراہ تھے۔ عمارہ ان سے گفتگو کرتی ہوئی آرہی تھی۔ جب وہ سانس لینے کو رکتی تو اس کے والد صاحب فوراً "مصرع اٹھا لیتے اور عربی لب و لہجے میں انگریزی کی ٹانگ توڑنی شروع کردیتے ۔ یہ السید یحیٰی تھے ۔ ان کا قد چھوٹا اور جسم قدرے موٹا تھا۔ لیکن ان کے جسم میں سب سے زیادہ نمایاں چیزان کی توند تھی، جو ہزار پہننے کے باوجود نظر آ ہی تھی ۔ ان کے چہرے پر مختصر سی داڑھی تھی عقابی

آنکھیں تھیں اور ناک چونچ دار تھی۔ البتہ رنگ ان کا سرخ و سفید تھا۔ وہ گفتگو کے دوران میں ' میں اپنی توند پر ہاتھ پھیرنے کے عادی تھے۔ انگریزی میں زیادہ رواں نہ تھے۔ مگر اس کے باوجود ان کی گفتگو کی روانی قابل تعریف تھی۔ اس قدر لچھے دار انداز میں باتیں کر رہے تھے۔ کہ تینوں امریکی زن و مرد دم بخود تھے۔ امریکن بزرگ کے ہاتھوں میں ایک پرانا سا گلدان تھا۔ ان کی بیوی نے ایک رکابی نما چیز اٹھا رکھی تھی۔ یہ دونوں نادر اشیا ان کو بے حد پسند آئی تھیں۔ معلوم ہوا کہ وہ پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے دکان میں سامان دیکھ رہے تھے۔ اور بڑے غور و خوص کے بعد یہ دو اشیا انہیں پسند آئی تھیں۔ یحییٰ صاحب لڑکی کو یہ بتا چکے تھے کہ یہ رکابی بے مثال ہے جس میں کلوپیڑا کھانا کھایا کرتی تھی۔ گلدان بھی کسی فرعون کے زمانے کا ہی ہوگا۔ جو کسی فرعون کے بیڈ روم کی زینت رہا ہوگا۔ بہرحال۔ جو بھی تھا۔ وہ تینوں ان چیزوں پر فریفتہ ہو چکے تھے اور پچھلے ایک گھنٹے سے قیمت پر جھگڑا چل رہا تھا۔ یوں تو سبھی مصریوں کو ہم نے مول تول اور بھاؤ تاؤ کرنے کے معاملے میں استاد پایا مگر نوادرات کی دکانوں والے تو ان سب کے کان کاٹتے تھے۔ وہ ہر چیز کی قیمت کا آغاز ہزاروں ڈالر سے کر کے چند سو ڈالر میں فیصلہ کر لیتے تھے۔ مثلاً "ایک دن بات طے نہ ہوئی تو وہ دوسرے دن چلے آئے اور پھر مول تول شروع ہو گیا پھر بھی تصفیہ نہ ہوا تو اگلے دن پھر آ گئے۔ دکانداروں کو ان کی نفسیات کا علم ہو جاتا تھا اور وہ جانتے تھے کہ وہ کم سے کم قیمت پر رضا مند ہو جائیں گے۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ سودا بازی آخری مرحلے میں تھی۔ ان لوگوں نے قیمت ادا کی اور عمارہ نے جھٹ پٹ نہایت سلیقے سے سامان کو پیک کر کے ان کے حوالے کر دیا۔ اس اثناء میں عمارہ کئی بار ہمارے پاس سے گزری اور یہ تاکید کر گئی کہ آپ اتنی دیر میں اپنے لیے کچھ پسند کر لیں۔

خدا خدا کر کے امریکیوں سے فراغت ملی تو یحییٰ صاحب سے (یا ان کا جو بھی نام تھا) ہمارا کا تعارف ہوا۔ وہ تو پگھل کر موم کا مجسمہ بن گئے اور ہمارے سامنے بچھ گئے۔ عمارہ کو ہدایت کی کہ وہ قہوہ لے کر آئے اور خود نوادرات کے بارے میں ہماری معلومات میں اضافہ کرنے لگے۔ جب دس منٹ تک ان کی تقریر دلپذیر ختم نہ ہوئی تو قاسم نے انہیں عربی میں بتایا کہ یہ لوگ گاہک نہیں ہیں۔ میرے دوست ہیں۔ انہیں نوادرات کی دکان دیکھنے کا شوق تھا اس لئے آپ سے ملانے چلا آیا۔

یہ سن کر ان کا جوش و خروش کچھ کم پڑ گیا مگر خاطر مدارات میں کمی نہیں آنے دی۔ عمارہ ایک پتھر کی ٹرے میں قہوے کی پیالیاں رکھ کر لائی اور بتایا کہ یہ ٹرے دو ہزار سال پرانی ہے۔ پیالیاں بھی کم از کم ڈیڑھ ہزار سال پرانی تو ضرور ہوں گی۔

"اور قہوہ؟" ہم نے پوچھا۔

اس کے والد تو اس مذاق کو نہیں سمجھے مگر وہ بہت زور سے ہنسی اور کہا کہ قہوہ مصر کا بہت قدیم مشروب ہے لیکن افسوس کہ فرعونوں کے زمانے کا قہوہ آپ کی خدمت میں پیش نہیں کر سکتی۔ قہوے کے ساتھ کیک پیسٹری بھی تھی۔ یہ چیزیں غالباً گاہکوں کی تواضع کے لئے رکھی جاتی ہیں۔ خان صاحب نے ہمارے کان میں کہا۔ "کیک پیسٹری ہرگز نہ کھانا۔"

"وہ کیوں؟"

"پتا نہیں کتنی پرانی ہوگی۔"

ہم نے ان کی یہ بات عمارہ اور قاسم کو سنائی تو وہ ہنسنے لگے۔ عمارہ نے کہا "کھانے پینے کے سامان کے علاوہ یہاں کوئی چیز آپ کو جدید تازہ نہیں ملے گی۔"

"خود اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟" ہم نے پوچھا۔

ہنسنے لگی۔ بولی۔ "آپ نے ناول "شی" تو پڑھا ہوگا جس میں وہ عورت ایک مقررہ عرصے بعد مقدس آگ میں تو غسل کر کے نوجوان ہو جاتی تھی میں آگ میں غسل تو نہیں کرتی مگر وہ جڑی بوٹیاں استعمال کرتی ہوں جو قدیم مصر کی شہزادیاں استعمال کرتی تھیں۔"

خاں صاحب نے پوچھا۔ "تو آپ کی عمر کیا ہوگی؟"

کہنے لگی۔ "ابھی ڈھائی سو سال ہوگی۔"

ہم نے کہا۔ "دنیا میں پہلی عورت دیکھی ہے جو نہ صرف اپنی عمر بتا دیتی ہے بلکہ اسے بڑھا چڑھا کر بتاتی ہے۔"

بولی۔ "یہ بھی کاروبار کی ضرورت ہے۔ آخر قدیم نوادرات کی دکان ہے۔ یہاں نئی چیزوں کا کیا کام؟"

ہم نے یحییٰ صاحب کو بتایا کہ کل ہم اہرام دیکھنے جائیں گے۔

بولے ۔"اب وہاں کیا رکھا ہے خالی مقبروں کے سوا۔ سب کچھ تو عجائب گھروں اور نوادرات کی دکانوں میں منتقل ہوگیا ہے۔ دنیا کا کوئی قابل ذکر میوزیم ایسا نہیں ہے جہاں قدیم مصر کی اشیاء نمائش کے لیئے موجود نہ ہوں۔"

بات ان کی بالکل درست تھی۔ ہم نے لندن کے میوزیم میں بھی مصری ممیاں اور قدیم مصر کے نوادرات دیکھے تھے۔ یوں سمجھئے کہ ان کی دکان میں جو کچھ موجود تھا کم وبیش وہی سب کچھ لندن کے میوزیم میں بھی تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہاں بہت ترتیب اور سلیقے سے سجا کر رکھا گیا تھا اور یہاں کباڑ کی صورت میں بکھرا پڑا تھا۔

قاسم نے عمارہ کو دعوت دی کہ وہ بھی اگلے دن ہمارے ساتھ اہرام دیکھنے چلے۔ وہ ہنسنے لگی۔ بولی ۔" جب سے ہوش سنبھالا ہے اہرام دیکھ رہی ہوں۔ اب تو انہیں دیکھ دیکھ کر آنکھیں پتھراگئی ہیں ۔ اس لیے معذرت خواہ ہوں۔

ز وہ بہت سمجھدار اور سلیقے کی لڑکی تھی۔ صورت شکل بھی ہزاروں میں ایک

جب ہم واپس آرہے تھے تو بٹ صاحب نے کہا۔ "قاسم کی تو لاٹری نکل آئی ہے۔"

واپسی میں قاسم نے ہمیں دوسری گلیوں سے گزارا مگر ماحول کم و بیش ویسا ہی تھا۔ جب ان تنگ و تاریک گلیوں سے نکل کر کھلی جدید سڑک پر آئے تو دنیا ہی بدلی ہوئی تھی۔ ماڈرن شو رومز، چمکتی ہوئی روشنیاں، جگمگاتی ہوئی دکانیں ۔ کاروں کی ریل پیل۔ فیشن ایبل ملبوسات میں مٹرگشت کرتی ہوئی عورتیں ۔ اب پیدل چلنے کا یارانہ تھا اس لیے ٹیکسی روکی گئی ۔ قاسم نے ہم سے معذرت طلب کرلی ۔ اسے کہیں اور جانا تھا ۔ اس لیے وہ ہمیں ہوٹل تک چھوڑنے نہیں جاسکا ۔ اگلے روز صبح نو بجے کا وقت مقرر ہوا۔ خان صاحب یہ سن کر سوچ میں پڑگئے۔

قاسم نے پوچھا۔"کیا بات ہے۔ کیا آپ دیر سے بیدار ہوتے ہیں۔"

بولے۔ "یہ بات نہیں ہے۔"

"تو پھر مسئلہ کیا ہے؟"

کہنے لگے۔"سب سے بڑا مسئلہ تو غسل خانہ ہے۔ خیر۔ تماری خاطر آدھی رات کو اٹھ کر تیاری شروع کردیں گے۔"

اہرام ہی مصر کی سب سے امتیازی خصوصیت ہیں۔ ورنہ دریا تو ہر ملک میں ہوتے ہیں۔ تاریخی عمارتیں، یادگاریں، مقبرے اور مساجد بھی ہر ملک میں مل جاتی ہیں یورپ کے ملکوں میں ایسے ایسے شاندار اور عظیم گرجا گھر ہیں۔ کہ انہیں دیکھ کر عقل حیران رہ جاتی ہے۔ ساری دنیا میں محلات کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔ مشرق اور مغرب کے ممالک میں ایک سے بڑھ کر ایک پر شکوہ محل دیکھ لیجئے۔ پرانے قلعے بھی کم تعداد میں نہیں ہیں ۔ فرق صرف یہ ہے کہ بعض ملکوں نے ان چیزوں کو احتیاط سے اور سینت سینت کر رکھا ہے۔ ان کو سجاتے سنوارتے رہتے ہیں تاکہ نہ صرف ان کا شکوہ قائم رہے بلکہ ملکوں ملکوں سے آنے والے سیاحوں کی دلچسپی کا باعث بھی بن جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ان ملکوں میں سیاحت بھی ایک بڑی صنعت ہے۔ بعض ممالک میں تو یہ پہلے دوسرے یا تیسرے درجے کی سب سے بڑی صنعت ہے جس سے بے بہا غیرملکی زرمبادلہ کمایا جاتا ہے۔ سری لنکا جیسے چھوٹے سے خانہ جنگی کے مارے ہوئے ملک میں ہر سال چار لاکھ سے زیادہ سیاح پہنچ جاتے ہیں۔ یورپ، امریکا اور ایشیا کے دوسرے ملکوں کا بھی یہی عالم ہے اور تو اور ہمارے ہمسائے ملک بھارت کو دیکھ لیجئے ۔ ویسے مجموعی طور پر ان کا حال بھی ہم سے بہت زیادہ بہتر نہیں ہے لیکن پھر بھی وہ سیاحت پر کافی توجہ دیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے اطراف عالم سے سیاح وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ بھارت ایک بڑا اور قدیم ملک ہے۔ وہاں کی تہذیب بہت پرانی ہے اور مغرب میں بھی بھارت کے متعلق ہمیشہ سے پراسرار قسم کی کہانیاں مشہور ہیں، یہی وجہ ہے کہ نالائقی کے باوجود وہاں سیاحوں کی خاصی بڑی تعداد ہر سال پہنچ جاتی ہے۔ ہندوستان بھی رنگا رنگ تہذیبوں اور مختلف نسلوں کا ملک ہے۔ بلکہ اسے ایک ملک کہنا ہی درست نہ ہوگا۔ سیاحوں کے لیئے وہاں بھی بہت کچھ موجود ہے۔ یونان اور روم کی تہذیب بھی کافی قدیم ہے اور قدیم دور کی یادگاریں یہاں بھی بکھری ہوئی ہیں مگر حقیقت ہے کہ جو بات اہرام مصر میں ہے وہ کسی اور میں نہیں ہے۔ بڑے پتھروں اور خاص قسم کے

مسالے سے تعمیر کیے ہوئے یہ نوکدار تکون جیسی عمارتیں دنیا بھر میں بے مثال ہیں۔ ان میں نفاست اور نزاکت نام کو نہیں ہے۔ وقار اور ہیبت البتہ بہت زیادہ ہے۔ قلعے، محلات، مساجد اور گرجاگھر اور دوسری عمارات کا تو پھر بھی کوئی مقصد اور افادیت ہوتی ہے مگر اہرام بالکل بے معنی عمارتیں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آج کل یہ قطعی بے مقصد پتھروں کے ڈھیر ہی کہے جاسکتے ہیں۔ اس لیے کہ انہیں دراصل فرعونوں کے مقبروں کے طور پر تعمیر کیا گیا تھا۔ ہر فرعون اپنا مقبرہ دوسرے سے بڑھ چڑھ کر بنوانا چاہتا تھا۔ ان کی تعمیر پر ہزاروں مزدور اور غلام لگادیئے جاتے تھے جو شب وروز کام کرتے تھے۔ اس کے باوجود بعض اہرام ایسے ہیں جن کی تعمیر پر بیس سال سے زیادہ عرصہ لگ گیا۔

اب تک جو اہرام دریافت کیے گئے ہیں ان کی تعداد ساڑھے چار سو سے زیادہ ہے جن میں چھوٹے بڑے ہر طرح کے اہرام شامل ہیں۔ ماہرین نے دریافت کیا ہے کہ ان میں سے بعض دو ڈھائی ہزار سال پہلے تعمیر کیے گئے تھے لیکن ان سے بھی زیادہ قدیم زمانے کے اہرام بھی بعد میں دریافت کیے گئے۔ یہ سب کے سب اہرام ریگستان اور صحرا میں ہیں۔ پہلے تو فرعونوں نے ان کے اندر اپنے مقبرے بنوائے اور اندر تابوت رکھنے کے بعد تمام راستے مسدود کردیے مگر اللہ بھلا کرے چوروں کا۔ انہوں نے اس زمانے میں بھی پتھروں کے ان ٹھوس اہرام میں نقب لگائی اور سرنگ نما راستوں کی مدد سے تابوت اور قیمتی نوادرات تک پہنچ گئے۔ اب فرعونوں کی بے بسی ملاحظہ فرمائیے کہ کہنے کو وہ فرعون تھے اور اپنے آپ کو خدا کہا اور کہلوایا کرتے تھے۔ آسمان پر موجودہ خدا کو وہ خاطر میں ہی نہیں لاتے تھے۔ ان کے پاس بہت بڑے بڑے لشکر ہوا کرتے تھے۔ دولت اور اختیار کی بھی کمی نہیں تھی۔ جو شخص اپنے آپ کو خدا کا ہم پلہ سمجھتا ہے اس کی قدرت و طاقت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ مگر چور اور نقب زن ان پر بھی بازی لے گئے۔ جب فرعونوں کو پتا چلا کہ ان سے پہلے والے فراعنہ کے مقبروں کا چوروں نے کیا حشر کیا ہے تو انہوں نے تنگ آکر یہ ترکیب نکالی کہ مقبرہ کہیں اور بنواتے تھے اور تابوت کسی اور جگہ دفن کیا جاتا تھا۔ تاکہ مرنے کے بعد چوروں اور نقب زنوں کی لوٹ کھسوٹ سے محفوظ رہ سکیں مگر خدا بھلا کرے نقب

زنوں کا۔ وہ یہ راز بھی پاگئے اور فراعنہ کی ممیاں تک گھسیٹ کر ساتھ لے گئے۔ بہرحال اہرام کی شکل میں جو کچھ باقی رہ گیا یا جو بھی ان مقابر کے اندر سے دریافت کیا گیا وہ بھی نادر الوجود ہے اور اسے دیکھ کر عقل انسانی حیران رہ جاتی ہے۔

ہم ٹیکسی میں سوار ہوکر قاہرہ سے صبح نکل کھڑے ہوئے۔ ہماری منزل "اہرام" تھے۔ شہر کا نواحی علاقہ شروع ہوا اور ختم ہوگیا مگر سڑک آگے بڑھتی رہی یہاں تک کہ ہم "بادشاہوں کی وادی" میں پہنچ گئے۔ وہ صحرا کا وہ حصہ ہے۔ جس میں اہرام موجود ہیں۔ اتنے بہت سے فرعون یہاں دفن ہیں کہ اسے بادشاہوں کی وادی کا نام دے دیا گیا ہے۔ ایک دو بادشاہوں کے مقبرے ہی کچھ کم اہمیت کے حامل نہیں ہوتے۔ یہاں تو سینکڑوں بادشاہ ریت کے ٹیلوں اور پتھروں کے بھاری بھرکم انباروں تلے دفن ہیں۔ بلکہ اب تو ان کی لاشیں اور تابوت بھی باقی نہیں رہے۔ خالی خولی کھوکھلی عمارتیں ہیں لیکن مخلوق خدا ہے کہ ان مصنوعی خداؤں کے مسکنوں کو دیکھنے کیلئے ٹوٹی پڑتی ہے۔

قاسم نے ہمیں بتانا شروع کردیا کہ وہ دیکھیے۔ اہرام۔

ہم نے چلتی گاڑی سے دیکھا تو سڑک سے کچھ فاصلے پر پتھروں کے ڈھیر سے نظر آئے۔ یہ بھی ان سینکڑوں اہرام میں شامل ہیں مگر قابل ذکر نہیں ہیں۔ چھوٹے موٹے فرعونوں کے مقبرے ہوں گے۔ جب ان سے کہیں بڑے اہرام موجود ہیں تو ان بے چاروں کو کون اہمیت دے گا؟

بعض اہرام بڑے اور اونچے بھی تھے۔ ہم نے کہا۔ "بھئی ان کو بھی ذرا اتر کر دیکھ لیں۔"

قاسم بولا" اگر انہیں دیکھنا شروع کردیا تو آپ کو ہفتوں لگ جائیں گے۔ پہلے میں آپ کو سب سے بڑا اور اہم اہرام دکھانے لے جارہا ہوں۔ اس سے آپ کو دوسرے اہرام کے بارے میں بھی اندازہ ہوجائے گا۔" ضرب المثل ہے کہ ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں۔ فرعون "خونو" کا ہرم سب سے عظیم الشان اور اونچا ہے۔ آسمان کی طرف اس عمارت کا ایک نوکیلا سا حصہ بلند ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ پھیلاؤ بھی بہت زیادہ ہے۔ قاسم نے ہمیں اعداد و شمار بھی بتائے تھے

مگر ہم نوٹ نہ کرسکے۔ یوں سمجھئے کہ اس کا قطرہ اتنا بڑا ہے کہ اگر اس کے گرد چکر لگائیں تو تھک جائیں۔ یہ بھی بڑے بڑے پتھروں سے بنا ہوا ہے۔ خدا جانے یہ بڑے بڑے بھاری بھرکم پتھر کہاں سے لائے گئے تھے اور انہیں اس قدر ترتیب سے ایک دوسرے کے اوپر کیوں کر رکھا گیا ہوگا۔ آج کل تو کرین اور دوسری جدید مشینیں موجود ہیں۔ وہ زمانہ محض انسانی محنت اور ذہانت کے مظاہرہ کا تھا۔ اور پھر ان دیو قامت پتھروں کو ایک خاص انداز میں کیونکہ تراشا گیا اور اس طرح ترتیب اور سلیقے سے کس طرح رکھا گیا؟ یہ سب کچھ ایک حیران کن تجربہ ہے اور سچ تو یہ ہے کہ جب تک اہرام کو خود اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا جائے ان کی عظمت وہیبت اور شان وشوکت کے بارے میں اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔

"خونو" کا ہرم دیکھنے کے لئے سب سے زیادہ لوگ آتے ہیں جن میں غیر ملکی سیاحوں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے۔ جگہ جگہ یہ لوگ ٹولیوں کی صورت میں بکھرے ہوتے ہیں۔ یوں سمجھئے کہ قدیم وجدید کا امتزاج اس سے زیادہ کسی اور جگہ دیکھنے کو نہیں ملتا۔ کہاں ہزار ہا سال پرانے اہرام اور کہاں جدید ترین فیشن کے ملبوسات اور میک اپ سے سجی ہوئی خواتین جن کے ساتھ خوشبوؤں کے ریلے ریگستانوں کو بھی چمن زار کا روپ دے دیتے ہیں۔ ٹورسٹ ٹولیوں میں ہوتے ہیں اور ہر ٹولی کے ساتھ ...ے کم ایک گائیڈ یورپ والوں کی نفسیاتی ضرورت ہے۔ آپ چاہے انہیں کتنی ہی بے بہا معلومات فراہم کردیں مگر انہیں تسلی نہیں ہوتی جب تک وہ گائیڈ کی زبانی سچ ...پ نہ سن لیں ان کو چین نہیں آتا۔

ہمارے ساتھ گائیڈ کے طور پر قاسم تھے۔ اہرام کے بارے میں ضروری معلومات وہ پہلے ہی ہمیں فراہم کرچکا تھا لیکن ہم نے دیکھا کہ خاں صاحب اور بٹ صاحب اس جمگھٹے میں ضرور شریک ہوجاتے تھے جو گائیڈ کی نگرانی میں ہوتا تھا۔ صحرا میں رنگ برنگے پیرہن اور روشن چہرے دیکھ کر ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ ہر گائیڈ اپنی ٹولی کی اس طرح نگہداشت کرتا ہے جس طرح چوزے مرغی کو گھیرے رہتے ہیں۔ ایک دوبار تو ہم نے صبر کرلیا مگر پھر صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا جب دیکھا کہ خاں صاحب میموں کے ایک گروہ کے ساتھ کھڑے ہیں۔ میمیں اور گورے تصاویر اتارنے اور اہرام کو دیکھنے میں مصروف ہیں اور یہ بقول شاعر ہم دیکھنے والوں کی

ادا دیکھ رہے ہیں۔

آخر ہم نے ان کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا تو وہ ذرا چونک پڑے۔

"کون ہے؟ کیا بات ہے؟"

ہم نے کہا۔"بھائی ہم ہیں اور بات یہ ہے کہ آپ ہمارے ساتھ کیوں نہیں رہتے۔ سیاحوں اور خواتین کے ساتھ کیوں گھسے جارہے ہیں؟"

بولے۔" میں تو صرف گائیڈ کی باتیں سن رہا تھا۔"

"وہ سب کچھ تو قاسم بھی آپ کو بتا چکا ہے۔"

کہنے لگے۔"میں دراصل یہ اندازہ لگانا چاہتا ہوں کہ قاسم نے ہمیں جو کچھ بتایا ہے وہ کتنا درست ہے۔ میں نے یہ نوٹ کیا ہے کہ قاسم نے ہمیں بہت سی باتیں نہیں سنائیں مثلاً یہ کہ فرعون اپنی ملکاؤں کے ساتھ آخری رسومات کے سلسلے میں کیا سلوک کرتے تھے اور ان کے لئے بھی اپنے ساتھ ہی تابوت بنوالیا کرتے تھے بہت سے فرعونوں نے تو اپنے پسندیدہ گھوڑے بھی اپنے ساتھ ہی دفن کرالیے۔"

ہم نے کہا۔"خاں صاحب یہ گائیڈ کا پیشہ ہے کہ سیاحوں کو دلچسپی کا سامان فراہم کرے مگر گائیڈ کی ہر بات درست نہیں ہوتی۔ ان لوگوں نے بہت سی کہانیاں بھی گھڑی ہوتی ہیں۔ ٹورسٹ بے چارے کو تو اصلیت کا پتا ہی نہیں ہوتا۔ وہ ان کی ہر بات کو سچ سمجھ لیتے ہیں۔"

ہم انہیں پکڑ کر اپنے ساتھ لے آئے تو دیکھا کہ قاسم غریب ایک اونٹ کے پاس اکیلا کھڑا ہے۔ ہم شاید یہ بتانا بھول گئے کہ سیاحوں کی آمد کے پیش نظر یہاں اونٹ والے بھی اپنے اونٹوں کو سجابنا کر لے آتے ہیں اور انہیں اونٹوں کی سواری کراتے ہیں۔ مغربی سیاح تو ہر نئی چیز میں دلچسپی لیتے ہیں۔ وہ اونٹ پر بھی سواری کرلیتے ہیں۔ اونٹ والے تھوڑی بہت انگریزی جانتے ہیں اور سیاحوں کو خصوصاً خواتین کو اونٹوں کے بارے میں بھی بہت سی من گھڑت کہانیاں سنا دیتے ہیں۔ اس طرح کچھ بخشش بھی اینٹھ لیتے ہیں۔

ہم نے قاسم سے پوچھا۔" بٹ صاحب کہاں ہیں؟"

اس نے ہاتھ سے اشارہ کردیا۔ دیکھا کہ کچھ فاصلے پر دوسرے اونٹ پر بیٹھی ہوئی دو میموں کی تصاویر بنانے میں مصروف ہیں۔ ہم حیران ہوئے کہ ان کے پاس کیمرہ

کہاں سے آگیا اور انہیں نامحرم اور غیر عورتوں کی تصویر بنانے کی کیا ضرورت پیش آگئی۔

خاں صاحب بہت ناراض ہوئے۔ "گائیڈ کی باتیں سننے کے لئے کھڑا ہوگیا تو قیامت ڈھادی۔ وہ شخص خود کو تماشا بنا رہا ہے تو اسے کوئی کچھ نہیں کہتا۔"

ہم نے کہا۔ "اطمینان رکھیں۔ وقت آنے پر انہیں بھی کہاجائے گا۔"

خاں صاحب اور قاسم کو لے کر ہم بٹ صاحب کے پاس پہنچے تو وہ اس وقت ساربان کو ہدایت کررہے تھے کہ اونٹ کو بٹھا دیاجائے۔ اونٹ پر سواری کرنا اور اس پر سے اترنا بھی ایک تکنیکی عمل ہے جو ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ مثلاً" اونٹ ایک دم کھڑا نہیں ہوجاتا بلکہ دو تین جھٹکے کھاکر کھڑا ہوتا ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ یہ عجیب وغریب بے ہنگم مخلوق ہے اسی لئے وہ ضرب المثل مشہور ہے کہ اونٹ رے اونٹ۔ تیری کون سی کل سیدھی؟ یہ بھی قدرت کی کاریگری ہے کہ کئی جانور ایسے حسین اور متناسب تخلیق کیئے ہیں۔ کہ صنعت کاری دیکھ کر عقل حیران رہ جاتی ہے۔ مگر اونٹ ایک ایسا جانور ہے جس کے جسم کا کوئی ایک حصہ بھی متناسب نہیں ہے۔ یوں لگتاہے جیسے فرشتوں نے جلدی میں بچی کھچی مٹی کے تودوں کو جوڑ کر ایک مخلوق بنادی جس کو ہم اونٹ کہتے ہیں۔

بہرحال جب بٹ صاحب نے ساربان کو اونٹ بٹھانے کا حکم دیا تو اونٹ نے اس کے اشارے پر اپنی ٹانگوں کو تہہ کرنا شروع کردیا اور پھر آخر کار ایک جھٹکے سے زمین پر بیٹھ گیا۔ بٹ صاحب غالباً" اس جھٹکے کی توقع نہیں کررہے تھے اس لئے بے خبری میں اونٹ پر سے گر گئے۔ سامنے والے اونٹ پر سوار خواتین نے بے ساختہ ہنسنا شروع کردیا۔ یہ دیکھ کر بٹ صاحب پھرتی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور کپڑوں سے مٹی جھاڑنے لگے۔ انہوں نے ابھی تک ہم لوگوں کو نہیں دیکھا تھا۔ اب انہوں نے زمین پر کھڑے ہوکر ان دونوں حسیناؤں کی تصویریں بنانا شروع کردیں جو بڑی مشکل سے اپنی اسکرٹ کو سمیٹ کر اونٹ پر بیٹھی تھیں لیکن اس کے باوجود ان کی ٹانگیں بہت دور تک لباس سے بیگانہ تھیں۔

ہم نے بٹ صاحب کو جالیا اور پوچھا۔" آپ یہ کیا کررہے ہیں اور یہ کیمرہ کہاں سے آیا؟ کیا کسی کا چرا لیا ہے؟"

کہنے لگے۔ "کیمرا سامنے والی خواتین کا ہے۔وہ بے چاریاں اونٹ پر سوار ہوکر اپنی تصویریں بنوانا چاہتی تھیں۔ اس لیئے میں نے ہامی بھرلی۔"

خاں صاحب نے کہا۔" آپ کے سوا انہیں اتنے بڑے جہاں میں کوئی اور فوٹو گرافر نظر نہیں آیا؟ اور یہ بتایئے کہ آپ ہم لوگوں کو چھوڑ کر ادھر آئے کیوں تھے؟"

بولے۔"میں نے کتابوں اور شعروں میں لیلیٰ کے محمل کے بارے میں بہت کچھ پڑھا تھا۔ سوچا اب موقعہ ملا ہے تو کیوں نہ سچ مچ کے محمل دیکھ لوں۔ لیلیٰ بھی تو شاید اسی طرح محمل پر سوار ہوتی ہوگی۔"

خاں صاحب نے کہا۔" بھائی لیلیٰ گوری نہیں کالی تھی۔ اس زمانے میں گدھے اور اونٹ کی سوا کوئی اور سواری نہیں تھی۔ اس لیئے ظاہر ہے کہ وہ بھی اونٹ پر سوار ہوتی ہوگی مگر یہ آپ کی اخلاق سے گری ہوئی حرکت ہے کہ نامحرم عورتوں کی تصویریں بنانے لگے اور وہ بھی ننگی۔"

"لاحول ولا قوۃ۔" بٹ صاحب گھبرا گئے۔"وہ ننگی تو نہیں ہیں۔"

"تین چوتھائی ننگی ہیں۔ انتہائی اخلاق سوز کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ آپ نے شرم آنی چاہئے۔ قاسم ہم لوگوں کے بارے میں کیا سوچتا ہوگا؟ اور پھر اونٹ پر سوار ہونے کی کیا ضرورت تھی؟"

بٹ صاحب واقعی کچھ شرمندہ ہوگئے۔ کہنے لگے۔ "میں بس اخلاقاً مان گیا تھا۔ دراصل وہ چاہتی تھیں کہ اونٹ پر چڑھ کر ان کی تصویریں اتاری جائیں۔"

"اگر وہ کہہ دیتیں کہ سر کے بل کھڑے ہوکر ان کی تصویریں بنائیں تو آپ مان جاتے؟ نامعقولیت کی کوئی حد ہوتی ہے۔ لایئے یہ کیمرا میں انہیں واپس کرکے آتا ہوں۔" یہ کہہ کر انہوں نے بٹ صاحب کے ہاتھ سے کیمرا لے لیا اور خواتین کا "محمل" بھی زمین پر بیٹھ چکا تھا۔ خاں صاحب نے ان سے جاکر نہ جانے کیاکہا۔ دوسرے لمحے ہم نے دیکھا تو وہ ان کی تصویر بنارہے تھے۔ اس بار ساربان بھی ان لڑکیوں کے برابر کھڑا تھا۔

"دیکھا آپ نے!" بٹ صاحب نے فریاد کی۔" اب ان کا اخلاق کہاں چلا گیا؟"

خاں صاحب کچھ دیر بعد واپس لوٹے اور ہمارے کچھ بولنے سے پہلے ہی اپنی صفائیاں پیش کرنے لگے۔

"وہ اونٹ والا جو ہے نا۔ وہ حدی خوان ہے۔ ریڈیو سے گاتا ہے اور اسکی آواز اتنی اچھی ہے کہ ریگستان میں چلنے والے اونٹ ریڈیو پر اس کی آواز سن کر دوڑنے لگتے ہیں۔ وہ دونوں حدی خوان کے ساتھ بھی تاریخی تصویریں بنوانا چاہ رہی تھیں ویسے بھی کیمرے میں تین چار تصویروں کی فلم ہی رہ گئی تھی۔ میں نے سوچا جلدی سے بنا دیں۔ خس کم جہاں پاک۔"

ہم نے کہا۔" آپ لوگ یہاں فوٹو گرافی کے مقابلے میں شریک ہونے آئے ہیں یا اہرام دیکھنے؟"

خاں صاحب بولے۔" بھائی خونو کا اہرام وہ سامنے رہا۔ ہم نے دیکھ لیا ہے۔ وہ تو اندھے کو بھی نظر آسکتا ہے۔"

قاسم نے کہا۔" اس کے اندر چلنے کا ارادہ ہے؟"

وہ دونوں حضرات فوراً" تیار ہوگئے۔ وجہ یہ تھی کہ اہرام کے اندر جانے والے راستے کے سامنے ایک بڑا مجمع لگا ہوا تھا جن میں بہت بڑی تعداد خواتین کی بھی تھی۔

ہم نے کہا۔"اچھی طرح سوچ لیں۔ وہاں لفٹ یا سیڑھیاں نہیں ہیں۔ جھک کر چلنا پڑتا ہے۔ بہت تنگ سرنگ نما راستہ ہے جس میں نہ روشنی کا انتظام ہے نہ ہوا کا۔ حبس سے دم گھٹ جاتا ہے۔"

قاسم نے کہا۔" آپ اندر جانا چاہتے ہیں تو جائیں مگر میں مشورہ نہیں دوں گا۔ کچھ لوگ تو چند قدم چل کر ہی بے ہوش ہوجاتے ہیں۔وہاں اتنی جگہ نہیں کہ وہاں لٹادیا جائے۔ یا کاندھے پر اٹھاکر باہر لایا جائے۔"

" پھر کیسے لاتے ہیں؟" ہم نے پوچھا۔

"ٹانگیں گھسیٹتے ہیں۔ راستے سے اگر واپس لوٹنا چاہیں تو وہ بھی ممکن نہیں ہے۔ تابوت والے کمرے تک پہنچنے کے بعد ہی واپسی ہوتی ہے۔"

لاحول ولا قوۃ۔ ہمارا تو سن سن کر دم گھٹنے لگا اور پھر اندر جاکر دیکھنے کو ملے گا کیا۔ پتھروں کا ایک خالی کمرا اور خالی تابوت۔

قاسم نے ایسا بھیانک نقشہ کھینچا کہ خاں صاحب اور بٹ صاحب کی ہمت بھی جواب دے گئی۔

"خاں صاحب بولے۔" "کیسا خوفناک فرعون ہوگا جس کا نام ہی "خونو" تھا۔"

"خونو" کا مقبرہ بھی اہل مغرب ہی کی دریافت ہے۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں جب فرانس کی ایک مہم جو پارٹی بڑی مشکل سے اندر داخل ہوئی تو انہیں ایک تنگ سا راستہ نظر آیا وہ اس کی مدد سے کھدائی کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے مگر جب مقبرے تک پہنچے تو دیکھا کہ کمرا خالی پڑا ہے۔ نہ تابوت ہے نہ ہیرے جواہرات ہیں۔چوروں نے اچھی طرح مقبرے کی صفائی کردی ہے۔ تب انہیں یہ احساس ہوا کہ وہ جس راستے سے آئے ہیں وہ بھی غالباً چوروں ہی نے بنایا ہوگا۔گویا اس لحاظ سے پرانے زمانے کے چور آج کے ماہرین آثار قدیمہ سے زیادہ ہوشیار اور باعمل تھے۔ سنا ہے کہ راستہ بھی سیدھا اور ہموار نہیں ہے۔ اونچا نیچا ہے ۔ کہیں سے اسے برابر کرنے کیلئے اینٹوں اور لکڑی کے تختوں کی مدد لی گئی ہے۔

ہم بھی ہمت کرکے حرم کے دروازے تک پہنچ گئے۔ یہ کوئی باقاعدہ دروازہ تو ہے نہیں ۔ ایسے ہی پتھروں کو توڑ کر ایک ڈیوڑھی سی بنالی گئی ہے اور اس کے اندر ایک تنگ سی سرنگ اندر کو جاتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ڈیوڑھی میں قدم رکھتے ہی عجیب سی سیلی ہوئی حبس زدہ بو نتھنوں میں گھس گئی۔ جب آغاز میں یہ حال ہے تو آگے جاکر کیا عالم ہوگا؟ ہم تو وہیں سے پسپا ہوگئے مگر دیکھا کہ انگریزی سیاح اور بعض خواتین اندر جارہی تھیں۔ خدا جانے یہ لوگ کتنی دور تک سفر کریں گے اور کس حال میں واپس لوٹیں گے مگر ان کی ہمت کی داد دینی چاہیئے۔ جنہیں "خونو" کا مقبرہ بھی خوفزدہ نہ کرسکا تھا۔

بٹ صاحب نے اندر جانے کا ارادہ ملتوی کردیا مگر یہ خیال ظاہر کیا کہ اگر اندر نہیں گئے تو کیا ہوا۔ ہم حرم کے اوپر کیوں نہ چڑھیں؟

ہم نے پوچھا۔"آپ نے کبھی کوہ پیمائی کی ہے؟"

"کبھی اتفاق نہیں ہوا؟"

"توپھر ان چکنے اور ہموار پتھروں پر کیسے چڑھیں گے۔ یہاں تو کوئی سہارا تک

نہیں ہے۔ نہ پاؤں رکھنے کی جگہ ہے۔"

ویسے پولیس دور دور تک نظر نہیں آرہی تھی مگر یہ ڈر تو تھا کہ کہیں اچانک پولیس والا برآمد ہوگیا اور اس نے بٹ صاحب کو دھرلیا تو کیا کریں گے۔ پردیس میں تو سفارش ڈھونڈنا بھی مشکل ہوجائے گا۔ اس طرح اہرام کے اوپر چڑھنے کا پروگرام بھی ملتوی کردیا گیا۔

قاسم کی فرمائش تھی کہ ہم آس پاس کے دوسرے اہرام بھی دیکھیں۔

خاں صاحب نے پوچھا۔"کیا ان میں اور دوسرے اہرام میں کوئی فرق ہے؟"

"بالکل نہیں۔ صرف چھوٹے بڑے کا فرق ہے۔ باقی چیزیں بالکل ایک جیسی ہیں۔"

"توپھر بلاوجہ ریگستان میں مارے مارے پھرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ایک کو دیکھ لیا' سب کو دیکھ لیا اور یہ تو سب سے بڑا اور اہم ہرم ہے۔"

قاسم نے یہ سن کر بہت حیران ہوکر خاں صاحب کی طرف دیکھا۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ خاں صاحب اور بٹ صاحب روم اور فلورنس کے عجائب گھروں کے اندر بھی یہی کہہ کر جانے سے انکار کردیا کرتے تھے کہ سارے میوزیم ایک جیسے ہوتے ہیں۔ بلاوجہ پیسے خرچ کرکے وقت ضائع کرنے کا کیا فائدہ!

بٹ صاحب نے ادھر ادھر دیکھا اور کہا۔"ابوالہول صاحب نظر نہیں آرہے ۔ وہ کہاں پر ہوتے ہیں؟"

ابوالہول ' خونو کے ہرم سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔ ہم نے بھی اس کے بارے میں بہت سن رکھا تھا اور پڑھا بھی تھا ۔ تصویروں میں بھی دیکھا تھا کہ پتھروں کو تراش کر ایک بہت بڑا مجسمہ بنایا گیا ہے جس کی صرف گردن ہی گردن ہے۔ باقی جسم پہاڑوں میں غائب ہوگیا ہے۔ غالباً" یہ بنایا ہی اتنا گیا تھا۔ مقصد پورٹریٹ بنانا ہوگا۔ یہ فرعون اعظم کا مجسمہ ہے ۔ جب اسے دیکھنے کے لئے گئے تو دور ہی سے صحرا میں ایک ہیبت ناک اور دیوقامت شکل نظر آگئی۔ اہرام اور ابوالہول کو اگر کسی چیز نے دنیا کے دوسرے عجائبات سے ممتاز کیا ہے تو وہ ان کا محل وقوع ہے ۔ عظیم الشان صحرا کی بیکراں وسعت کے درمیان یہ یادگاریں اور زیادہ نمایاں ہوجاتی ہیں۔ ان کے ارد گرد نہ درخت ہیں' نہ سبزہ زار' نہ چشمے اور دریا' نہ عمارتیں ۔ بس چٹیل میدان پڑا ہوا ہے

ریت کے اس سمندر کے درمیان میں جگہ جگہ یہ عمارتیں خودرو پودوں کی مانند اگی ہوئی ہیں۔

اس وسعت نے ان کو مزید عظمت اور کشادگی عطا کردی ہے۔ خدا جانے ابوالہول کا یہ مجسمہ کتنے ہزار مزدوروں ' کاریگروں اور ہنرمندوں نے سالہاسال کی مشقت کے بعد تراشا ہوگا لیکن یہ ادھورا ہی رہ گیا۔ اس کے باوجود اس کی شوکت اور انفرادیت دنیا کی دوسری تمام یادگاروں سے بالکل مختلف اور نرالی ہے۔ سر پر آسمان کی کھلی چھت ' نیچے پہاڑی زمین اور ارد گرد ریت کا لامحدود سمندر۔ اس پس منظر میں جب ابوالہول کو دیکھتے ہیں تو اس پر سے نظر ہٹانے کو جی نہیں چاہتا۔ حالانکہ یہ کوئی خوبصورت چہرہ نہیں ہے۔ نہ ہی اس کی تراش خراش میں زیادہ نفاست اور نزاکت ہے۔ اسے آپ آرٹ کا نمونہ بھی قرار نہیں دے سکتے مگر ابوالہول ' ابوالہول ہے ۔ اس کا ثانی کوئی اور نہیں ہے۔ شام ڈھلے اس کے ارد گرد و نواح میں روشنی اور آواز کا نہایت خوبصورت اور موثر پروگرام پیش کیا جاتا ہے تو ماحول میں ایک اور قسم کی کیفیت ' پراسراریت اور ہیبت وشوکت پیدا ہوجاتی ہے۔روشنیاں آس پاس کے مناظر کو باری باری منور کردیتی ہیں اور ایسے میں پس منظر سے ابوالہول کی بارعب آواز سنائی دیتی ہے جو اپنی شان وشوکت اور عظمت کی داستان سناتی ہے تو ہر طرف اس کا سحر طاری ہوجاتا ہے۔ ابوالہول ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے ۔ دیکھ بھال اور مرمت کا بھی کوئی خاص انتظام نہیں ہے ۔ تصویروں میں دیکھنے سے اس کی بڑائی کا احساس نہیں ہوتا لیکن اس کے سامنے کھڑے ہوئے انسان بونوں کی مانند حقیر اور بے وقعت نظر آتے ہیں۔ جب ہزاروں سال گزرنے کے بعد ان بے جان درودیوار اور مجسموں میں یہ رعب اور دبدبہ ہے تو جب یہ لوگ زندہ ہوں گے تو ان کے مرتبے اور دبدبے کی کیا کیفیت ہوگی؟

ایک بار ابن انشا نے بھی اہرام مصر اور ابوالہول کا نظارہ کیا تھا اور اپنے مخصوص انداز میں اس کا تذکرہ اپنے سفرنامے میں بھی کردیا تھا۔ ذرا انشاجی کے الفاظ میں یہ منظر ملاحظہ فرمایئے۔

"ابوالہول کی زبانی ہم نے آج شام کے جھٹ پٹے میں یہ ہنکار سنی کہ میں لازوال ہوں۔ دنیا موت سے ڈرتی ہے اور موت مجھ سے ڈرتی ہے ۔ میں اور خونو کا یہ ہرم اعظم رہتی دنیا تک کھڑے رہیں گے۔ ابوالہول کو نہ اپنی ناک نظر آتی ہے نہ ہرم

اعظم کا اکھڑا ہوا پلستر۔ نہ خونو کے تابوت کا خالی ظرف' سنگ وخشت اگر قائم بھی ہیں تو سنگ وخشت میں دھرا ہی کیا ہے۔ جو موت ادھر توجہ کرے ۔ کبھی خزاں نے پلاسٹک کے پھولوں کو بھی تاکا ہے؟ اسے تو تازہ شاداب گل پسند آتے ہیں ۔ پتھر باقی ہیں اور ریت باقی ہے ۔لیکن تو تنخ آمون ۔ملکہ نفرتیتی ۔ حسن کے تاجدار کہاں ہیں؟ عشق کے جان نثار کہاں ہیں۔ جہاں بیٹھے ہم ابوالہول کی ہنکار سن رہے تھے۔ عین وہاں کھڑے ہوکر انطونی اور کلوپیٹرا نے اہرام اور ابوالہول کو دیکھا ہوگا۔ یہاں سے ہیروڈوٹس نے ان پر نظر ڈالی ہوگی۔ یہیں سکندر اعظم کے دندناتے ہوئے قدم پڑے ہوں گے۔ ممفس کا شہر بسا اور اجڑا اور کل یہاں نپولین بوناپارٹ کھڑا تھا ۔ یہ ریت پر بنے ہوئے مٹتے ہوئے قدموں کے نشان ناموروں کے۔ ہم ایسے بے ناموں کے ۔

شب کے اندھیرے میں آس پاس کی فضاء کو ہم نے سرد آہوں سے بوجھل پایا۔ سسکیاں بھرتے سنا اور ابوالہول ہنکار رہا تھا۔ میں لازوال ہوں ۔ میں لازوال ہوں ۔ یکایک دیوار پر ایک سایہ نمودار ہوا۔ غور سے دیکھا تو ایک کتے کو پایا۔ جو کھنڈروں میں جانے کہاں سے نکل آیا تھا۔ اس نے ٹانگ اٹھائی۔ ابوالہول کے مسند کی ابدیت پر پیشاب کیا اور ایک طرف کو نکل گیا۔ اپنی سال دو سال کی زندگی سے لطف اندوز ہونے کیلئے ۔

ہم نے عہد عتیق کے عجائب گھر بہت دیکھے۔ ہر جگہ دیکھے۔ لندن میں 'جینوا میں ' لائیڈن میں ' ویانا میں' ایمسٹرڈیم میں لیکن قاہرہ کے عجائب گھر کے سامنے گرد ہیں۔ یہاں جاکران شاہان رفتہ کی عظمت وجبروت کا پتا چلتا ہے۔ یہ فرعون خاصے باسامان لوگ تھے۔ پھر ان کے معمار ' مہندس' ستارہ شناس ' نقش گر' خوشنویس۔۔۔۔

زمانے کے سیلاب نے نیچے کی مٹی اوپر کردی اور اوپر کی مٹی نیچے۔ اس سرزمین پر پھر یونانیوں نے قبضہ کیا اور رومن اسے آکر روند گئے ۔ عثمانیوں کے گماشتوں نے حکومت کی ۔ انگریز چھاؤنی ڈالے بیٹھے رہے اور آج اسے اسرائیلیوں کے غول کا سامنا ہے۔"

اب انشاء جی بھی نہ رہے مگر اہرام اور ابوالہول بدستور اپنی جگہ کھڑے آج بھی زمانے کو للکار رہے ہیں۔

قاسم کا پروگرام تھا کہ رات کو لائٹ اینڈ ساؤنڈ شو ضرور دیکھا جائے مگر وہ

قاہرہ میں ہماری آخری رات تھی۔ صبح ہمیں رخصت ہونا تھا۔ اس لیئے سوچا کہ اور کچھ بھی دیکھ لیا جائے۔

روشنی اور آواز کا یہ عظیم الشان شو ہم نے اگلی بار دیکھا۔ اس کی رو داد آگے بیان کریں گے۔

اہرام ہم نے دیکھ لیے تھے۔ ابوالہول سے بھی تعارف ہو چکا تھا۔ خاں صاحب اور بٹ صاحب اونٹ پر بھی سواری کر چکے تھے۔ سیاحوں کے میلے بھی دل بھر کر دیکھ لیے تھے اور مانگنے والوں کے غولوں سے بھی واسطہ پڑ چکا تھا۔ تھک ہار کر واپس جانے کا پروگرام سب سے زیادہ مناسب لگا مگر اس سے پہلے سوچا کہ ذرا تازہ دم ہونے کیلئے کچھ کھاپی لیا جائے۔ ابوالہول سے کچھ دور ایک خوبصورت ریستوران میں جاکر سب سے پہلے تو ہاتھ منہ دھویا پھر کولڈ ڈرنک پیا تو جان میں جان آئی۔ یہاں ویٹر ہم سے آرڈر لینے آیا تو خاں صاحب ٹال گئے۔ کچھ دیر بعد دوسرا آگیا پھر تیسرا اور چوتھا مگر خاں صاحب بدستور باتوں میں مصروف رہے اور انہیں بالکل نظرانداز کردیا۔

ہم نے کہا۔" یہ کیا حرکت ہے کہ انہیں آرڈر نہیں دے رہے۔ وہ بھلا کیا سوچتے ہوں گے کہ یہ لوگ مفت میں ہاتھ منہ دھونے اور تازہ دم ہونے کیلئے آکر بیٹھ گئے ہیں۔ اگر سارے گاہک ایسے ہی آنے لگیں تو ان کا بزنس تو چل چکا۔"

بولے۔"اس میں بھی ایک مصلحت ہے؟"

"آپ نے وہ نیلے پیلے پیرہن والی ویٹریس دیکھی ہے۔ خاصی دلکش ہیں۔ میں ان کی آمد کا منتظر ہوں مگر انہیں بلایا کیسے جائے؟"

بٹ صاحب نے مشورہ دیا۔"بہت آسان ترکیب ہے۔ آپ سامنے استقبالیہ پر جاکر ایک دو اچھی سی ویٹریسوں کا آرڈر دے دیجئے۔"

قاسم کے سامنے یہ مسئلہ پیش ہوا کہ آخر ویٹریس ہمارے پاس آرڈر لینے کیوں نہیں آتی ہیں۔

اس نے کہا۔"آپ نے دیکھا نہیں کہ وہ سامنے والے ہال تک محدود ہیں۔ اگر آپ کو ویٹریسوں کی خدمات درکار ہیں تو اس ہال میں چلئے۔"

"بھائی عجیب چیز ہیں آپ بھی ۔ پہلے کیوں نہیں بتایا تھا؟" خاں صاحب نے شکایت کی۔

"مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ ویٹریسوں کی خاطر یہاں آئے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ آپ کچھ کھانے پینے کے ارادے سے ریستوران میں آئے ہیں۔"

خاں صاحب نے کہا۔"حیرت کی بات ہے کہ تم کنوارے ہونے کے باوجود اس حقیقت سے بے خبر ہو کہ سروس کا جو ڈھنگ خواتین کو آتا ہے مرد اس سے محروم ہوتے ہیں۔"

اس نے کہا۔"شاید اسی لیے بے خبر ہوں کہ کنوارا ہوں۔"

بٹ صاحب نے فوراً اختلاف رائے کا اظہار کردیا۔"بہت بری بات ہے۔ اتنی دیر سے یہاں اس میز پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اب اٹھ کر وہاں جائیں گے تو یہ ویٹر کیا سوچیں گے؟"

"چاہے جو بھی سوچیں۔ ہمارا کیا بگاڑلیں گے۔ آج کے بعد تو ہم ان کی صورت بھی نہیں دیکھیں گے۔"

خاں صاحب کے اصرار پر ہم اس ائرکنڈیشنڈ یخ بستہ ہال میں چلے گئے جہاں طرحدار اسمارٹ ویٹریس تتلیوں کی طرح اڑتی پھر رہی تھیں۔ اس وقت ہال میں لوگ زیادہ نہیں تھے۔ کچھ یہ بات بھی ہے کہ ویٹریسوں کی تعداد زیادہ تھی۔ قاہرہ میں ہم نے تمام مشرقی ملکوں کی مانند یہ دیکھا کہ ایک ایک شخص کام کرنے کے لیئے تین تین چار چار افراد مقرر ہوتے ہیں اور بقول انشاء صاحب کے ان کی نگرانی کے لیے بھی ایک ایک شخص ہوتا ہے جو یوں ہی گھومنے پھرنے کے سوا کچھ نہیں کرتا۔ یہ ہم مشرقی لوگوں کی روایت ہے۔ اس لئے اتنا بڑا اسٹاف عام طور پر بے کا کھڑا رہتا ہے یا پھر آپس میں باتیں کرتا رہتا ہے۔ اس ریستوران میں مرد اور خواتین کی تعداد دو درجن سے زیادہ ہوگی۔ اگر یہی ریستوران یورپ کے کسی ملک میں ہوتا تو دو تین سے زیادہ اسٹاف ممبرز نہ ہوتے۔

ہم ریستوران کے "زنانہ حصے" میں گئے تو چند لمحے بعد ہی ایک صاحبہ مسکراتی ہوئی تشریف لائیں۔"اہلاً وسہلاً" انہوں نے خیرمقدم کیا۔

کسی اور کے بولنے سے پہلے ہی بٹ صاحب نے "مرحبا" کہہ کر انہیں لاجواب کردیا۔

انہوں نے عربی میں کچھ پوچھا تو بٹ صاحب کی ترکی بلکہ عربی تمام ہوگئی۔

بولے۔"واللہ اعلم۔"

وہ سمجھ گئی کہ عربی سے نابلد ہیں چنانچہ انگریزی میں مخاطب ہوئی۔ پہلے تو اس نے ہمیں مصر پہنچنے پر خوش آمدید کہا پھر اہرام اور ابوالہول دیکھنے کی سعادت حاصل کرنے پر مبارک باد پیش کی۔ اس کے بعد پوچھا کہ آپ لوگ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟"

خاں صاحب نے فوراً بتانا شروع کردیا۔"ہم لندن سے آرہے ہیں اور پاکستان جارہے ہیں۔پاکستان سمجھتی ہو نا؟"

"جی ہاں برادر اسلامی ملک ہے۔" اس نے فوراً جواب دیا۔

"بھئی حد ہوگئی۔ اس کی معلومات تو بہت زیادہ ہیں۔" بٹ صاحب نے کہا۔

"اب کہیں سیاحت پر بحث کرنے نہ بیٹھ جانا۔" خاں صاحب بولے اور کسی کے بولنے سے پہلے انہوں نے سب سے پہلے مینولانے کاآرڈر دیا۔ خاں صاحب کا اصول یہ ہے کہ ریستوران میں پروگرام کا آغاز مینو کے مطالعے سے کرتے ہیں اور اختتام بل کے مطالعے پر کرتے ہیں۔ اس میں فائدہ یہ ہے کہ مینو دیکھ کر اپنی پسند کی چیزوں کا آرڈر دے دیتے ہیں اور بل کا مطالعہ کرنے کے بعد اگر رقم زیادہ ہوتو وہ ساتھ والے کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔

لڑکی لہراتی ہوئی چلی گئی۔ خاں صاحب کچھ دیر دیکھتے رہے پھر بولے۔"خاصی اسمارٹ اور خوبصورت لڑکی ہے۔کون کہتا ہے کہ مصر میں حسن نہیں ہوتا۔"

ہم نے کہا۔"کم ازکم ہم تو نہیں کہتے۔"

مینولے کر جوویٹریس آئیں وہ کوئی اور تھیں۔ انہوں نے بھی مسکرا کر بڑے دل آویز انداز میں "اہلاً وسہلاً" کہا اور ایک ایک مینو سب کے حوالے کردیا۔

"اتنے مینولانے کی بھلا کی ضرورت تھی؟" بٹ صاحب بولے۔"ایک ہی کافی تھا۔"

خاں صاحب نے کہا۔" آپ بے فکر ہوکر مینو کامطالعہ کریں۔ اس کی قیمت بل میں شامل نہیں ہوتی، یعنی یہ کہ مفت ہوتا ہے۔"

وہ خاتون مینو دینے کے بعد رخصت ہوگئیں۔ ہم سب نے بغور مینو کا شروع کردیا، چند یورپین قسم کے کھانوں کے نام لکھے ہوئے تھے جو کبھی ہماری

سمجھ میں نہیں آئے۔ ایک دو فرنچ ڈشیں بھی تھیں جن سے پرہیز کرنا ہی دانش مندی ہے۔ چند اسنیکس بھی فہرست میں شامل تھے۔ان میں ہر قسم کے سینڈوچ تھے۔ یہاں تک کہ سؤر کا سینڈوچ بھی اس فہرست میں شامل تھا۔ ڈرنکس میں ہر قسم کی شراب سے لے کر کوکاکولا تک سبھی کچھ موجود تھا۔ جوس ' قہوہ اور کافی بھی آخر میں درج تھیں۔

بٹ صاحب نے فوراً" لاحول پڑھنی شروع کردی۔ قاسم بھی حیران ہوکر انہیں دیکھنے لگا۔

انہوں نے اعلان کیا کہ وہ اس ریستوران میں ہرگز کوئی چیز نہیں کھائیں گے۔

"مگر کیوں؟"

"آپ نے پڑھا نہیں ۔ یہاں سؤر بھی ہوتا ہے۔ یہ غلطی سے چکن سینڈوچ یا بیف سینڈوچ میں مکس بھی ہوسکتا ہے ۔ رکھا بھی ایک ساتھ ہی جاتا ہوگا۔ میں یہ حرام چیزیں کھانے کیلئے تیار نہیں ہوں۔" اعتراض ان کا نہایت معقول تھا لیکن خاں صاحب کو بہت بھوک لگ رہی تھی۔

کہنے لگے۔"یار یہ بھی آخر مسلمان ہیں ۔ سؤر والی چیزیں الگ رکھتے ہوں گے۔"

"آپ کا ایمان آپ کے ساتھ ہے اور میرا ایمان میرے ساتھ ۔ آپ کا جو جی چاہے کھائیں۔ بندے کو معاف رکھیں۔ میں کوکاکولا یا ملک شیک پی لوں گا۔"

"ایسا غضب نہ کرنا۔" خاں صاحب نے کہا۔"کوکاکولا کی بوتلیں بھی بیئر اور شراب کے ساتھ ہی رکھی جاتی ہیں۔ تم حرام چیز پیئو گے؟"

بٹ صاحب سچ مچ سوچ میں پڑ گئے ۔ چند لمحے بعد ایک نئی ویٹریس ہاتھ میں چھوٹی سی نوٹ بک لیے ہوئے آگئیں۔ یہ پہلی دونوں خواتین کے مقابلے میں زیادہ دلکش اور شوخ تھیں۔ انہوں نے قلم اور نوٹ بک سنبھالی اور ہمہ تن گوش ہوکر ہماری میز کے سامنے جھک گئیں۔ ان کا یہ پوز کافی دلکش تھا۔ اس لیے کچھ دیر تک کسی نے بھی کچھ نہیں کہا۔ یہاں تک کہ وہ تھک ہار کر دوبارہ سیدھی کھڑی ہوگئیں۔ دراصل ہم لوگ کھانے کے سلسلے میں کوئی فیصلہ نہیں کرپائے تھے۔

خاں صاحب نے آرڈر دینے کے بجائے اس سے سوال کیا۔"آر یو مسلم؟"

"نو سر۔ آئی ایم کرسچن ۔"

"تو پھر کچھ کھانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کرسٹان کے ہاتھوں سے میں زہر کے سوا کچھ نہیں کھاسکتا۔"بٹ صاحب نے اعلان کیا۔

"مگر یہ اہل کتاب ہے۔" خاں صاحب نے فوراً" مسئلہ بیان کردیا۔" ان سے شادی کرنا بھی جائز ہے۔"

"مگر ہم یہاں شادی کرنے نہیں آئے ہیں۔ کھانا کھانے آئے ہیں۔ بھائی کسی بھی چیز کا آرڈر دے دو۔ چاہے پانی منگالو۔ وہ کیاسوچتی ہوگی اپنے دل میں ؟"

"خیر میرے لیے کوک منگالیں۔ وہ منہ بند بوتلیں ہوتی ہے۔ اس لیے خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔"

بٹ صاحب نے ایک اور مسئلہ بیان کردیا۔" یہ لڑکیاں وہی ہاتھ تمام چیزوں کو لگاتی ہوں گی ۔"

ہم نے کہا۔" تو اس سے کہہ دیتے کہ پہلے اپنے ہاتھ دھولے۔"

خاں صاحب بولے۔"یا پھر سینڈوچ احتیاط" دھو کرلائے۔"

لڑکی رخصت ہوگئی تو بٹ صاحب فوراً" بولے۔ " اس کا نام تو پوچھا ہی نہیں۔"

"ایک کافرہ کا نام پوچھ کر کیا کریں گے۔ بلاوجہ اپنا ایمان خراب ہوگا۔"

سینڈوچ اور کوک لے کر دو اور مختلف ویٹریس آدھمکیں۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ وہاں سروس کے لئے ضرورت سے زیادہ اسٹاف تھا۔ بل لینے کے لئے جو صاحبہ آئیں وہ ان سے بالکل مختلف تھیں۔

ہم نے قاسم سے پوچھا۔"آپ لوگ اسٹاف کی اتنی فضول خرچی کیوں کرتے ہیں؟ اتنے بہت سے لوگ رکھنے کا فائدہ ؟ یورپ میں تو ایسا نہیں ہوتا"۔

بولا ۔"یا اخی ہمارے ملک میں بے روزگاری زیادہ ہے۔یورپ میں تو ایسا نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ ہمارے ہاں ایک ایک فرد پورے کنبے کو پالتاہے ۔ یورپ میں تو بس اپنی ذات کو پالنا پڑتا ہے۔ اب اگر اتنا زیادہ عملہ نہ رکھیں تو ہزاروں لاکھوں افراد بے روزگار ہوجائیں ۔ ان کے گھر والے بھوکے مرجائیں ۔"

بٹ صاحب جذباتی ہوگئے ۔ بولے ۔"میں اپنے الفاظ اور اعتراض واپس لیتا ہوں ۔ ہمارے ملک میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے اور شاید اسی وجہ سے ہوتا ہے ۔ وہاں بھی ایک کام پر کئی کئی لوگ رکھے جاتے ہیں جو آپس میں باتین اور سازشیں کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ اس لیئے ظاہر ہے کہ کام خراب ہی ہوتا ہے۔"

قاسم نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور کہا۔" ہم سب ترقی پذیر ملکوں کا یہی مسئلہ ہے۔"

"آخر ہم ترقی کیوں نہیں کرتے۔ ترقی یافتہ ملکوں کی صف میں شامل کیوں نہیں ہوتے۔" خاں صاحب نے سوال اٹھایا۔ یہ ایک لمبا قصہ تھا۔ ہمیں معلوم تھا کہ اس کا فیصلہ کبھی نہیں ہوگا۔ اس لیے یہ کہہ کر بات رفع دفع کردی کہ اس وقت ہمارے پاس ان باتوں کے لئے زیادہ وقت نہیں ہے اور یہ ایسے مسائل ہیں جنہیں حل کرنے کے لئے باتوں کی نہیں عمل کی ضرورت ہے ۔

جب ہم ریستوران سے باہر نکلنے لگے تو چھ سات ویٹریس خواتین دروازے کے پاس ہمیں "اللہ حافظ یا رفیقی" کہنے کیلئے صف بستہ کھڑی تھیں۔ ان کے اس اخلاص اور مسافر دوستی نے ہم سب کو بہت متاثر کیا۔

خاں صاحب نے کہا۔"کیوں نہ ہو۔ آخر ہمارا ان سے اسلام کا رشتہ ہے۔ تمام دنیا کے مسلمانوں کے درمیان ٹیلی پیتھی کے ذریعے بہت بہت مضبوط تعلق قائم رہتا ہے اس لئے تو وہ ایک دوسرے کی تکلیف پر بلک اٹھتے ہیں۔"

بٹ صاحب کا مشورہ تھا کہ یہ ان تمام لڑکیوں کے نام دریافت کرنے کا بہترین موقع ہے۔ وہ دونوں حضرات واقعی جذبات ہوگئے تھے بلکہ خاں صاحب تو فرمارہے تھے کہ اس شہر کے لوگ اتنے اچھے اور محبت کرنے والے ہیں ۔ کیوں نہ ہم کل کا سفر ملتوی کردیں اور کچھ دن مزید قاہرہ میں قائم کریں ۔

" اور ہرروز اس ریستوران میں کھانا کھانے کے لئے آئیں۔" ہم نے فقرہ مکمل کیا مگر ان تمام تصورات قاسم کے ایک جملے نے خاک میں ملادیا۔

اس نے کہا"یہ لڑکیاں ٹپ لینے کیلئے کھڑی ہیں ۔"

"ٹپ ؟ مگر کس بات کی۔ ٹپ اور سیلز ٹیکس تو بل میں شامل ہے۔"

"یااخی ۔ بخشش کی بات ہی الگ ہے ۔ ہمارے لوگ بخشش کو اپنا حق سمجھتے ہیں۔"

اب ہم اسے کیا بتاتے کہ ہمارے ہاں کے لوگ بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ جب تک آپ انہیں بخشش نہیں دیں گے وہ کسی طرح ٹلنے کا نام نہیں لیتے۔

ہم نے کہا۔" اگر ہم انہیں ٹپ نہ دیں تو کیا ہوگا؟"

قاسم نے کہا۔" کچھ نہیں ہوگا۔ آپ کے جانے کے بعد یہ آپ کو بہت برا بھلا کہیں گی۔"

بٹ صاحب کی حب الوطنی کی رگ فوراً پھڑکنے لگی۔بولے۔"چند پیسوں کی خاطر اپنے ملک کا امیج خراب کرنا مناسب نہیں ہے۔ یہ بھی کیا سوچیں گے کہ پاکستان کے لوگ اتنے کنجوس ہوتے ہیں۔"

یہ کہہ کر انہوں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ نوٹ نکالے اور نہایت فراخ دلی سے ان میں سے ایک لڑکی کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ اتنے بہت سے پیسے دیکھ کر اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔"شکرا" شکرا"" کہتے ہوئے اس کی زبان خشک ہوگئی۔ اس اثناء میں دوسری لڑکی بھی آگے بڑھ کر بٹ صاحب کے پاس آن کھڑی ہوئی تب ہمیں احساس ہوا کہ وہ نادان یہ سمجھ رہی تھی کہ یہ ٹپ صرف اسی کیلئے ہے۔ قاسم نے اس موقع پر ہماری مدد کی اور ان سے کہاکہ یہ رقم تم سب آپس میں بانٹ لو۔

یہ سن کران کے چہرے پھیکے پڑگئے اور سارا جوش خروش رخصت ہوگیا۔

ہم ریستوران سے باہرنکلے تو اندھیرا ہوچکاتھا۔ روشنیاں چمک رہی تھیں لیکن اہرام اور ابوالہول تاریکی میں تھے۔ ظاہر ہے کہ انہیں روشن کرنے کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد "لائٹ اینڈ ساؤنڈ شو"شروع ہونے والا تھا۔ یہ پروگرام شروع ہوتا ہے تو ابوالہول اور آس پاس کے اہرام کو روشنی کا لباس پہنادیاجاتا ہے اور اس کے ختم ہونے کے بعد ایک بارپھرتاریکی انہیں اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے ۔ان فرعونوں اور بادشاہوں کے مقابر پر کوئی مٹی کا دیا تک جلانے والا نہیں تھا۔ سب تماشادکھا کر پیسے بٹورتے تھے۔ ان کا جاہ وجلال ،طمطراق ، شان وشوکت ،طاقت واختیار ، دولت مندی سب کچھ خاک میں مل چکا تھا۔

نقش کھا گئی ، آسماں کیسے کیسے

اب سیاحوں کا ہجوم کم ہوگیاتھا اس لیئے گائیڈز ، مانگنے والے ،اونٹ کی سواری

کرانے والے اور چھوٹی موٹی اشیاء فروخت کرنے والے بھی اپنا سامان سمیٹ کر رخصت ہونے لگے تھے۔ روشنیوں کا تماشا دیکھنے والے ابوالہول کے بالکل مقابل میں بنے ہوئے اوپن ائرتھیٹر میں جاچکے تھے۔

ہم نے ٹیکسی والے کو آواز دی۔ ایک ٹیکسی ہمارے سامنے آکر رک گئی۔ مشکل یہ تھی کہ ہم چار افراد تھے اور ایک ٹیکسی میں سوار نہیں ہوسکتے تھے اس لئے دوسری ٹیکسی لینا بہت کھلتا تھا۔ ہم نے ایک بار پھر قاسم سے کہاکہ وہ ٹیکسی والے کو ہم چاروں کو سوار کرانے پر رضامند کرلے ۔ بالاخر قاسم رضا مندہوگیا۔ اس نے عربی میں ٹیکسی والے کے سامنے مدعا بیان کیا۔ اس نے بھی بڑی شیریں بیانی کامظاہرہ کیا۔ ہم تینوں عربی زبانوں کی خوبیوں کے معترف ہوگئے۔

قاسم نے ہم سے کہا۔ " وہ کہتا ہے کہ وہ ہم چاروں کو لے جانے کیلئے تیار ہے لیکن ایک شرط ہے۔"

"وہ کیا؟"

"شرط یہ ہے کہ ایک مسافر ٹیکسی کی ڈکی میں سفر کرے۔"

"ظاہر ہے یہ شرط ناقابل قبول تھی۔ مجبورا" ہمیں ایک اور ٹیکسی کرائے پر حاصل کرنی پڑی۔

بٹ صاحب کی فرمائش تھی کہ نیل کے پل پر سے ضرور گزرنا چاہئے۔ اور پل بھی وہ جہاں سے دریائے نیل اور روشنیوں کا نظارہ سب سے اچھا نظر آتا ہے۔ خیر۔ یہ شرط توبا آسانی پوری کی جاسکتی تھی مگر ان کی دوسری شرط کافی مشکل تھی ۔ وہ دریائے نیل پر کلوپیٹرا کا وہ محل دیکھنا چاہتے تھے جس کی کھڑکی سے ملکہ اپنے ایک رات کے محبوب کو دریا میں پھنکوا دیا کرتی تھی۔ اب نہ کلوپیٹرا کا محل تھا نہ ہی کسی کو معلوم تھاکہ وہ محل کس جگہ واقع تھا۔ بڑی منت سماجت سے بٹ صاحب کو یہ شرط منسوخ کرنے پر آمادہ کیاگیا۔ کسی ایک مقام پر جانے کے بجائے ہم نے ٹیکسی میں قاہرہ کی سڑکوں سے گزرنے کو ترجیح دی۔ شارع جمہوریہ ' میدان التحریر' شارع ممفس' جامعہ ازہر اور اس کے ارد گرد کا علاقہ ' شاہ فاروق کا محل' قاہرہ کا سب سے بڑا اور اہم عجائب گھر' ان سب مقامات کے سامنے سے ہماری ٹیکسی گزری۔ بڑی سڑکوں پر خوب رونق اور چہل پہل تھی ۔ الجزیرہ کے علاقے میں عالیشان ہوٹلوں اور فلک بوس عمارتوں کو دیکھتے رہے۔ یہ جدید قاہرہ کی خوبصورت تصویر تھی۔ کاش سارا شہر ایسا ہی روشن ' شاندار اور خوش حال ہوتا!

ہم ہوٹل پہنچے تو قاسم نے اگلی صبح آنے کا وعدہ کرکے اجازت طلب کی مگر یہ شکایت بھی کی کہ ہم نے مصر کی سیاحت کو شارٹ کٹ کردیا۔ جب تک اسکندریہ ' لکسر' اسوان نہ دیکھے جائیں اور دریائے نیل میں بحری سفر نہ کیا جائے۔ تومصر نظر نہیں آتا۔ آپ لوگوں نے تو عجائب گھر تک نہیں دیکھا۔ نہ ہی لائٹ اینڈ ساؤنڈ شو دیکھا۔

بٹ صاحب بولے۔"یار کہتا تو ٹھیک ہے واقعی ہم نے مصرتو کیاقاہرہ کے ساتھ ہی انصاف نہیں کیاہے۔ فرعونوں سے لے کر انگریزوں تک کتنے لوگوں نے یہاں بادشاہی کی ہے اور ہم بس یوں ہی سرسری نظر سے قاہرہ کو دیکھ کر جارہے ہیں۔"

خاں صاحب نے کہا۔"بٹ صاحب ۔ آپ نے وہ محاورہ نہیں سنا کہ چاول کاایک دانہ دیکھ کر ساری دیگ کااندازہ کیاجاسکتاہے۔ ویسے آپ دل چھوٹا نہ کریں۔ اگلی بار آئیں گے تو سال چھ مہینے یہاں رہیں گے اور خوب دل بھرکر گھومیں گے۔"

"سال چھ مہینے ؟" وہ پریشان ہوگئے۔"مگر کیسے؟"

بولے۔" ممی بن کر آئیں گے مگراس کے لئے پلاننگ کی ضرورت ہے۔ ہر ممی کے ساتھ کم ازکم ایک لڑکی کاہونا ضروری ہے اور اس حساب سے کم سے کم تین لڑکیوں کی ضرورت ہے ۔اور وہ بھی گوری ۔"

ہم نے کہا۔" مگر آپ یہ بھول رہے ہیں کہ ممی گوریاں بھی کالے آدمی کولفٹ نہیں دیتیں ۔"

خاں صاحب نسلی تعصب کے خلاف ایک تقریر کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ ہمیں جینوا اور پیرس یاد آگئے جہاں ہم نے انتہائی حسین اور گوری چٹی لڑکیوں کو حبشیوں کے ساتھ محبت کی پینگیں بڑھاتے ہوئے دیکھا تھا۔ بلکہ جینوا کی جھیل پر ایک بحری جہاز پر قائم ریستوران میں تو خاں صاحب باقاعدہ ایک خوبصورت ویٹریس کے عشق میں گرفتار ہوگئے تھے مگر بعد میں انکشاف ہوا کہ وہ ایک انتہائی لمبے' کالے اور بے ہنگم افریقی سے پیار کا ناٹک رچا رہی ہے ۔ اس واقعے کے بعد خاں صاحب کا دل ٹوٹ گیاتھا۔ ہم نے یہ واقعہ خاں صاحب کو یاد دلایا تو پہلے تو وہ اداس ہوگئے انہیں اس حسینہ کی بے وفائی یاد آگئی ایک دو ٹھنڈی آہیں بھریں اور خاموش ہوگئے۔

ہم نے کہا"خاں صاحب ہپی بننے میں ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ عشق وشق کے چکر میں پڑنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی ۔ جب چاہا اپنا ساتھی بدل لیا۔ اس معاملے میں کسی کو کوئی شکوہ شکایت بھی نہیں ہوتی اور معاملہ چلتا رہتا ہے۔"

بٹ صاحب بولے۔" اس کا مطلب تو یہ ہے کہ ہمیں ہپی بننے کیلئے پہلے یورپ جانا پڑے گا۔"

ہم نے کہا۔"بھئی یورپ جانے کی کیا ضرورت ہے۔ آج کل تو ہپی لڑکیاں اور لڑکے ساری دنیا میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ زیادہ مشکل پڑی تو نیپال یا بھوٹان چلے جانا۔ وہاں ہپیوں کے غول موجود رہتے ہیں اور وہاں آمدورفت میں زیادہ کرایہ بھی خرچ نہ ہوگا۔"

خان صاحب کو یکایک خیال آیا کہ ایک ہپی جوڑا تو ہمارے ہوٹل میں بھی موجود ہے اور لڑکی اس قدر ہرجائی ہے کہ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے اپنا ساتھی بدل لیا ہے۔

بٹ صاحب کو یہ آئیڈیا پسند آیا۔ انہوں نے سر سے پیر تک خاں صاحب کا بغور جائزہ لیا اور پھر بولے۔ "دیکھا جائے تو آپ ہر لحاظ سے اس لنگور سے بہتر ہیں۔"

خاں صاحب نے ایک سرد آہ بھری اور کہا۔" دوستو اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ صرف رات کی رات میں تو یہ معرکہ سر نہیں ہوسکتا۔"

"کوئی بات نہیں ہے۔ ہم آپ کی خاطر اپنا سفر ملتوی بھی کرسکتے ہیں"

"نہیں یار۔ وہ لڑکی مجھے ویسے بھی پسند نہیں ہے۔ ہفتوں مہینوں تو وہ غسل تک نہیں کرتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور بات بھی ہے۔"

" وہ بھی بتادیجئے۔"

"مجھے شبہ ہے کہ وہ یہودن ہے اور اسرائیل کی جاسوسہ بھی ہے۔ تبھی تو وہ ہر سال باقاعدگی سے یہاں آتی ہے۔ اور آوارہ گردوں کی طرح ادھر ادھر ٹھہرنے کی بجائے ہوٹل میں ٹھہرتی ہے۔"

"یار یہ بھی کوئی ہوٹل ہے ۔ اس سے زیادہ سستا تو صرف فٹ پاتھ ہی

ہوسکتا ہے۔ اس کے علاوہ آپ بھی بھول رہے ہیں کہ وہ ایک انتہائی دولت مند باپ کی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی ہے۔ اگر قسمت نے یاوری کی تو وہ آپ کی صحبت میں رہ کر ہپی پن سے توبہ کرکے آپ سے شادی بھی کرسکتی ہے اس طرح قاسم کی طرح آپ کی بھی لاٹری نکل آئے گی ۔"

بٹ صاحب اس گفتگو سے بہت بیزار ہورہے تھے۔ "بھئی کیا آج کی رات ہم لوگ اسی طرح بیٹھے باتیں کرتے رہیں۔ آج ہماری قاہرہ میں آخری رات ہے۔"

" تو پھر کیا کریں ۔ اتنے کم وقت میں تو کچھ بھی نہیں کیا جاسکتا۔"

"بھائی کم سے کم ہم اس پھٹیچر ہوٹل سے باہر نکل کر قاہرہ کی رونق تو دیکھ ہی سکتے ہیں۔ شیرٹن وغیرہ چلتے ہیں۔ وہاں بڑی چہل پہل ہوتی ہے۔"

" مگر وہ بہت مہنگا ہوٹل ہے۔یہ رونق آپ کو بہت مہنگی پڑے گی۔"

ہمارا یہ مسئلہ السید راجندر ناتھ کی آمد نے حل کردیا۔ وہ گزشتہ کئی روز سے ہم سے نہیں مل سکے تھے۔ کچھ ہم مصروف رہے کچھ وہ نتیجہ یہ کہ ملاقات نہ ہوئی۔ ہمیں قاسم جیسے گائیڈ اور ہمراہی کے بعد کسی اور کی حاجت بھی نہیں رہی تھی۔

راجندر ہمیں دیکھتے ہی بے اختیار ہماری طرف آیا۔ بھئی کمال کردیا آپ لوگوں نے ۔ اتنی بے وفائی اور وہ بھی غریب الوطنی کے عالم میں ۔"

ہم اسے اپنی مصروفیات اور قاسم کے بارے میں بتاتے رہے۔ اپنی روانگی کے بارے میں بھی بتایا۔

"بڑے افسوس کی بات ہے ۔ آپ لوگ کل صبح جارہے ہیں ۔ نہ کوئی دعوت کھائی۔ نہ اکٹھے گھومے پھرتے ۔ ہم بھی کیا یاد کریں گے۔"

"کم ازکم آج کی رات تو کچھ کرلیں۔"

" مثلاً کیا؟"

" مثلاً یہ کہ کہیں چل کر گھومیں' سیر کریں' کھانا وانا کھائیں۔"

راجندر نے کچھ دیر سوچا پھر کہا۔"ایک بہت اچھا پروگرام بن سکتا ہے۔"

"مجھے ایک دو ایسے نائٹ کلب معلوم ہیں جہاں شاہ فاروق جایا کرتے تھے۔"

" مگر وہ تو بہت مہنگے ہوں گے۔"

"بہت معمولی قسم کے ہیں۔ شاہ فاروق من موجی آدمی تھا۔ منہ اٹھاکر کہیں

بھی چلا جاتا تھا۔"

خاں صاحب نے کہا۔ "تو پھر فوراً" منہ اٹھائیں اور اسی جگہ چلیں۔ اس بہانے ایک تاریخی نائٹ کلب کو تو دیکھ لیں گے۔"

بٹ صاحب نے آہستہ سے کہا۔ "تاریخی کا تو بہانہ ہے ۔ انہیں تو بس نائٹ کلب سے مطلب ہے۔"

موجودہ حالت میں اس سے بہتر کوئی اور تجویز نہیں ہوسکتی تھی اس لئے ہم لوگ فوراً" تیار ہوگئے۔

مگر نائٹ کلب کا معاملہ تھا اور ہم سارے دن اہرام کی خاک چھانتے رہے تھے اس لیے اصولی طور پر تو غسل واجب تھا لیکن واحد غسل خانہ کامسئلہ اس کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھاچنانچہ "ڈرائی کلینگ" پر اکتفا کرنے کا فیصلہ ہوا۔ یعنی ہر ایک نے اپنے کمرے میں جاکرمنہ ہاتھ دھولیا اور تولیہ گیلا کرکے جسم پر پھیرلیا۔ اس طرح کم ازکم تازگی کا کچھ احساس تو پیدا ہوا۔ اس کے بعد جب ہم لوگ خوشبولگاکرہوٹل کی لابی میں اکٹھے ہوئے تو خاصے تازہ دم اور شگفتہ نظر آرہے تھے اور ہمیں دیکھنے والا کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتاتھا کہ ہم نے غسل نہیں کیا ہے۔

ہوٹل سے نکلے تو ایک بار پھر دو ٹیکسیوں کا مسئلہ ہمارے سامنے درپیش تھا۔

مجوزہ دو ٹیکسیاں کرائے پر حاصل کی گئیں ۔ایک ٹیکسی میں ہم اور راجندر بیٹھ گئے۔ دوسرے سے کہا گیا کہ وہ ہمارے پیچھے پیچھے آئے۔ ٹیکسی ڈرائیور زیادہ انگریزی نہیں جانتا تھا۔ پہلے تو وہ بھی یہ نہیں سمجھا کہ ٹیکسی کے پیچھے جانے سے کیا مراد ہے۔ جب بمشکل اسے سمجھایا گیا تو وہ سوچ میں پڑگیا اور پھر پراسرارانداز میں پوچھا۔ "یووانٹ فالو۔ آریو و۔ٹیکیٹو؟" (آپ پیچھا کرنے کو کہہ رہے ہیں۔ کہیں آپ سراغرساں تو نہیں ہیں۔")

"بھئی عجیب بے وقوف آدمی ہے۔" خاں صاحب ہنسنے لگے۔ "کوئی سراغرسانی کرتا ہے تو چپکے سے پیچھا کرتا ہے۔ ایسا تو نہیں ہوتا کہ جس کا پیچھا کیا جائے اسی کے سامنے پیچھا کرنے کا پروگرام بھی مرتب کیا جائے۔"

بہرحال ٹیکسی والا اس پر رضا مند ہوگیا۔ ورنہ پہلے اس کا خیال تھا کہ ہم کسی مجرمانہ سرگرمی میں مصروف ہیں۔ اس سے کہا گیا کہ وہ ہردم ہماری ٹیکسی کی دم کے

ساتھ لگا رہے کیونکہ قاہرہ کی سڑکوں کے رش میں اگر رات کے وقت بچھڑ گئے تو پھر شاید کبھی خوابوں میں ملیں ۔ یعنی کم ازکم صبح تک تو ہم ایک دوسرے کی تلاش نہیں کرسکتے تھے ۔ اسی طرح وہ ٹیکسیوں کا یہ قافلہ روانہ ہوا۔

راجندر نے ٹیکسی والے کو شارع جمہوریہ پر چلنے کے لئے کہا۔ پہلے اس کا نام شارع عابدین تھا کیونکہ اس سڑک پر فاروق کا محل قصرعابدین بھی واقع تھا۔ ابھی تک لوگوں کو پرانا نام ہی لینے کی عادت تھی جیسے کہ ہمارے ہاں میکلوڈ روڈ اور مال روڈ کو آج تک لوگ ان ہی ناموں سے یاد رکھتے ہیں۔ ٹیکسی والا خاصا باتونی تھا' کچھ پڑھا لکھا بھی تھا لیکن عربی میں ۔ انگریزی اس کی خاصی کمزور تھی۔ وہ ہنستے ہوئے کہنے لگا۔"شاہ کے محل کا نام قصرعابدین تھا۔ حالانکہ اس میں رہنے والے کا عبادت اور زہد سے دور کا بھی تعلق نہ تھا۔"

ہم نے پوچھا۔"کیا فاروق نیک آدمی نہ تھا؟"

بولا ۔" وہ اول درجے کا دل پھینک' رنگین مزاج اور عیاش تھا۔ میرے خیال میں تو اس شخص کے اندر اس کے سوا کوئی خوبی نہ تھی کہ نوعمری میں وہ بہت خوبصورت تھا۔"

راجندر نے کھڑکی سے جھانک کر پیچھے دیکھا اور یہ اطمینان کرلیا کہ دوسری ٹیکسی ہمارے ساتھ ہی آرہی ہے۔ ورنہ باتونی ٹیکسی ڈرائیور باتوں کے زناٹے میں کار کی رفتار بڑھا کر دونوں ٹیکسیوں کو ایک دوسرے سے جدا بھی کرسکتا تھا ۔ وہ نہ جانے فاروق کے کیا کیا قصے سناتا رہا۔ ہمارے کان میں تو صرف عربی ہی پڑتی رہی ۔ سمجھ میں راجندر کے بھی کچھ نہیں آیا۔

ہم نے کہا۔"آخر یہ کہہ کیا رہا ہے؟"

"شاہ فاروق کی برائیاں کررہاہے۔ حالانکہ ہمیں سب کچھ معلوم ہے جو یہ بتا رہاہے۔"

ایک دوجگہ راجندر نے ٹیکسی موڑنے کی ہدایت کی اور پھر ہم ایک نسبتاً" کم رونق والی سڑک پر پہنچ گئے۔ یہاں چند نائٹ کلب تھے مگر اعلیٰ درجے کا کوئی بھی نہ تھا۔ ایک نائٹ کلب کے سامنے جاکر ہماری ٹیکسی رک گئی ۔ سامنے ایک نائٹ کلب کے نام کی روشنی جل رہی تھی۔ اس کا نام "اکاپولکو" یا کچھ اس قسم کا تھا۔ راجندر نے

بتایا کہ کوئی اطالوی نام ہے اور اس کا مالک بھی اطالوی ہی تھا۔ شاہ فاروق کا ہمراز و دم ساز ملازم اور مشیر خاص بھی اطالوی تھا۔ اس لیے وہ شاہ فاروق کو اس نائٹ کلب میں لے جایا کرتا تھا۔ اس طرح کلب کی اہمیت بڑھ گئی تھی اور لوگ بھی بہت بڑی تعداد میں وہاں آنے جانے لگے تھے۔ تاکہ اپنے بادشاہ کو کبھی کبھار دیکھ لیں۔ لیکن مردوں سے زیادہ عیاش طبع اور شوقین مزاج عورتوں کا جمگھٹا ہوتا تھا جو اس امید پر وہاں جاتی تھیں کہ شاید شاہ کی نگاہوں میں آجائیں۔ شاہ انہیں مایوس بھی نہیں کرتا تھا جو بھی عورت اسے پسند آجاتی وہ اس کی طرف اشارہ کرتا اور اس کا اطالوی مشیر اسے شاہی محل میں پہنچادیتا تھا مگر عورتوں کو یہ علم نہ تھا کہ سفاروق نہایت کنجوس آدمی تھا۔ کم ازکم عیش وعشرت کیلئے وہ کسی عورت کو پیسا دینے کا قائل نہ تھا لیکن بعض عورتوں کیلئے ملک کے تاجدار کی ہم نشینی ہی بہت بڑا اعزاز تھا۔ وہ جیسا بھی تھا بالاخر مصر کا مطلق العنان فرمانروا تھا۔ کون جانتا تھا کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب وہ معزول کر کے جلاوطن کردیا جائے گا۔

نائٹ کلب کے باہر خاصی رونق تھی۔ سیاحوں کی خاصی تعداد موجود تھی اور ان سے زیادہ تعداد میں مختلف رنگ ونسل کی خواتین تھیں جو ادھر ادھر منڈلارہی تھیں۔ ظاہر ہے کہ یہ اپنے شکار کی تلاش میں تھیں۔ ہم دوسری ٹیکسی کے انتظار میں چند لمحے باہر کھڑے رہے۔ اس اثناء میں کئی خواتین ہمارے پاس سے اشارے کنایے کرتی ہوئی گزر گئیں۔ راجندر نے بتایا کہ یہ سب پیشہ ور خواتین ہیں مگر خود کو سوسائٹی گرل کہتی ہیں۔ وہاں جس قسم کی سوسائٹی تھی اس قسم کی لڑکیاں بھی تھیں۔ یعنی آزاد' بے باک' حسین اور بے حجاب۔ بڑی مشکل سے ان سے جان چھڑا کر ہم کلب کے اندر داخل ہوئے۔ ایک چھوٹے سے استقبالیہ سے گزر کر ہال میں جانا پڑتا تھا۔ ہال زیادہ شاندار نہیں تھا۔ فرنیچر بھی معمولی سا تھا اور حاضرین میں بھی ہائی کلاس سے تعلق رکھنے والے لوگ نظر نہیں آرہے تھے۔ زیادہ تعداد سیاحوں اور غیر ملکیوں کی تھی۔ چند مصری بھی سوٹ بوٹ پر عبا پہنے نظر آئے۔ بالکل کلین شیو اور ہاتھ میں تسبیح۔ خدا جانے نائٹ کلب اور تسبیح کا کیا کمبی نیشن تھا۔ بٹ صاحب اس منظر سے خاصے متاثر ہوئے اور سادگی سے پوچھنے لگے کہ کیا اس کلب میں کوئی نماز پڑھنے کا کمرا بھی ہے؟

حاضرین بے تابی اور بے چینی سے اسٹیج پر نظریں جمائے بیٹھے تھے۔ کوئی ایک لمحے کیلئے بھی اسٹیج سے نظریں ہٹانے کو تیار نہ تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے انہیں ڈر تھا کہ کہیں ان کی آنکھ ہٹتے ہی رقاصہ آکر فوراً" ہی غائب نہ ہوجائے۔ ایک میز کے گرد چار کرسیاں تھیں جن پر ہم چاروں بیٹھ گئے۔ آس پاس نیم عریاں اور قریب عریاں لباس پہنے جو خواتین منڈلا رہی تھیں وہ چیل کی طرح جھپٹ کر ہماری طرف آئیں اور جب بیٹھنے کے لئے کوئی خالی کرسی نظر نہ آئی تو کرسیوں کے ہتھوں پر براجمان ہوگئیں اور عربی اور انگریزی ہانکنی شروع کردی۔ وہ اگر عبرانی زبان بھی بولتیں تو ہم سمجھ جاتے کہ وہ کیا کہہ رہی ہیں۔ راجندر نے بڑی مشکل سے ان سے جان چھڑائی۔

خاں صاحب کہنے لگے۔" خواہ مخواہ انہیں بھگا دیا۔ کیا ہرج تھا اگر یہیں بیٹھی رہتیں۔"

راجندر نے کہا۔"ہرج یہ تھا کہ جیب سے سو پچاس پونڈ نکل جاتے اور ابھی آپ کو سفر بھی کرنا ہے۔"

ہال میں مدھم سی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور ہلکی ہلکی موسیقی بج رہی تھی۔ اچانک موسیقی تیز ہوگئی۔ اور اس کے ساتھ ہی اسٹیج بھی روشن ہوگیا۔ ایک خوش اندام رقاصہ دف بجاتی ہوئی اسٹیج پر آئی اور اس نے پہلے دھیمے انداز میں اور پھر رفتہ رفتہ انتہائی تیز ہیجان خیز انداز میں جمناسٹک کا مظاہرہ شروع کردیا۔ بہرحال ایک خوبصورت عورت تھی۔ جمناسٹک کیا اگر ورزش بھی کرتی تو اچھی لگتی۔

موسیقی تیز سے تیز تر ہوتی جارہی تھی اور اس کے ساتھ ہی رقاصہ کی حرکات سکنات بھی تیز ہورہی تھیں۔ حاضرین کا جوش وخروش بھی اسی تناسب سے بڑھ رہا تھا۔ ان خاتون نے تقریباً دس منٹ تک مشقت کی اور پھر لہراتی ہوئی واپس چلی گئیں۔ ہال تالیوں سے گونجنے لگا۔ تسبیح گھمانے والے مصریوں نے بھی تسبیح کے دانوں کو قدرے آرام دیا۔ ہال میں ایک بار پھر روشنی مدھم پڑ گئی مگر سرگوشیوں کی وجہ سے ایک بھن بھناہٹ سی پھیل گئی۔ ویٹرلیس لڑکیاں جام وسبو لے کے گردش میں آگئیں۔ ہم تک بھی ان کی رسائی ہوئی مگر بات نہ بن سکی۔ وجہ یہ تھی کہ راجندر بھی شراب نہیں پیتا تھا۔ دوسرے یہ کہ یہاں شراب طلب کرنے کا مطلب تھا کہ اپنی حجامت بنوالی جائے۔

ہم نے پوچھا"کیا یہ شاہ فاروق کے زمانے میں بہت اچھا نائٹ کلب ہوا کرتا تھا؟"

"بالکل نہیں ۔ یہ ایسا ہی تھا جیسا اب ہے۔ بلکہ اب شاید کچھ بہتر ہوگا۔"

فاروق کی ایک خوبی انہوں نے یہ بتائی کہ دوسرے عیوب اس میں بھلے ڈھیر سارے ہوں گے مگر وہ شراب نہیں پیتا تھا۔ اس کا معمول یہ تھا کہ خاموشی سے کسی وقت آکر ایک گوشے میں بیٹھ جاتا تھا۔ یہ میز کلب والا ہز میجسٹی کے لئے مخصوص رکھتا تھا۔ وہ چاہے آئیں یا نہ آئیں ۔ ان کی میز ریزرو رہا کرتی تھی۔ موٹی عورتیں فاروق کی کمزوری تھیں اول تو ہم نے بیشتر مصری عورتوں کو گداز جسم یا موٹا ہی پایا مگر سنا ہے کہ اس زمانے میں موٹاپا "ان" تھا اور عورتیں موٹی ہونے کیلئے بطور خاص کوشش کیا کرتی تھیں۔

چند منٹ بعد ویٹریس لڑکیوں کے نیم عریاں سائے غائب ہوگئے اور ایک بار پھر اسٹیج روشن ہوگیا ۔ موسیقی کی لے بھی بلند ہوگئی اور ردھم بھی۔ اس بار ایک مغربی رقاصہ اسٹیج پر تشریف لائیں۔ ان کا رقص پہلی رقاصہ کے مقابلے میں بہتر تھا۔ اگر وہ اعضا کی ورزش تھی تو اسے آپ اعضا کی شاعری کہہ سکتے ہیں۔ شاید ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کے اعضا زیادہ متناسب اور دلکش تھے۔

رفتہ رفتہ موسیقی کی لے تیز تر ہوگئی اور اسٹیج پر مختلف رنگوں کی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ اس کے ساتھ ہی ہال کی دوسری روشنیاں مدہم ہوتے ہوتے بالکل معدوم ہوگئیں۔ اب سارا ہال تاریکی میں تھا صرف اسٹیج پر ہی دھما چوکڑی مچی ہوئی تھی۔ رقاصہ نے کچھ دیر بعد اپنے لباس کا ایک دوپٹہ نما حصہ بڑی ادا کے ساتھ جسم سے الگ کیا اور ہوا میں پھینک دیا۔ یہ گویا خطرے کا الارم تھا کیونکہ اس کے بعد انہوں نے باری باری دوسرا لباس بھی اتار کر پھینکنا شروع کردیا۔ اس دوران میں رقص بھی جاری رہا۔ جب انہوں نے آخری لباس کو دھتکار دیا تو اسٹیج پر اندھیرا چھا گیا اور سارے ہال کی روشنی واپس آگئی۔ سب لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے رہے مگر اسٹیج پر کوئی نہ تھا۔ ہمیں اس پر وہ سردار جی یاد آگئے جن کا قصہ ہم پہلے بھی سنا چکے ہیں۔ وہ ایک فلم دیکھنے گئے جس کے ایک منظر میں ہیروئن ندی میں نہانے کے لئے اپنا لباس اتارنا شروع کرتی ہے کہ اچانک ایک ٹرین آجاتی ہے۔ جب ٹرین گزر جاتی ہے تو تماشائی

دیکھتے ہیں کہ ہیروئن ندی میں نہارہی ہے۔ اور اس کا صرف سر ہی پانی سے باہر نظر آرہا ہے۔ سردار جی اس کے بعد ہر روز بلاناغہ فلم دیکھنے کے لئے پہنچنے لگے۔ ایک دن گیٹ کیپر نے پوچھا۔"سردار جی! اس فلم میں ایسی کیا بات ہے کہ آپ اس کا ایک شو بھی مس نہیں کرتے؟"

سردار جی بولے۔" میں اس لیئے آتا ہوں کہ شاید کسی دن ٹرین لیٹ ہوجائے۔"

یہ رقص اس رات کا آخری آئٹم تھا اس لیئے تماشا دیکھنے والے رخصت ہوگئے۔ شراب پینے والے اور ساتھی خواتین سے دل لگی کرنے والے باقی رہ گئے ۔ ہم بھی فارغ ہوئے شتابی سے۔

باہر نکلے تو راجندر نے ایک اور کلب چلنے کی پیش کش کی اور بتایا کہ وہ بھی شاہ فاروق کا پسندیدہ کلب تھا' وہاں ایک موٹی ڈانسر تو شاہ کی خاص منظور نظر تھی۔

ہم نے کہا"بھائی' فاروق تو اب دیار غیر میں پیوند زمین ہوگئے۔ رہی ان کی موٹی محبوبہ تو وہ بھی اب نانی دادی بن گئی ہوگئی۔ جہاں تک موٹاپے کا تعلق ہے' تم ہمیں اس کا لالچ نہ دو۔ ہمارے ملک میں ایک سے بڑھ کر ایک موٹی ہیروئن پڑی ہوئی ہے اگر شاہ فاروق کا زمانہ ہوتا تو یہ سب ان کے حرم میں نظر آتیں اور کیا عجب تھا کہ ان میں سے کوئی ان کی ملکہ بھی بن جاتیں۔"

تھکن سے جسم چور چور ہورہا تھا۔ نیند سے آنکھیں بوجھل ہورہی تھیں ۔ شاہ فاروق ' ڈانسر ' اہرام اورابوالہول سب گڈمڈ ہوگئے تھے۔ اس لیے مناسب سمجھا کہ ہوٹل واپس چل کر کچھ دیر نیند لے لی جائے۔ ہمیں صبح گیارہ بجے ائرپورٹ روانہ ہونا تھا۔

قاہرہ کو چھوڑنے کا قلق نہ تھا مگر اس بات کی خوشی بھی تھی کہ ہوٹل کے غسل خانے سے نجات مل جائے گی۔ قاسم ائرپورٹ تک الوداع کہنے کیلئے ساتھ گئے اور دوبارہ قاہرہ آنے کی تاکید بھی کرتے رہے۔

ہوائی جہاز میں سوار ہوئے تو ہم نے دو عہد کیے۔

1۔ اگلی بار قاہرہ آئیں گے تو ہوٹل میں ایڈوانس بکنگ ضرور کرائیں گے ۔ اس کے بغیر ہرگز اس شہر کا رخ نہ کریں گے۔

2۔ اپنے ساتھ اور کچھ لائیں یا نہ لائیں تولیا ضرور لائیں گے۔

8

ہم نے دریائے نیل میں سکے تو نہیں پھینکے تھے حالانکہ قاسم اور راجندر ناتھ نے ہمیں بارہا تاکید کی تھی کہ اگر دوسری بار مصر اور قاہرہ آنے کی خواہش ہے تو چند سکوں کی قربانی کوئی اہمیت نہیں رکھتی مگر نہ جانے کیوں ہم نے اس مشورے کو قبول نہیں کیا تھا۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ ہم دوبارہ قاہرہ جانے کے خواہش مند نہ تھے۔ قاہرہ ہمیں بہت پسند آیا تھا اور ابھی بہت سے مقامات تھے جو ہم نے دیکھے ہی نہیں تھے۔ مثال کے طور پر ابوالہول اور اہرام کے مصر سامنے منعقد ہونے والا روشنی اور آواز کا شو۔ یا پھر قاہرہ کا مشہور زمانہ عجائب گھر جس کے بارے میں ہمیں بتایا گیا تھا کہ دنیا بھر کے عجائب گھروں میں وہ چیزیں دیکھنے کو نہیں ملتیں جو قاہرہ کے تاریخی عجائب گھر میں موجود ہیں۔

مصر کی انفرادیت دراصل فرعونوں کا عہد ہے اور فرعونوں نے چوروں اور نقب زنوں کے ہاتھوں لوٹ کھسوٹ کا نشانہ بننے کے باوجود اتنی بہت سی چیزیں یادگار کے طور پر چھوڑی ہیں کہ دنیا والوں کے ہوش اڑانے کیلئے وہی کافی ہیں اور پھر یہ بات بھی ہے کہ چوروں نے فرعونوں کے مقبروں میں نقب لگا کر جو مال سمیٹا تھا وہ اسے اپنے گھر لے جانے سے تو رہے۔ ظاہر ہے کہ وہ سب بازاروں میں فروخت کرنا تھا۔ اس

طرح یہ قیمتی اور نادر اشیا کباڑیوں کے ہاتھ لگ گئیں۔ اس زمانے میں نوادرات کا کوئی تصور نہیں تھا اور نہ ہی پرانی اور بوسیدہ چیزوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ہم نے خود اپنے بچپن میں یہ دیکھا تھا کہ پرانے مکانات 'حویلیاں' دروازے، اور سامان آرائش زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ اپنی اہمیت کھو بیٹھے۔ ہر ایک انہیں بوسیدہ اور بدشکل سمجھ کر ان کی جگہ نئی نئی اشیاء حاصل کرنے کی فکر میں رہتا تھا۔ ہمارے ملک میں تو پرانی اشیا کی قدر دانی کا دور پندرہ بیس سال پہلے شروع ہوا ہے۔ ہم نے دیکھا کہ وہ پرانے برتن جو کباڑیوں یا پھیری والوں کے ہاتھ اونے پونے فرو[illegible]یے جاتے تھے یکایک نوادرات یا "کلاسیک" بن کر رہ گئے۔ اس سے پہلے مغربی سیاح ان چیزوں کی تلاش میں رہا کرتے تھے مگر کسی کو کیا علم تھا کہ وادی اماں کے زمانے کا پاندان' خاصدان اور اگالدان تک کسی زمانے میں نوادرات میں شمار ہونے لگے گا۔ ہر وہ چیز جو فضول سمجھ کر پھینک دی جاتی تھی۔ یا پھر سگھڑ بیبیاں جسے کباڑی کے حوالے کرکے تھوڑے پیسے کھرے کرلیا کرتی تھیں وہ سب قدرومنزلت پائیں گی اور تو اور حویلیوں کے پرانے لکڑی کے دروازے ' گھر کی پرانے فیشن کی میزیں اور گلدان وغیرہ بھی کلاسیک ہوجائیں گے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ زمانہ پیچھے کی طرف لوٹتا ہے اور پرانے فیشن ایک بار پھر مقبول و محبوب ہوجاتے ہیں۔

مصر میں یہ سلسلہ سالہا سال پہلے شروع ہوگیا تھا کیونکہ مغربی مہم جو لوگوں نے تحقیق و جستجو کے پیش نظر صدیوں قبل ہی مصر کی قدیم تہذیب کا سراغ لگانے کی کوششیں شروع کردی تھیں۔ چوروں نے تو خیر چپکے چپکے مقبروں سے تابوت اور قیمتی سامان ہی چرانے پر اکتفا کیا تھا لیکن مغرب کے کھوجی زمین کھودنے کیلئے آگئے اور ریت کے تودوں کے اندر سے پرانے آثار دریافت کرنے لگے۔ یہاں تک کی اہرام ' مندر' مقبرے اور تابوت وغیرہ سبھی کچھ انہوں نے کھود کھاد کر نکال لیا اور دنیا کے سامنے پیش کردیا۔ مصریوں کا یہ حال تھا کہ وہ ان لوگوں کو خبطی سمجھا کرتے تھے جو تپتے ریگستانوں میں دن رات پاگلوں کی طرح کھدائی کرواتے رہتے تھے اور فضول بے ہنگم کی چیزیں نکال کر محفوظ کرلیتے تھے۔ اگر فرانس اور انگلستان والے زحمت گوارا نہ کرتے تو خدا جانے مصر میں یہ قدیم آثار دریافت بھی ہوتے یا فرعونوں کی صرف داستانیں ہی باقی رہ جاتیں۔

بہرحال اب تو قدیم مصر کا سارا کچا چٹھا دنیا کے سامنے ہے اور مصری بھی اپنی قدیم تہذیب پر فخر کرتے ہیں۔ قاہرہ کا عظیم عجائب گھر بھی اس کا مظہر ہے۔ ہم کیونکہ جلدی میں تھے اس لیے بہت سی چیزوں کے علاوہ قاہرہ کا عجائب گھر بھی اندر سے نہیں دیکھ سکے تھے۔ جسے دیکھنے کی کم ازکم ہمیں ذاتی طور پر حسرت تھی کیونکہ فرعونوں کا کچھ سازو سامان اور ممیاں ہم لندن میوزیم میں بھی دیکھ چکے تھے مگر مشکل یہ تھی کہ ہمارے ساتھ خاں صاحب اور بٹ صاحب بھی تھے۔ جنہیں تاریخ سے قطعاً" دلچسپی نہیں ہے۔وہ محض کیلنڈر کی تاریخ کو اہمیت دیتے ہیں۔ عجائب گھر اور میوزیم ان کے نزدیک فضول چیزیں ہیں۔ جب انہوں نے یورپ کا ایک میوزیم اندر سے سرسری طور پر دیکھ لیا تو پھر اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ باقی سب میں بھی یہی کچھ ہوگا۔ اس لئے باربار دیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔

ہر جگہ میوزیم کے اندر جانے کیلئے ٹکٹ خریدنا پڑتا ہے جسے یہ دونوں حضرات فضول خرچی ہی سمجھتے رہے۔ ان کا یہ عالم تھا کہ جس میوزیم کے اندر داخلہ مفت تھا یہ اس کے اندر بھی قدم رکھنے کے روا دار نہیں تھے اور اسے وقت کا زیاں سمجھتے تھے۔

"بھئی یہ تو مفت کی سیر ہے۔اندر چل کر دیکھ تو لو۔"

"جو چیز ٹکٹ لگانے کے قابل بھی نہیں ہے اسے دیکھنے کا کیا فائدہ؟ بلاوجہ وقت ضائع کرنے کے بجائے سیرو تفریح کیوں نہ کرلی جائے۔"

"یار سمجھتے کیوں نہیں۔ یہ قدیم آرٹ ہے۔ پرانی تہذیب اور فنون کا نمونہ ہے۔"

جواب میں خاں صاحب کہتے۔" ان چیزوں کو دیکھنے والے بے وقوفوں کی کمی نہیں ہے۔ ہم فہرست میں اپنا نام کیوں لکھوائیں۔"

جن لوگوں نے یورپ کے عجائب گھروں میں قدم رکھنا تک گوارا نہیں کیا تھا اور داخلہ ٹکٹ کے پیسے بچاکر آئس کریم اور ٹافیاں کھانے کو ترجیح دیتے رہے تھے وہ بھلا قاہرہ کے عجائب گھر میں کیوں قدم رنجہ فرماتے؟ اور پھر اس صورت میں جبکہ ہمارے پاس وقت بھی بہت کم تھا۔ ہمیں یاد ہے کہ ایک بار ہم قاسم کے ساتھ قاہرہ کے قدیم عجائب گھر کے سامنے سے گزرے تو چند لمحوں کے لئے عمارت کے سامنے کھڑے

ہوگئے۔ قاسم کا مشورہ تھا کہ ہمیں عجائب گھر دیکھ ہی لینا چاہئے کیونکہ یہ دنیا کا قدیم ترین عجائب گھر ہے۔

بٹ صاحب نے غور سے عمارت کو دیکھا اور بولے۔ "یہ فرعون عمارتیں تو بالکل آج کل کے زمانے جیسی بناتے تھے۔"

ہم نے انہیں بتایا کہ عجائب گھر کی عمارت فرعونوں کے زمانے کی نہیں ہے۔ صرف اس کے اندر کا سامان فرعونوں کے دور کا ہے۔ اس کے اندر دوسری نادر چیزوں کے علاوہ ممیاں بھی ہیں۔

بولے ۔"وہ سب بیکار ہیں جس عجائب گھر میں کلوپیٹرا کی ممی نہ ہو وہ کہاں عجائب گھر ہے۔"

قصہ مختصر یہ کہ ہمیں عجائب گھر کے اندر جانا نصیب نہ ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دریائے نیل میں سکے نہ پھینکنے کے باوجود ہم دوبارہ قاہرہ جانے کی خواہش اپنے دل میں رکھتے تھے۔ خاں صاحب اور بٹ صاحب کو قاہرہ کچھ زیادہ پسند نہیں آیا تھا۔ دراصل وہ یورپ کے شہروں سے براہ راست قاہرہ پہنچے تھے اس لیے وہاں کی چمک دمک اور رونق آرائی کے مقابلے میں قاہرہ انہیں پھیکا پھیکا اور پسماندہ سا نظر آیا۔ قاہرہ کی جو خصوصیت تھی یعنی قدیم تہذیب کے آثار' ان میں وہ کچھ دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ اس لئے انہیں دوبارہ قاہرہ جانے کا زیادہ شوق نہیں تھا۔

"بس بھائی۔ سب کچھ تو دیکھ لیا۔ فرعونوں کے سوا یہاں رکھا کیا ہے۔ کچھ پرانی مسجدیں ہیں یا پھر پتلی گلیوں والے بازار ہیں۔ ایسی گلیاں تو اپنے لاہور میں بھی مل جائیں گی بلکہ ان سے زیادہ پتلی اور گندی۔" بٹ صاحب نے کہا۔

خاں صاحب بولے۔"اور ان گلیوں میں یہاں کے مقابلے میں زیادہ خوبصورت چہرے نظر آتے ہیں۔ لبادے' چوغے اور قبائیں نہیں ہیں تو کیا ہوا۔ اپنی شلوار قمیض میں جو پھبن اور شان ہے وہ ان لباسوں میں کہاں؟"

اس طرح ہم قاہرہ سے بے نیل ومرام واپس لوٹ آئے تھے۔

مگر ایک نجومی نے ہمارا ہاتھ دیکھ کر اور ہماری تاریخ پیدائش کا حساب کتاب لگاکر ہمیں بتایا تھا کہ آپ ایک بار پھر قاہرہ جائیں گے۔ نیل کا پانی اور اہرام مصر مجھے آپ کے ہاتھ کی لکیروں میں صاف نظر آرہے ہیں۔

"چھوڑو بھائی۔" خاں صاحب نے کہا۔ "کس کی باتوں میں آتے ہو۔ یہ لوگ تو یوں ہی دل خوش کرنے والی باتیں کر کے لوگوں کا دل بہلاتے ہیں۔"

"مگر اسے کیا پتا ہے کہ ہم دوبارہ قاہرہ جانا چاہتے ہیں۔"

"آپ کے چہرے کا ہونق پن دیکھ کر اس نے اندازہ لگالیا ہوگا اور آپ نے خود ہی تو پوچھا تھا کہ میں دوبارہ قاہرہ جاؤں گا یا نہیں؟ بس وہ سمجھ گیا آپ کے دل کی بات۔"

مگر نجومی کی پیش گوئی کو صحیح ثابت ہونا تھا۔ سو ہو گئی۔

قاہرہ جانے کا ویسے کوئی پروگرام نہیں تھا۔ ہم تو یورپ جارہے تھے مگر اچانک بلکہ خواہ مخواہ قاہرہ بیچ میں آن ٹپکا۔ اس کی بھی ایک کہانی ہے۔

فلم ساز شباب کیرانوی ہمارے پرانے دوست تھے۔ اللہ کا دیا سبھی کچھ تھا مگر وہ اللہ کا بندہ بہت قناعت پسند تھا۔ کم ازکم دنیا کو دیکھنے کی حد تک۔ ملا کی دوڑ مسجد تک ہوتی ہے اور شباب صاحب کی دوڑ ان کے گھر سے دفتر اور دفتر سے اسٹوڈیو تک تھی۔ یہی ان کی زندگی کا محور تھا۔ ہر روز صبح گھر سے نکلے اور دفتر پہنچ گئے۔ وہاں سے نکلے تو اسٹوڈیو چلے گئے اور اسٹوڈیو سے پھر گھر۔ بس یہ لے دے کر ان کی دنیا کا حدود اربعہ تھا۔ اگر کبھی مری کی آؤٹ ڈور شوٹنگ پر جانے کی ضرورت پڑ گئی تو ان کی کوشش تو یہی ہوتی تھی کہ ان کا کوئی بیٹا یہ شوٹنگ کرلائے۔ مجبوراً" مری جاتے بھی تو ہوٹل سے لوکیشن اور وہاں سے واپس پھر اپنے ہوٹل پہنچ کر دم لیا کرتے تھے۔ راستے میں کیا مجال جو کوئی اور جگہ دیکھنے چلے جائیں۔ اگر جاتے بھی تھے تو محض فلم کی شوٹنگ کیلئے لوکیشن دیکھنے اور بس۔ اپنے معمول سے وہ بہت خوش تھے اور بے حد مطمئن زندگی گزار رہے تھے۔

جب ہم نے یورپ جانا شروع کیا تو سچی بات یہ ہے کہ ہمیں ایک نئی دنیا دیکھنے کو ملی اور پھر ہم یورپ جانے کے بہانے تلاش کرنے لگے۔ وہاں جانے کا کوئی موقع ہم ہاتھ سے نہیں گنوانا چاہتے تھے۔ عام طور پر تو ہمیں فلموں کے سلسلے میں جانا پڑتا تھا مگر شادی کے بعد ایک بار ہم نے اپنی بیگم کے ساتھ یورپ کی سیر کا پروگرام بنایا۔ دراصل ایک روز ہم جوش میں آکر ان سے یہ کہہ بیٹھے کہ ہم نے یورپ میں جتنے بھی ملک اور شہر دیکھے ہیں وہ سب انہیں ضرور دکھائیں گے۔ چنانچہ ایک بار شوٹنگ کے پروگرام کے بغیر ہی ہم نے اپنی بیگم کے ساتھ یورپ کی سیروسیاحت کا پروگرام بنالیا۔

شباب صاحب کو پتا چلا تو وہ بہت حیران ہوئے۔ "بھئی تمہیں تو یورپ کی ہوا لگ گئی ہے۔ بھائی اپنے ملک میں کیا نہیں ہے جو تم بلاوجہ پیسے لٹانے یورپ جارہے ہو۔"

اب ہم انہیں کیا بتاتے کہ یورپ میں کیا ہے جو ہمارے ملک میں نہیں ہے۔

شباب صاحب کے سامنے یورپ کی خوبیاں بیان کر کے انہیں دورہ یورپ کیلئے رضامند کرنا کچھ آسان کام نہیں تھا۔ دراصل شباب کیرانوی ان لوگوں میں سے تھے جن کی زندگی کا مقصد ہی محض کام کرنا اور مصروف رہنا ہوتا ہے۔ دنیا کی باقی تمام چیزیں ان کیلئے غیر اہم اور غیر ضروری ہوتی ہیں۔ انہیں آپ کسی دلچسپی کا لالچ دے کر سیرو تفریح کیلئے آمادہ نہیں کرسکتے۔ شباب صاحب کے ساتھ یہ معاملہ تھا کہ اس سے پہلے ہر بار جب بھی ہمیں یورپ جانے کا موقع ملتا تھا ہم ان سے کہتے تھے کہ بھائی آپ بھی چلیں۔ ذرا دنیا دیکھیں۔ پتا چلے کہ باہر کی دنیا کیسی ہے اور وہاں کیا ہو رہا ہے؟ مگر وہ ہر بار کسی فوری مصروفیت کا عذر کر دیتے تھے۔

"یار فلاں فلم کی شوٹنگ ہو رہی ہے۔"

"کسی بیٹے کے سپرد کر دیں۔"

"نہیں وہ مجھ ہی کو کرنی پڑے گی۔"

کبھی کہتے "فلاں اسکرپٹ لکھ رہا ہوں۔ پھر آرٹسٹوں سے ڈیٹس بھی لینا ہیں۔"

کبھی گھریلو مسائل کا تذکرہ کر کے جان چھڑا لیتے۔

اس بار جب ہم نے پروگرام بنایا تو اس زمانے میں ان کی کوئی فلم زیر تکمیل نہیں تھی۔ نہ وہ کوئی اسکرپٹ لکھ رہے تھے۔ نہ ہی خوش قسمتی سے کوئی گھریلو مسئلہ درپیش تھا۔ اس کے باوجود آئیں بائیں شائیں کر رہے تھے۔ ہم نے انہیں بہت سبز باغ دکھائے مگر بے سود۔ آخر ہم نے ان کے اور اپنے مشترکہ دوست رشید جاوید سے مشورہ کیا بلکہ انہیں اس بات پر آمادہ کرلیا کہ وہ بھی ہمارے ساتھ چلیں۔ ہم نے انہیں پہلے یورپ کی خیرہ کن زندگی کے بارے میں بتایا اور جب ان کا اشتیاق بہت بڑھ گیا تو

یہ تجویز پیش کی کہ اگر وہ اور شباب دونوں ساتھ چلیں گے تو ان دونوں کے اخراجات کم ہوجائیں گے بلکہ ہم چاروں تمام اخراجات آپس میں تقسیم کرلیا کریں گے۔ ہوٹل میں اگر ایک آدمی قیام کرے تو بہت مہنگا پڑتا ہے لیکن اگر دو آدمی ہوں تو بہت سستا ہوجاتا ہے۔ اسی طرح ٹرانسپورٹ وغیرہ کے اخراجات بھی بہت کم ہوجائیں گے۔ رشید جاوید صاحب کو یہ تجویز بے حد پسند آئی۔

رشید جاوید صاحب کا بھی ہم آپ سے تعارف کرادیں۔ وہ بہت پرانے صحافی تھے۔ لاہور سے ان کا ہفت روزہ "ممتاز" فلمی دنیا میں ایک خاص اہمیت رکھتا تھا۔ وہ بہت مزیدار اور لطیفہ باز شخص تھے لیکن جھگڑالو اور دبنگ بھی بہت تھے اسی لئے فلمی صنعت کے لوگ ان سے گھبراتے تھے۔ ہماری ان سے بہت پرانی دوستی تھی۔ بعد میں فلم سازی میں وہ حصے دار بھی ہوگئے تھے۔ فلم "آس" میں وہ ہمارے شریک فلم ساز تھے۔ ہم دونوں نے کئی فلمیں بنائیں مگر پھر علیحدہ علیحدہ فلم سازی شروع کردی۔ ان کی فلم "صائمہ" بے حد کامیاب رہی تھی۔ خیر یہ تو بعد کی باتیں ہیں۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں۔ صرف ان کی یادیں اور باتیں رہ گئی ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ انتہائی مخلص، ہمدرد اور دیانت دار آدمی تھے۔ ایسے دوست آج کل ناپید ہیں۔

رشید جاوید کے ساتھ ہم ایک بار پھر شباب کیرانوی کے پاس پہنچ گئے جو ڈاکٹری مشورے کے برخلاف نہاری اور پائے وغیرہ کھانے میں مصروف تھے۔ ان کا پرہیزی کھانا بھی گھر سے باقاعدگی سے آتا تھا جو ان کا اسٹاف کھایا کرتا تھا۔ شباب صاحب کھانے کے بہت شوقین تھے۔ بلکہ خاصے چٹورے تھے۔ پہلے تو انہوں نے نہاری اور پائے کی تعریف کرتے ہوئے ہم دونوں کو بھی شرکت طعام کی دعوت دی مگر ہم پیٹ بھرے تھے۔

کچھ دیر بعد چائے آگئی۔ شباب صاحب نے پان کی گلوری منہ میں دبائی۔ پائپ سلگایا تو ہم دونوں نے بھی اپنے اپنے پائپ سلگا لیے۔ اس سے پہلے پائپ نوشی صرف ہم ہی کیا کرتے تھے مگر بعد میں ہم نے سگریٹ کے نقصانات اور پائپ کے فوائد پر اتنے لیکچر دیے کہ شباب صاحب اور جاوید صاحب بھی پائپ نوشی کرنے لگے۔

اب جاوید صاحب نے یورپ کے سفر کا ذکر چھیڑا۔ وہاں کی رنگینیوں کا تذکرہ کیا۔ وہاں کے حسین نظاروں اور نظم وضبط کا بیان کیا۔ ان کی ترقی کے قصے سنائے۔

وہاں کے خوبصورت اور ٹھنڈے موسم کی خوبیاں گنوائیں۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی ٹریول ایجنسی کا نمائندہ کسی آسامی کو پھانسنے کی کوشش کررہا ہے۔ شباب صاحب خاموشی سے پائپ پیتے رہے پھر اس طویل تقریر کے جواب میں ایک لمبی سانس لی اور کہا۔ "اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے اور اگر تھوڑے دن اس ماحول میں گزار بھی لیے تو کیا فائدہ۔ واپس تو اسی گرمی میں لوٹ کر آنا ہے۔"

رشید جاوید نے انہیں ایک ساتھ یورپ کی سیر کرنے کے فوائد بھی گنوائے۔ یہ بھی بتایا کہ تمہارے جانے کی وجہ سے میرا خرچا بھی آدھا ہوجائے گا۔ بلکہ ہم سب کے اخراجات کم ہوجائیں گے۔ اور وہاں لطف بھی بہت آئے گا۔"

شباب صاحب خاموشی سے سرہلاتے اور پائپ کے کش اڑاتے رہے۔

کچھ دیر میں شبنم اور روبن گھوش بھی آگئے۔ ان دونوں کو یورپ سے بہت دلچسپی تھی اور وہاں بہت انجوائے کرتے تھے۔ جب انہوں نے ہماری تجویز سنی تو پرزور سفارش کی کہ شباب صاحب کو یورپ ضرور جانا چاہیے۔

"آپ ادھر جاکر خوش ہوجائیں گے۔" شبنم نے کہا۔

روبن نے کہا۔ "شباب صاحب آپ کو وہاں فلمی کہانیوں کیلئے بہت سا میٹرل جائے گا۔"

یہ سن کر شباب صاحب جو کرسی سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے آگے ہوکر بیٹھ گئے۔

"وہاں ساری دنیا کی اچھی اچھی فلمیں آتی ہیں۔ آپ کو بہت آئیڈیے ملیں گے۔"

شباب صاحب کے چہرے پر سوچ کے آثار نمودار ہوگئے۔

"اور شباب صاحب۔" شبنم نے کہا۔ "آپ ادھر فلم "لوسٹوری" ضرور دیکھیے گا۔ بہت خوبصورت فلم ہے۔ ادھر تو آئے گی نہیں۔ ساری دنیا میں اس کی دھوم مچی ہوئی ہے۔"

شباب صاحب نے پائپ رکھ دیا اور طشتری میں رکھا ہوا ایک پان اٹھاکر منہ میں ڈال لیا۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ وہ اب غور فرمارہے ہیں۔

"شباب صاحب! آپ کو اپنے اسٹوڈیو کیلئے وہاں بہت اچھا اور سستا سامان

بھی مل جائے گا۔"

"اتنے فائدے سننے کے بعد شباب صاحب کا ارادہ متزلزل ہونا ضروری تھا۔ چنانچہ یہی ہوا۔ انہوں نے ہم لوگوں کے ساتھ جانے کی ہامی بھرلی۔

اب سفر کا پروگرام طے ہونا شروع ہوا۔ پاسپورٹ اس زمانے میں کافی مشکل سے دستیاب ہوتے تھے۔ جاوید صاحب اور شباب صاحب کو نئے پاسپورٹ بھی بنوانے تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس وقت پاسپورٹ حاصل کرنے میں جس قدر مشکلات پیش آتی تھیں ویزا کا حصول اتنا ہی آسان تھا۔ کئی یورپین ممالک کا ویزا تو منٹوں میں مل جاتا تھا۔ انگلستان جانے کیلئے ویزا کے بغیر ہی لندن کے ہیتھرو ائیرپورٹ پر جادھمکے تو وہیں کھڑے کھڑے ویزا مل جایا کرتا تھا۔ غیر ملکی زرمبادلہ کا حاصل کرنا اس دور میں کارے دارد تھا۔ چنانچہ اس کا بھی بندوبست کیا گیا۔ کن کن ملکوں میں جائیں گے اور کتنے کتنے دن وہاں قیام کریں گے؟ یہ ٹائم ٹیبل بھی تیار ہونے لگا۔ شباب صاحب اب پھنس چکے تھے اس لیے ہر تجویز پر "ہاں ہاں" کرتے رہتے تھے۔

ابھی پروگرام زیر ترتیب ہی تھا کہ ہم سب کے مشترکہ دوست حسن مہدی صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ وہ یوں تو مختلف قسم کے کاروبار کرتے تھے لیکن ان دنوں پاکستانی فلمیں انگلستان میں نمائش کے بھی حاصل کیا کرتے تھے۔ برمنگھم میں ان کے حصے دار اور دوست عابد شاہ تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس زمانے میں عابد شاہ اور حسن صاحب نے سب سے زیادہ پاکستانی فلمیں یورپ ریلیز کی تھیں۔ بلکہ عابد شاہ صاحب نے تو لندن اور برمنگھم میں سینما گھر بھی خرید لیے تھے جن میں صرف پاکستانی فلموں کی نمائش ہوتی تھی ورنہ زیادہ تر سینما گھر بھارتیوں کی ملکیت تھے جو پاکستانی فلم کی نمائش کرنا گناہ سمجھتے تھے۔ بہرحال یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ تذکرہ یہ تھا کہ حسن مہدی صاحب ایک روز بھاگے بھاگے ہمارے پاس آئے اور کہا کہ آپ لوگ گروپ کی صورت میں یورپ جارہے ہیں تو کیوں نہ مجھے بھی اس گروپ میں شامل کرلیں؟ حسن صاحب ہم سب کیلئے بے تکلف دوست ، بہت دلچسپ اور وضعدار آدمی ہیں۔ ہمیں بھلا کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ انہوں نے فوراً ہمارے تمام پروگراموں میں شمولیت اختیار کرلی۔ یہ بھی وعدہ کیا کہ یورپ کے بذریعہ ٹرین سفر کے دوران بھی ہمارے ساتھ رہیں گے۔ لیکن ان کی ایک شرط تھی۔

"وہ کیا ہے؟" ہم نے پوچھا۔

کہنے لگے۔"مجھے قاہرہ میں دو تین روز کیلئے ایک ضروری کام کے سلسلے میں قیام کرنا ہے۔ اگر آپ سب لوگ بھی جاتے ہوئے راہ میں قاہرہ میں قیام کرلیں تو کیا برائی ہے؟"

ہمیں تو بہت خوشی ہوئی کیونکہ ہم تو سیروسیاحت کے رسیا تھے۔ جاوید صاحب کو بھی یہ خیال پسند آیا مگر شباب صاحب سوچ میں پڑ گئے۔"یار بلاوجہ چار پانچ روز ضائع ہوجائیں گے۔"

"ارے بھئی قاہرہ دیکھنے کے لائق شہر ہے۔ کیا مضائقہ ہے اگر ہم راستے میں وہاں رک جائیں؟"

حسن صاحب نے فوراً یہ وضاحت بھی کردی کہ ہمارے ٹکٹ کی رقم میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔ صرف قیام وطعام کا خرچا برداشت کرنا ہوگا۔

"بھئی یہ بات غلط ہے۔" شباب صاحب نے فوراً" اعتراض جڑ دیا۔

جاوید نے انہیں سمجھایا۔"بھائی بات سنو۔ ہم لندن اور یورپ جاکر بھی تو ہوٹلوں میں ہی ٹھہریں گے۔ وہاں ہمارے کون سے رشتے دار بیٹھے ہیں جو ہماری مہمان داری کریں گے۔ اگر قاہرہ کے ہوٹلوں میں قیام کرلیں گے تو کون سی قیامت آجائے گی۔"

حسن صاحب کے پاس اس مسئلے کا بھی حل موجود تھا۔ انہوں نے بتایا کہ مصر میں سینما گھروں کے سرکاری ادارے کے ساتھ ان کی بات چیت چل رہی ہے ۔ بہت ممکن ہے کہ وہ لوگ ہمارے قیام کے سلسلے میں کوئی سستا اور معقول بندوبست کردیں۔

جاوید صاحب نے فوراً" ایک نیا داؤ کھیلا'بولے۔" یار شباب قاہرہ کے بیک گراؤنڈ میں ہالی ووڈ والوں نے بہت فلمیں بنائی ہیں۔ وہاں کی ہیروئنیں بھی بہت اچھی ہوتی ہیں۔ ہو سکتاہے کہ وہاں کوئی فلم بنانے کا پروگرام بن جائے۔"

اس وقت دوسرے ملکوں کے ساتھ مشترکہ فلم سازی کا آغاز ہوچکا تھا۔ اگرچہ شباب صاحب نے کسی بیرونی ملک کے ساتھ مل کر کوئی فلم نہیں بنائی تھی۔ لیکن یہ بات سن کر وہ حسب معمول سوچ میں پڑ گئے۔ یہ اور بات ہے کہ شباب صاحب نے زندگی بھر مشترکہ فلم سازی کے تحت کوئی ایک فلم بھی نہیں بنائی۔ ان کے بیٹوں نے

البتہ کو پروڈکشن کی۔ اور اس زیادہ تر دخل شباب صاحب کی تن آسانی کا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ شوٹنگ کیلئے باہر مارا مارا نہ پھرنا پڑے۔ وہ تو پاکستان میں بھی حتی الامکان آؤٹ ڈور شوٹنگ سے گریز کرتے تھے۔ ان کی خواہش ہوتی تھی کہ ساری فلم' اسٹوڈیو کی چاردیواری میں بن جائے۔ اپنی اسی عادت کے تحت وہ اپنے گھر اور دفتر میں بھی فلموں کی شوٹنگ کرلیا کرتے تھے مگر قاہرہ کے پس منظر میں فلم بنانے کا خیال انہیں پسند آگیا۔"

" کہنے لگے۔"وہاں ہیروئنیں بھی سستی مل جائیں گی اور ان کے ایسے نخرے بھی نہیں ہوں گے۔"

حسن صاحب بولے۔" اور سب سے بڑھ کر یہ کہ فلم دیکھنے والوں کو نئے چہرے نظر آئیں گے۔"

جناب شباب کیرانوی صاحب نے فوراً" اس خیال کی منظوری دے دی اور قاہرہ میں قیام کرنے پر رضامند ہو گئے۔ انہیں ایک کشش جامعہ ازہر.... کو دیکھنے کی بھی تھی۔ شباب صاحب نہ صرف حافظ قرآن تھے بلکہ عربی زبان بھی جانتے تھے۔ مذہبی رجحان کے باعث وہ جامعہ ازہر کو بہت اہمیت دیتے تھے اور اب انہیں دیکھنے کا بھی ایک موقع مل رہا تھا۔

" اور ہیروئن کا فائدہ الگ۔" جاوید صاحب نے لقمہ دیا۔

"بھئی ٹھیک ہے۔ آپ سب کہتے ہیں تو مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے مگر اب مصر کیلئے بھی ویزا لینا پڑے گا۔"

اس طرح ہمارا قافلہ براستہ قاہرہ ' یورپ جانے کیلئے تیاریوں میں مصروف ہوگیا۔ ساری فلمی صنعت کو پتا چل گیا کہ یہ لوگ ایک دو ماہ کیلئے یورپ جارہے ہیں۔ شباب صاحب نے اور ہم سب نے زیر تکمیل کام مکمل کرنا شروع کردیا۔ یار لوگوں نے جان بوجھ کر یہ افواہ بھی اڑا دی کہ یہ لوگ نہ صرف مصر میں فلمیں بنائیں گے بلکہ وہاں سے اچھی اچھی ہیروئنیں بھی لے کر آئیں گے۔

ایک ہیروئن نے ہم سے کہا۔ "کیا پاکستان میں ہیروئنوں کی کمی ہے جو آپ مصر میں تلاش کرنے جارہے ہیں؟"

ہم نے کہا۔"یقیناً کمی ہے۔ فلمیں بہت زیادہ ہیں۔ اچھی ہیروئنیں دو چار

سے زیادہ نہیں ہیں اسی لئے وہ نہ تو فلموں کیلئے پورا وقت دیتی ہیں اور نہ ہی معاوضہ کم کرتی ہیں جو نخرے کرتی ہیں وہ الگ۔"

" ایسا تو نہ کہئے۔ سچ بتائیے آپ سے میں نے کبھی نخرہ کیایا آپ کو وقت دینے سے انکار کیا؟"

ہم نے کہا۔"دیکھو اگر دوچار اور ہیروئنیں آجائیں گے تو کوئی قیامت تونہیں آجائے گی۔ ہر ہیروئین اسی طرح مصروف رہے گی۔ بس ذرا نخروں میں کمی ہوجائے گی اور مقابلے میں کام بھی اچھا ہوگا۔"

ایک ہیروئن نے تو اس بات پر ہم سے ناراض ہوکر بات چیت ہی بند کردی۔ ہم نے کہا بھی کہ یہ تو وہی بات ہے کہ سوت نہ کپاس ۔ جولا ہے سے لٹھم لٹھا۔ ابھی تو کوئی ہیروئن آئی بھی نہیں ہے اور تم ناراض ہوگئیں اور پھر عربی بولنے والی ہیروئن تو ویسے بھی متبرک ہوگی مگر صاحب توبہ کیجئے۔ یہ باریکیاں ہیروئنوں کی سمجھ میں کب آتی ہیں۔

شباب صاحب نے زاد سفر سمیٹنا شروع کردیا۔ پیکنگ دو ہفتے پہلے ہی شروع ہوگئی۔وہ ہر روز ہمیں مطلع کرتے کہ آج اتنے سوٹ رکھوا دیے ہیں اتنی ٹائیاں پیک کرادی ہیں۔ اتنی چپلیں پیک کرادی ہیں۔ شیونگ کاسامان ' کریم پرفیوم غرض کہ ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز پیک کرا دی گئی ہے۔

ایک دن جب انہوں نے بتایا کہ انہوں نے وٹامن کی گولیاں بھی پیک کرادی ہیں تو جاوید صاحب نہ رہ سکے اور کہا۔"بھائی ایک بات تو بتاؤ۔ تم قاہرہ اور یورپ جارہے ہو۔ افریقہ کے کسی ریگستان میں یا ٹمبکٹو تو نہیں جارہے ہو۔ وہاں ہرچیز مل جاتی ہے۔ اور اتنی بہت سے چپلوں کا کیا کرو گے؟ وہاں دکان کھولنی ہے؟

اطمینان سے بولے۔"یار پہنا کریں گے۔ غسل خانے اور ہوٹل کے بیڈ روم میں۔"

"مگر اس کے لئے تو ایک ہی سلیپر یا چپل کافی ہے۔"

" اگر موسم اچھا ہوگا تو باہر بھی چپل پہن کر جایا کریں گے.... یار چپل پہن کر گھومنے کی بات ہی اور ہے۔ سنا ہے وہاں اچھی چپلیں ملتی بھی نہیں ہیں۔ واپسی میں اپنے جاننے والوں کو تحفہ دے آئیں گے۔"

ایک طرف تو یہ تیاریاں ہو رہی تھیں۔ دوسری طرف ہر شخص دوسرے کو یہ مشورہ دے رہا تھا کہ زیادہ سامان ساتھ نہ رکھنا ورنہ مشکل ہو جائے گی۔ سنا ہے وہاں لوڈر وغیرہ نہیں ملتا بہت مہنگا ملتا ہے اور سامان بھی خود ہی اٹھانا پڑتا ہے۔ یہ بات ہم ہی نے انہیں بتائی تھی اور شباب صاحب کے سفر یورپ کی راہ میں یہ بھی ایک بڑی رکاوٹ تھی۔

"بھئی یہ تو بہت مشکل ہے۔ سامان بھی خود ہی اٹھاؤ۔ نہیں یار مجھ سے یہ نہیں ہوگا۔"

ہم نے کہا۔" ہم سوٹ کیسوں کے لئے ٹرالیاں لے لیں گے اور جہاں مناسب سمجھیں گے وہاں لوڈر کی خدمات بھی حاصل کرلیں گے۔ آپ فکر نہ کریں آپ کو تکلیف نہیں ہوگی۔"

ہم یورپ کے سفر کے دوران میں وہاں سے ہلکی ہلکی ٹرالیاں بھی لے آئے تھے جن پر سوٹ کیس اور دوسرا سامان رکھ کر آپ اپنے ساتھ گھسیٹتے پھریں۔ ذرا بھی زور نہیں لگانا پڑتا۔ جاوید صاحب اور شباب صاحب کے بارے میں یہ طے پایا کہ وہ قاہرہ پہنچتے ہی ٹرالیاں خرید لیں گے۔

"وہاں ایئرپورٹ پر ڈیوٹی فری شاپس تو ہوں گی؟" شباب صاحب نے پوچھا۔

"کیوں نہیں ہوں گی مگر ڈیوٹی فری شاپس سے سامان گھسیٹنے والی ٹرالیاں خریدنا تو بہت بدذوقی ہوگی۔"

" یار وہاں کون دیکھے گا۔ مصریوں کو پتا بھی نہیں چلے گا۔ وہ کون سا ہمیں جانتے ہیں۔"

روانگی میں چند دن رہ گئے تھے کہ ایک ہیروئن اسٹوڈیو میں ہمیں ملیں اور ہمیں ایک طرف لے جاکر بولیں۔"آفاقی صاحب' میں آپ کی اور شباب صاحب کی فلموں میں رعایت کردوں گی۔ ڈیٹس بھی آپ کی مرضی کے مطابق دے دوں گی۔"

"مگر ہم تو فی الحال فلم ہی نہیں بنا رہے۔ نہ ہی شباب صاحب کی کوئی فلم زیر تکمیل ہے۔"

"میں آئندہ کی بات کررہی ہوں۔ ویسے بھی ذرا سوچئے کہ وہ عربی بولنے والی ہیروئن ہمارا ماحول کیسے سمجھے گی۔ پاکستانی فلموں کے بارے میں انہیں کیا خبر ہے؟"

ہم نے کہا۔"فلمیں سب جگہ ایک جیسی ہوتی ہیں اور ہر ملک کی ہیروئن کو رومانس کرنا آتا ہے۔"

مگر ناچنا اور گانا نہیں آتا۔ سنا ہے مصری فلموں میں ہیروئن ڈانس ہی نہیں کرتی۔"

"تو پھر کیا ہوا۔ ڈانس ڈائریکٹر کس مرض کی دوا ہے۔ سکھا دے گا۔"

"آپ اس جھگڑے میں کیوں پڑتے ہیں۔ اپنے ہی ملک میں اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ دوسروں کی محتاجی کیوں برداشت کرتے ہیں۔"

ایک طرف تو ہیروئنوں میں پریشانی اور ہراس پھیل گیا تھا دوسری طرف کئی شناسا فلم ساز یہ فرمائش کررہے تھے کہ اچھی سی ہیروئن مل جائے تو بے شک لے آنا۔ ہم بھی اپنی فلم میں کاسٹ کرلیں گے۔

اس پر ہم کہتے۔" ان ہیروئنوں کے دماغ ٹھکانے لگانے کیلئے مصر سے ہیروئنیں لانا بہت ضروری ہے۔"

گویا شاپنگ لسٹ میں ہرروز اضافہ ہو رہا تھا۔ کوئی دن ایسا نہیں جاتا تھا جب کوئی فلم ساز یا ہدایت کار ہمیں مصر سے ہیروئنیں لانے کی تاکید نہیں کرتا تھا۔

ایک دن شباب صاحب کے پاس گئے تو وہ سخت بیزار بیٹھے تھے۔"یار آفاقی۔ یہ تم نے کس مصیبت میں ڈال دیا ہے۔"

"کیوں کیا ہوا؟"

"بھئی ہیروئنوں اور فلم سازوں نے ناک میں دم کردیا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ مصری ہیروئنیں ہرگز نہ لائیں۔ فلم سازوں کا اصرار ہے کہ دو چار اچھی ہیروئنیں چھانٹ چھانٹ کر ضرور لائیں۔ میں تو تنگ آگیا ہوں۔"

ہم نے کہا۔"چپ چاپ سب کی سنتے رہیں اور ایک دو ہیروئنوں سے اس چکر میں ابھی سے ایگریمنٹ کرلیں کفایت رہے گی۔"

شباب صاحب کو یہ آئیڈیا بھی بہت پسند آیا۔ چنانچہ انہوں نے دو تین ہیروئنوں سے آئندہ فلموں کیلئے خاصی کفایت سے ایگریمنٹ کرلیے۔ وہ زیادہ فلمیں بناتے اور اکثر کئی فن کاروں کو پہلے ہی سے سائن کرلیا کرتے تھے۔ ان کے لئے یہ تو معمول کی بات تھی مگر ہم ایک وقت میں ایک ہی فلم بناتے تھے اور پہلے فلم کی کہانی

لکھتے تھے اس کے بعد ہیروئن کا انتخاب کرتے تھے۔ اس لئے اس موقعے سے فائدہ اٹھانے سے قاصر تھے۔ یورپ کے اس سفر کے دوران میں ایک کہانی لکھنے کا پروگرام ہمارے منصوبے میں شامل تھا لیکن پیشگی ہیروئن سائن کرلینا ہمارے بس کی بات نہیں تھی۔ اس زمانے میں ہم اور رشید صاحب مل کر فلمیں بنایا کرتے تھی ۔ ہماری دو فلمیں "آس" اور "آبرو" ہٹ ہوچکی تھیں ۔ اب ہم نے تیسری فلم کی کہانی لکھنے کیلئے یورپ کا انتخاب کیاتھا۔ ظاہر ہے جب تک کہانی موجود نہ ہو ہیروئن کا انتخاب نہیں کیاجاسکتا تھا۔

جاوید صاحب نے کہا۔"یار ایک اچھی سے ہیروئن سائن کرلو۔ تم سے تو وہ ایڈوانس کی رقم بھی نہیں لے گی کردار کے مطابق نہ ہوگی تو اسے فارغ کردینا۔"

ہم نے کہا۔"بھائی یہ تو سخت غیر اخلاقی حرکت ہوگی اور کاروباری لحاظ سے بھی یہ مناسب نہ ہوگا۔"

جاوید صاحب بہت جوش میں تھے۔ کہنے لگے۔ "یار سنو۔ ہم بھی شباب کی طرح ایک ساتھ دو تین فلمیں کیوں نہ بنایا کریں؟"

ہم نے کہا۔"اپنا اپنا طریقہ ہوتاہے۔ وہ اس کے عادی ہیں۔ ہمیں ایسا کوئی تجربہ نہیں ہے اور پھر مجھ سے تو ایک وقت میں ایک ہی کام ہوسکتا ہے۔"

"تم تو پیدائشی کاہل اور آرام پسند آدمی ہو۔" وہ مایوسی سے بولے۔

قصہ مختصر یہ کہ ہم اپنی روانگی سے پہلے کسی ہیروئن کو سائن نہ کرسکے۔ دعوتیں البتہ بہت کھائیں مگر یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ اس زمانے میں میل جول کا رواج تھا اور عام طور پر فن کاروں کے گھروں میں کھانے پینے کے پروگرام رہا کرتے تھے۔

لاہور میں ان دنوں سخت گرمی تھی ۔ اس پر مختلف محکموں میں بھاگ دوڑ نے پریشان کررکھا تھا۔ کبھی اسٹیٹ بینک جانا پڑتا تو کبھی پاسپورٹ آفس ۔ ٹریولنگ ایجنٹ کے مسائل الگ تھے ۔ اس پر لاہور کی قیامت خیز گرمی نے پریشان کررکھا تھا۔ لیکن صرف اس امید نے حوصلہ بڑھا رکھا تھا کہ بہت جلد ان مسائل سے نجات مل جائے گی اور ہم یورپ کی طرف پرواز شروع کردیں گے۔

لاہور سے جب ہم کراچی کی فلائٹ میں سوار ہوئے تو اطمینان کا سانس لیا۔ بیرونی سفراس زمانے میں ایک مصیبت سے کم نہ تھا۔ اجازت نامہ حاصل کرنا۔ پاسپورٹ ویزا اور سب سے بڑھ کر غیر ملکی زرمبادلہ کی مشکل ۔ ہوائی جہاز میں سوار ہوتے ہی پروگرام مرتب ہونے لگے۔ کراچی میں ہمیں صرف ایک دن ٹھہرنا تھا۔ اس کے بعد قاہرہ کیلئے پرواز کرجانا تھا۔

ہم نے پوچھا۔" قاہرہ میں ہم ٹھہریں گے کہاں؟"

"کیسی بچوں جیسی باتیں کرتے ہو۔" شباب صاحب بولے ۔" یار وہاں بہت ہوٹل ہیں ، گلی گلی میں ہوٹل ہیں ۔ مجھے ایک صاحب نے بتایا تھا ۔ وہ تو مسافر کے انتظار میں بیٹھے مکھیاں مارتے رہتے ہیں ۔"

حسن صاحب اور جاوید صاحب کا بھی پہلا سفر قاہرہ تھا اس لیے وہ خاموش رہے مگر ہم پہلے ایک تجربہ حاصل کر چکے تھے ۔ اس لیے کہا۔" وہاں سیزن میں بکنگ کرائے بغیر جانا قیامت سے کم نہیں ہے ۔ وہاں گلی گلی ہوٹل تو ہیں مگر گلی گلی سیاحوں کی ٹولیاں بھی گھومتی پھرتی ہیں ۔ بہت مشکل پیش آتی ہے کمرا حاصل کرنے میں ۔"

" یار ایک تو تم وہمی بہت ہو ۔" شباب صاحب نے اطمینان سے کہا۔" وہم کا علاج تو حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا۔ بلاوجہ پریشان ہو رہے ہو۔ ارے اللہ پر بھروسہ رکھو قاہرہ پہنچنے تو دو ۔ دیکھ لینا سب ٹھیک ہو جائے گا ۔"

ہم پھر بھی متفکر تھے۔ جاوید صاحب نے کہا۔ " بھئی شباب صاحب نے کہہ جو دیا کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ نیک آدمی ہے اس کی زبان میں بہت برکت ہے ۔"

کراچی میں ہم لوگ جگدیش چندر آنند کی کوٹھی پر ٹھہرے۔

وہ اس بات پر آمادہ نہیں تھے کہ ان کے پروڈیوسر یورپ جاتے ہوئے ایک رات کے لیے ہوٹل میں قیام کریں ۔ جگدیش صاحب نے ہمارا ایک اور کام بھی کرادیا ۔ہم تو اللہ توکل انگلستان جارہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ احتیاط" ویزا لے لینا چاہیے ۔ چنانچہ ہم نے ویزا فارم پر کردیے ۔ ان کا ایک کارندہ گیا اور کچھ دیر بعد ویزے لے کر آگیا۔

" فارن ایکس چینج کی کیا پوزیشن ہے ؟" انہوں نے پوچھا۔

" کچھ بندو بست تو کیا ہے ؟"

انہوں نے جھٹ پٹ ایک خط ٹائپ کرا کے ہمارے حوالے کیا اور کہا کہ لندن میں جتنے پونڈ کی ضرورت پڑے اس شخص سے لے لینا۔

رات کے وقت انہوں نے اپنے گھر پر ڈنر دیا تھا جس میں کچھ فلم والے اور چند صحافی مدعو کیے گئے تھے ۔ میر خلیل الرحمن صاحب بطور خاص آئے تھے ۔ وہ اس بات پر بہت خوش تھے کہ صحافی بھائی مصر اور یورپ جا رہے تھے۔ رات کے گیارہ بج گئے مگر دعوت ختم نہ ہوئی تو ہمیں گھبراہٹ شروع ہو گئی۔ فلائٹ کے لے ہمیں ساڑھے بارہ بجے ائر پورٹ پہنچ جانا چاہیے تھا۔ اس لیے ہم نے شباب صاحب سے کہنا شروع کیا کہ بھئی جلدی کریں وقت کم رہ گیا ہے ۔ ادھر لوگوں کی لطیفہ بازی ختم نہیں ہوئی تھی ۔ ہر شخص انگلستان کے لطیفے سنا رہا تھا۔ ایک اور مشکل یہ تھی کہ ہر پانچ منٹ کے بعد لاہور سے شباب صاحب کے لیے کوئی نہ کوئی فون آجاتا تھا۔ کبھی کوئی عملے کا رکن کوئی مسئلہ بیان کرتا۔ کبھی گھر والے کوئی بھولی ہوئی فرمائش نوٹ کرا دیتے ۔ کبھی کوئی ایکٹریس میک اپ کا سامان لانے کی یاد دہانی کرا دیتی چلتے چلتے بھی ایک بہت بڑے اداکار کا فون آگیا۔ انہیں فوری طور پر پیسوں کی ضرورت تھی۔

" بھئی اس وقت میں پیسے کہاں سے لاؤں ؟" شباب صاحب تنگ آکر بولے ۔

" جگدیش صاحب سے کہہ دیجئے ۔ میں ان کے لاہور آفس سے لے لوں گا۔"

" دیکھا آپ نے یہ چونا لگانے والی قوم کس قدر خود غرض ہوتی ہے ارے بھئی میں تھوڑے دن کے لیے ہی تو جارہا ہوں کیا یہ چند دن صبر نہیں کر سکتے تھے۔"

پھر بھی انہوں نے جگدیش صاحب سے کہا کہ انہیں کچھ رقم اور بھجوادیں ۔ ٹیلی فون پر یہ ڈرامے جاری تھے ۔ ادھر ڈرائنگ روم میں لطیفے چل رہے تھے۔

" ایک بزرگ مصر سے ہو کر آئے تو لوگوں نے پوچھا کہ آپ نے بہت دن لگا دیئے وہ بولے۔" کیا کروں میں تو آنا چاہتا تھا۔ مگر ابو الہول میری جان نہیں چھوڑ رہے تھے؟"

(ابو الہول ؟"

"ارے ہاں بھئی۔ہمارے والد صاحب سے ان کے پرانے تعلقات ہیں۔ ہم نے بھی سوچا کہ بزرگ آدمی ہیں ان کی بات مان ہی لیں۔"

ایک اور صاحب نے لطیفہ سنایا۔"جب ہم پہلی بار مصر کے دورے پر گئے تو ہمارے ساتھ چند مولوی قسم کے لوگ بھی تھے۔ جب ائرہوسٹس نے اعلان کیا کہ اب ہم عنقریب قاہرہ کے بین الاقوامی ائرپورٹ پر اترنے والے ہیں تو انہوں نے کھڑے ہوکر جلدی جلدی اپنے بیگ میں سے سامان نکالنا شروع کردیا۔

"خیر تو ہے۔اتنی جلدی کس بات کی ہے۔ ذرا جہاز کو رک تو لینے دیں ۔"

وہ بولے ۔"میں احرام تلاش کررہاہوں۔ میرے ایک دوست نے بتایا تھا کہ اہرام دیکھنے ہیں تو ائرپورٹ سے ہی احرام باندھ لینا۔"

ہم نے گھڑی دیکھی تو بارہ بج رہے تھے ۔ میزبان جگدیش صاحب کی توجہ اس طرف مبذول کرائی اور کہا کہ اب ہمیں اجازت دیجئے ۔

"پاپے یہ کیسے ہوسکتا ہے۔" وہ اپنے مخصوص انداز میں بولے۔" ابھی تو بہت وقت ہے۔ اتنی اچھی محفل ہورہی ہے۔"

ہم نے کہا۔"آپ پریشان نہ ہوں۔ آپ سب کے پاسپورٹ میں نے ائرپورٹ بھجوا دیئے ہیں۔ وہاں آپ کے بورڈنگ کارڈ بھی بن جائیں گے۔ فکر نہ کریں۔ آپ کے بغیر پی آئی اے کا جہاز نہیں اڑے گا اور پھر ہم سب آپ لوگوں کو خدا حافظ کہنے ائرپورٹ بھی تو جائیں گے۔"

خدا خدا کرکے ایک بجے ہم لوگ کاروں میں سوار ہوئے۔ ائرپورٹ پر کسٹم اور امیگریشن کا عملہ منتظر تھا۔ چیکنگ وغیرہ کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ ہر شخص ہم سے ہاتھ ملانے کا خواہش مند تھا۔ جگدیش صاحب کی وہاں بہت شناسائی تھی۔ اور پھر میر خلیل الرحمن ہمراہ ہوں تو کس کی مجال تھی کہ چوں بھی کر جاتا۔ وہ زمانہ صحافیوں کی اہمیت کا زمانہ تھا۔

ہر محکمہ یہاں تک کہ وزراء بھی ان کو اہمیت دیا کرتے تھے۔ ایک صاحب نے ہم لوگوں کے پاسپورٹ اوور بورڈنگ کارڈ لاکر ہمارے حوالے کردیے تو ہمارے دم میں دم آیا مگر ابھی تصویریں بنانے کا مرحلہ باقی تھا۔

میر خلیل الرحمن صاحب نے ایک فوٹوگرافر کو بطور خاص بلایا تھا۔ ہم سب

کے گلوں میں ہار ڈالے گئے اور بہت دیر تک تصاویر اتاری گئیں۔ اس اثناء میں دوسرے مسافر آتے جاتے رہے۔ وہ ہم لوگوں کو حیران ہو کر دیکھ رہے تھے۔

ایک صاحب نے ہمارے پاس آکر پوچھا۔"کیا آپ لوگ حج پر جا رہے ہیں؟"

ہم نے کہا۔"بھائی آپ صورت سے تو مسلمان نظر آتے ہیں - یہ نہیں جانتے کہ آج کل کس مہینے میں حج ہوتا ہے؟"

بولے۔" تو پھر عمرے پر جا رہے ہوں گے؟"

ہمیں بہت شرمندگی ہوئی کہ ان کی نیک توقعات کے برعکس ہم مصر اور یورپ جا رہے تھے۔

جاوید صاحب نے ہمارے کان میں کہا۔"بہت شرم کی بات ہے - اس شخص نے ہمارے ضمیر کو جھنجوڑ دیا ہے۔ اب واپسی میں ہم عمرہ ضرور کریں گے۔"

"انشاء اللہ " ہم نے کہا اور شباب صاحب کو بھی عمرے پر ساتھ لے چلیں گے۔"

وہ بولے۔"مگر شباب تو حج کر چکے ہیں۔"

"تو پھر کیا ہوا - حج کرنے کے بعد عمرہ کرنا جائز نہیں ہوتا؟"

کہنے لگے۔" یہ تو کسی مولوی سے پوچھنا پڑے گا۔"

ہر چیز کی ایک انتہا ہوتی ہے۔ چنانچہ پی آئی اے کے ایک کارکن نے آکر میر خلیل الرحمن صاحب سے فریاد کی کہ فلائٹ کا وقت ہو چکا ہے۔ اب تو اپنے مسافروں کو ہوائی جہاز میں بھیج دیجئے۔

ایک بار پھر بغل گیری کا سلسلہ شروع ہوا اور پھر ہم لوگ سوئے طیارہ روانہ ہو گئے۔ اس طرح ہمارے سفر کا آغاز بہت اچھا اور حوصلہ افزا ہوا۔

9

ہوائی جہاز میں سوار ہونے کے بعد شباب کیرانوی نے پہلا سوال یہ کیا کہ ہم کتنی دیر میں قاہرہ پہنچیں گے؟

ہم نے بتایا۔" اندازاً" تین یا ساڑھے تین گھنٹے میں پہنچ جائیں گے۔"

وہ مطمئن ہو کر کرسی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ سب سے پہلے تو انہوں نے بیل دبائی اور ایک ائرہوسٹس سے دو فرمائش کیں۔ ایک تکیہ اور دوسرا چائے کا کپ۔

وہ حیران ہو کر انہیں دیکھنے لگی۔ تکیہ عموماً" لوگ سونے کے لئے استعمال کرتے ہیں اور چائے کا کپ بیدار ہونے کے بعد طلب کرتے ہیں مگر انہوں نے بیک وقت دونوں چیزیں لانے کی فرمائش کی تھی۔ وہ سرہلا کر چلا گئی۔

جاوید صاحب نے کہا۔" کیا چائے کے ساتھ تکیہ کھانے کا ارادہ ہے؟"

بولے "دیکھتے رہو۔"

ہم لوگ خاموشی سے دیکھتے رہے۔ چند لمحے بعد تکیہ آگیا۔ وہ انہوں نے اپنے سرہانے رکھ لیا اور نیم دراز ہو گئے۔ اتنی دیر میں چائے کی پیالی بھی آگئی - وہ انہوں نے اپنے سامنے والی چھوٹی سی میز پر رکھ لی پھر ہم دونوں سے مخاطب ہو کر بولے۔"اب ہم کہانی کا آئیڈیا ڈسکس کریں گے۔"

"کون سی کہانی؟"

"یہی تو سوچنا ہے اب دیکھو نا۔ ہم ہوائی جہاز میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ چاروں طرف غیر ملکی عورتیں اور مرد ہیں۔ بہت اچھا ماحول ہے۔ ہماری پہلی منزل قاہرہ ہے۔ فرض کریں کہ ہم ایک رومانی کہانی سوچتے ہیں۔"

" مثلاً یہ کہ ہیرو ائرہوسٹس کو بلا کراس سے تکیہ منگاتا ہے اور ہم ڈریم میں دکھاتے ہیں کہ وہ ائرہوسٹس کے ساتھ باغ میں گانا گارہا ہے جو کہ دراصل فلم کی ہیروئن ہے۔"

"بہت فضول او پتنگ ہے۔" انہوں نے منہ بنایا۔

"سنو۔" جاوید صاحب نے ہم دونوں کو متوجہ کیا۔"ہم اسمگلر کی کہانی کیوں نہ سوچیں؟"

اس زمانے میں ہیروئن اتنی عام نہیں ہوئی تھی اس لئے عام طور پر ہیروئن کی اسمگلنگ ہوا کرتی تھی۔

" فرض کیجئے کہ ہیرو کے برابر میں ایک خوبصورت لڑکی بیٹھی ہے۔ وہ باربار میٹھی نظروں سے اس کی جانب دیکھ رہی ہے۔ لڑکی کے برابر میں ایک خوفناک صورت والا آدمی بھی بیٹھا ہے۔ لڑکی اس سے ڈری ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اس شخص کے پاس ایک بریف کیس ہے جسے وہ باربار کھول کر دیکھتا ہے اور مسکراتا ہے۔ جب وہ خوفناک صورت والا شخص سوجاتا ہے تو لڑکی ہیرو سے سرگوشی میں کہتی ہے کہ میں بہت مشکل میں گرفتار ہوں۔ میری مدد کرو۔ پھر وہ کسی بہانے اٹھ کر جاتی ہے اور ہیرو کو اپنے پیچھے آنے کااشارہ کرتی ہے۔ وہ بے چارہ حیران تو ہوتا ہے مگر کیوں کہ لڑکی خوبصورت ہے اس لیے اس کی بات بھی نہیں ٹال سکتا۔ لڑکی اسے چپکے سے بتاتی ہے کہ اس کے ساتھ جو شخص بیٹھا ہے وہ ایک سمگلر ہے اور اس نے لڑکی کو بلیک میل کر کے اپنے ساتھ رکھاہواہے۔ تم میری مدد کرو۔"

"ارے نہیں بھئی۔ یہ اسمگلنگ وغیرہ نہیں ہونی چاہئے۔ کوئی رومانی اور معاشرتی قسم کی کہانی ہونی چاہیے۔"

ہم نے کہا۔"اگر قاہرہ کے پس منظر میں فلم بنانی ہے تو پھر اسمگلنگ ہی اچھا موضوع ہے۔ اس بہانے ہیرو ہیروئن شہر میں بھاگ دوڑ کریں گے۔ ولن وغیرہ ان کا پیچھا کریں گے ۔ اس بہانے سارا شہر دکھایا جاسکتا ہے۔"

"مگر قاہرہ میں فلم کون بنارہاہے؟" شباب صاحب نے کہا۔

"ہم بنا رہے ہیں۔" ہم نے جواب دیا۔" وہاں کسی فلم ساز سے بات کریں گے۔ ہوسکتا ہے کو پروڈکشن کے لئے رضامند ہوجائے۔"

اب حسن صاحب بھی ہماری گفتگو میں شامل ہوگئے۔ بولے۔"میرے قاہرہ میں چند ایسے واقف کار ہیں جن کا فلمی صنعت سے بھی تعلق ہے۔ ان کے ساتھ مل کر فلم بنائی جاسکتی ہے۔ ہمیں ائرپورٹ پر لینے کے لئے جو شخص آئے گا وہ حکومت کی سینما ایسوسی ایشن کا ڈپٹی مینجر ہے۔ اس کی سب سے جان پہچان ہے۔"

چھوڑو یار آفاقی۔ اتنی گرمی میں فلم بناؤ گے۔ اچھا پہلے میری کہانی تو سن لو۔" شباب صاحب نے فوراً" اپنی کہانی پر ڈسکشن شروع کردی۔

رات ہوچکی تھی۔طیارے کی روشنیاں بجھا دی گئی تھیں۔ اور تقریباً" سبھی مسافر سونے یا اونگھنے میں مصروف تھے مگر ہم لوگ فلم کی کہانی ڈسکس کررہے تھے۔ شباب صاحب نے ڈھونڈ ڈھانڈ کر ایک ساس بہو اور نند بھاوج کی کہانی تلاش کرلی تھی۔ جب طیارے کی روشنیاں دوبارہ آن ہوئیں اور ائرہوسٹس خواتین منہ ہاتھ دھوکر تازہ میک اپ کے ساتھ جلوگر ہوئیں اور ناشتے کا اہتمام شروع ہوا تو اس وقت ہماری کہانی ایک نازک موڑ سے گزر رہی تھی۔ بدمزاج اور بدفطرت بہو نے اپنے شوہر کو الو بنالیاتھا۔ اور اپنی ساس اور نند کو گھر سے نکلنے پر مجبور کردیاتھا۔ یہ نازک موقع تھا جب ائرہوسٹس نے ہمارے سامنے ناشتے کی ٹرے لاکر رکھ دی۔ چنانچہ کہانی پر ڈسکشن ملتوی کردی گئی۔

ناشتے سے فارغ ہوئے تو معلوم ہوا کہ قاہرہ کا ایئرپورٹ آنے ہی والا ہے۔ حسن صاحب ہم لوگوں کو باربار متوجہ کررہے تھے کہ فلاں ائرہوسٹس ہیروئن بننے کے قابل ہے۔ آپ کہیں تو اس سے بات چھیڑوں۔"

ہم نے کہا۔" فی الحال آپ ہیروئن کو بھول جائیے' یہ بتایئے کہ اگر آپ کا دوست ہمیں لینے کیلئے ائرپورٹ نہیں آیا تو ہم کیا کریں گے؟"

کہنے لگے۔" ایسا نہیں ہوسکتا۔ محب بہت ذمے دار اور مخلص آدمی ہے۔"

معلوم ہوا کہ ان صاحب کا نام محب باشندی ہے۔

"مگر ہم انہیں پہچانیں گے کیسے؟"

"میں پہچان لوں گا۔ میں اس سے پہلے بھی مل چکا ہوں۔" حسن صاحب نے اطمینان دلایا۔"میں نے تار دے دیا تھا کہ ہمارے لئے ہوٹل کا بندوبست کر لے کیونکہ ہمارے ساتھ ایک خاتون بھی ہوں گی۔"

اس وقت تک ہم خاتون یعنی لبنیٰ کو قریب قریب بھول ہی چکے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ وہ سیٹ پر بیٹھتے ہی سو گئی تھیں۔ ائرہوسٹس نے ناشتے کے لئے انہیں جگایا تو انہوں نے۔"جی نہیں چاہ رہا" کہہ کر انکار کر دیا۔

ہم نے کہا بھی کہ تھوڑا سا ناشتا کر لو۔ پردیس کا معاملہ ہے۔ خدا جانے کن حالات سے واسطہ پڑے مگر ان کا کہنا تھا کہ اگر ضرورت پڑی تو وہ ہوٹل پہنچ کر کچھ ناشتا کر لیں گی۔

جاوید صاحب نے کہا۔"بھائی یہ مفت کا ناشتا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ یہ ہمارے ٹکٹ میں شامل ہے۔ ہوٹل میں ناشتا کریں گے تو بل دینا پڑے گا۔"

"دے دیں گے۔" وہ بے نیازی سے بولیں' اس کے بعد مزید بحث کی گنجائش ہی نہیں تھی۔

10

قاہرہ پر ہوائی جہاز کے اترنے کا اعلان ہوا تو ہم سب کھڑکیوں نے باہر جھانکنا شروع کر دیا۔ پہلے تو بادل نظر آئے پھر ریت اور ریگستان کی باری آئی۔ ہم تو سمجھے کہ شاید ریگستان ہی میں ہمیں اتارا جائے گا۔ حالانکہ ایک بار ہم قاہرہ کا ائرپورٹ پہلے بھی دیکھ چکے تھے۔ بہت اچھی عمارت تھی اور آس پاس بھی کافی درخت اور سبزہ تھا مگر یہاں سبزہ وگل دور دور تک نظر نہیں آرہے تھے۔

" یار یہ تو ریگستان ہے ۔" شباب صاحب نے خیال ظاہر کیا۔

"فکر نہ کریں ابھی نخلستان بھی آجائے گا۔" حسن صاحب نے تسلی دی۔

خیر نخلستان تو نظر نہیں آیا مگر ریت کے ٹیلے کچھ کم ہو گئے۔ اس کے بعد یہاں وہاں کچھ سڑکیں اور مکان نظر آنے لگے ۔ یہاں تک کہ ہوائی جہاز رن وے پر اتر گیا۔ اپنے کارڈز وغیرہ ہم پہلے ہی پر کر چکے تھے ۔ جاوید صاحب نے کہا کہ وہ عینک کہیں رکھ کر بھول گئے ہیں ۔ اس لیے ان کا کارڈ کوئی اور پر کر دے ۔ حسن صاحب نے فوراً" ان کا کارڈ پر کر دیا ۔ نام پاسپورٹ نمبر وغیرہ بھی درج کر دیا ۔

" لیجئے اب یہاں دستخط کیجئے۔"

بولے۔" دستخط بھی آپ خود کر لیں۔ اس وقت دل نہیں چاہ رہا دستخط کرنے کو " چنانچہ ان کے دستخط بھی حسن صاحب ہی نے کر دئے۔ خاصے اچھے دستخط تھے۔ ہم نے اس بات پر انہیں بہت داد دی اور کہا کہ بعض لوگ اپنے دستخط کے

مقابلے میں دوسروں کے دستخط بہت اچھے کرلیتے ہیں اور اس کی اگر عادت پڑ جائے تو بعض اوقات جیل بھی پہنچ جاتے ہیں۔

اعلان کیا گیا تھا کہ جب تک ہوائی جہاز کے انجن بند نہ ہوجائیں سب مسافر اپنی جگہ پر بیٹھے رہیں مگر ابھی جہاز رکنے بھی نہیں پایا تھا کہ بھاگ دوڑ اور ہڑبونگ شروع ہوگئی۔ بعض مسافروں کا سامان پچھلی جانب تھا جبکہ وہ خود اگلی نشستوں پر تشریف فرما تھے۔ اس طرح پیچھے والے مسافروں کا سامان اگلی جانب تھا۔ وہ فوراً اپنے سامان کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ راہداری کے آس پاس جو لوگ بیٹھے تھے ان کے حصے میں شدید قسم کے دھکے آرہے تھے۔ ہماری پچھلی سیٹ پر ایک پاکستانی بزرگ خاتون تشریف فرما تھیں۔ جب بھی کوئی "نزدیک" سے گزرتا وہ ہم سے مخاطب ہو کر کہتیں۔

"اے بیٹا دیکھنا کوئی میرا سامان ہی نہ لے جائے۔"

ہم نے پوچھا۔ "آپ کے سامان کی پہچان کیا ہے؟"

"بولیں ایک چھوٹا سا سوٹ کیس ہے۔"

بتائیے ۔ اس پہچان کے ذریعے کوئی ان کے سامان کی حفاظت کس طرح کرسکتا تھا۔ وہاں تو ہر ایک کے ہاتھ میں ایک سوٹ کیس تھا۔

ہم نے انہیں تسلی دی کہ "آپ فکر نہ کریں۔ ہوائی جہاز میں کوئی کسی کا سامان نہیں اٹھاتا۔"

"اے بیٹا۔ اس خیال میں نہ رہنا۔ ہوائی جہاز میں بھی چور، بدمعاش اور اٹھائی گیرے سفر کرتے ہیں۔ بس ذرا میرے سامان کا خیال رکھنا۔"

جب مسافروں کی دھما چوکڑی ختم ہوئی تو ہم نے اٹھ کر بڑی بی کی نشان دہی کے مطابق ان کا سوٹ کیس ان کے حوالے کردیا۔ انہوں نے ڈھیروں دعائیں دیں اور پوچھا کہ تم کہاں جارہے ہو؟

ہم نے کہا "قاہرہ اور آپ؟"

بولیں ۔ "میں تو اپنے بیٹے کے پاس لندن جارہی ہوں۔ وہ لڑکی بتا رہی تھی کہ جنکشن پر ہوائی جہاز بدلنا پڑے گا۔ اب دیکھو ۔ لندن تک میرے سوٹ کیس کا اللہ مالک ہے۔"

ائرپورٹ پر اترے تو رات کے تین یا ساڑھے تین بجے تھے۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ اگر مغرب کی سمت میں سفر کیا جائے تو وقت کم ہوتا رہتا ہے جبکہ مشرق کی طرف سفر کریں تو بڑھتا رہتا ہے۔ یعنی ہم کراچی سے چلے تھے تو اس وقت بھی رات تھی اور قاہرہ پہنچے تو بھی رات ہی تھی۔ غالباً دو یا ڈھائی گھنٹے کا فرق پڑ گیا تھا جس کی وجہ سے صبح ہم سے دور ہوگئی تھی۔

سب سے پہلے تو سامان وصول کیا تھا۔ اس کے بعد کسٹم کا مرحلہ تھا۔ ائرپورٹ پر سبھی عملہ مردوں پر مشتمل تھا۔ وردیوں سے لے کر انسانوں تک کوئی بھی چیز سمارٹ نظر نہیں آئی۔ کام کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ تھی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ آپس میں ہی باتیں اور ہنسی مذاق کرنے میں مصروف تھے۔ مسافروں کی طرف توجہ کم تھی۔ ہماری فلائٹ میں جو لوگ قاہرہ اترے تھے ان کی تعداد چالیس کے لگ بھگ ہوگی۔ جن میں ہمیں چھوڑ کر سبھی یورپین مسافر تھے۔ ہم نے مصریوں کی اس خوبی کی دل ہی دل میں داد دی کہ وہ گوری چمڑی والوں سے ذرا بھی متاثر یا مرعوب نہیں تھے۔ ان کے ساتھ بھی وہی سلوک کررہے تھے جو ہمارے ساتھ روا رکھا تھا یعنی بے پرواہی اور بے نیازی۔

کسٹم والوں کا یہ حال تھا کہ لگتا تھا جیسے دشمن کے سامان میں مہلک ہتھیار تلاش کررہے ہیں۔ سوٹ کیسوں میں سے ایک ایک چیز باہر نکلوا کر دیکھ رہے تھے۔ خدا خدا کرکے انہوں نے ایک گھنٹے میں دس بارہ مسافروں کا سامان چیک کیا۔ ہم نے سوچا کہ اس طرح تو ہمیں کھڑے کھڑے صبح ہوجائے گی مگر پھر اچانک عملے کے کچھ لوگ غائب ہوگئے جس کی وجہ سے کارکردگی بہتر ہوگئی اور باقی لوگ صرف نصف گھنٹے میں فارغ ہوگئے۔ کسی کے سامان سے بھی کوئی قابل اعتراض چیز برآمد نہیں ہوئی جس سے انہیں کافی مایوسی ہوئی۔

کسٹم سے فارغ ہوئے تو امیگریشن ہال میں پہنچ گئے۔ یہ ایک کافی بڑا اور کشادہ ہال تھا۔ ایک طرف کاؤنٹر بنے ہوئے تھے۔ صرف ایک کاؤنٹر پر دو تین حضرات بیٹھے ہوئے تھے ۔ باقی خالی تھی۔ چنانچہ اس کاؤنٹر کے سامنے ایک لمبی لائن لگ گئی۔ ہم لوگ خاصے تھک گئے تھے۔ ادھر ادھر دیکھا مگر بیٹھنے کے لئے کوئی بینچ نظر نہیں آئی۔ سارا ہال خالی پڑا ہوا تھا۔ اس پر ستم یہ کہ کاؤنٹر پر جو حضرات متعین تھے وہ باہمی گپ

شپ میں مصروف تھے ۔ سگریٹ نوشی اور چائے نوشی کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی کلب میں بیٹھے ہوئے ہیں ۔ سامنے مسافر دم سادھے کھڑے تھے تھکن اور مسلسل بے داری کے باعث سب کا براحال ہورہاتھا۔ مگر بیٹھیں تو کہاں؟ جن مسافروں کے ساتھ بچے تھے انہوں نے مجبوراً بچوں کو فرش پر لٹادیا۔ کچھ اور تھکے ماندے مسافر بھی فرش پر بیٹھ گئے اور نجات کی دعائیں مانگنے لگے۔ ست رفتار اورباتونی عملہ ہم نے اپنے پاکستان میں بھی دیکھا تھا مگر خوشی کی بات یہ تھی کہ مصری ہم سے بھی بازی لے گئے تھے ۔ ایک گھنٹہ گزر چکا تھا ابھی نصف مسافر بھی فارغ نہیں ہوئے تھے۔

اسی اثناء میں جاوید صاحب کی نظر ایک جانب پڑی۔ یہ ایک کاؤنٹر تھا جس پر کرنسی تبدیل کرانے کا بندوبست تھا۔ شباب صاحب کھڑے کھڑے تھک گئے تھے اور فرش پر بیٹھنے کے قائل بھی نہیں تھے۔ اس لئے مسلسل ٹہل رہے تھے ۔ ہم نے ان سے کہا کہ وہ خود کو مصروف رکھنے کیلئے کرنسی تبدیل کرالائیں۔ اور عربی زبان میں متعلقہ عملے کو کچھ گالیاں بھی دے آئیں۔---- کرنسی تبدیل کرنے کا مشورہ تو انہوں نے منظور کرلیا مگر عربی زبان میں عربوں کو گالیاں دینے پر آمادہ نہ ہوئے ۔ اول تو ہم نے ویسے بھی کبھی ان کی زبان سے گالی نہیں سنی تھی۔ تو پھر عربی زبان میں وہ کسی عرب کو گالی کیسے دے سکتے تھے؟

کرنسی تبدیل کرانے میں بھی کافی وقت لگ گیا۔ وہاں بھی ایک افیمی ٹائپ کے صاحب براجمان تھے اور اتنی ست روی سے کام کررہے تھے کہ لگتا تھا کچھ کرہی نہیں رہے ہیں۔ اتنی دیر میں امیگریشن ہال تھرڈ کلاس کے مسافر خانے کا نمونہ پیش کرنے لگا تھا۔ بچے بوڑھے اور عورتیں بڑے آرام سے پھسکڑا مار کر زمین پر بیٹھ یا لیٹ گئے تھے۔ سامان کا آس پاس ڈھیر لگا ہوا تھا۔

شباب صاحب نے بیزار ہوکر ہم سے پوچھا۔"یہ مصری اتنے ست ہوتے ہیں؟" ہم نے سرہلادیا۔ "تعجب ہے ان لوگوں نے اہرام وغیرہ کیسے بنا لئے تھے؟"

ہم نے کہا۔" وہ انہوں نے نہیں بنائے۔ اس کام کے لئے دوسرے ملکوں سے غلام لائے جاتے تھے۔ ورنہ اگر ان کو کام کرنا پڑتا تو شاید ایک اہرام بھی مکمل نہ ہوتا۔"

ہمیں ایک اور فکر یہ لاحق تھی کہ جو لوگ ہمیں لینے کے لئے آئے ہوئے

تھے۔ وہ کہیں مایوس ہوکر واپس ہی نہ لوٹ جائیں ۔ بہرحال خدا خدا کرکے صبح چھ بجے کے قریب وہاں سے چھٹکارا ہوا اور ہم لوگوں نے بیرونی حصے کا رخ کیا۔

باہر کافی لوگ موجود تھے۔ لوڈر' ٹیکسی ڈرائیور' ہوٹلوں کے نمائندے' ٹریول ایجنسیوں کے کارندے ۔ ہم نے ایک دو ہوٹلوں کے نمائندوں سے کمروں کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے بہت زور زور سے نفی میں سرہلایا اور عربی میں کچھ فرمایا۔ جس کا ترجمہ شباب صاحب نے یہ پیش کیا کہ اس سال تو ہوٹل میں جگہ نہیں ہے۔ چاہیں تو اگلے سال کے لئے بکنگ کرالیں۔

"یا پھر ایک سال کا انتظار کرلیں۔" جاوید صاحب نے پیوند لگایا۔

شباب صاحب کی اور ہم سب کی نظریں چاروں طرف کا جائزہ لے رہی تھیں۔ مگر ہمیں کوئی خاتون دور دور تک نظر نہ آئیں۔ یکایک ایک تیس بتیس سالہ دراز قد' سانولے رنگ کے قبول صورت آدمی نے آگے بڑھ کر حسن مہدی صاحب سے علیک سلیک کرنے کے بعد معانقہ کیا اور دونوں بہت خلوص کے ساتھ گھل مل کر انگریزی میں باتیں کرنے لگے۔ اس کے بعد حسن صاحب نے ان سے ہم سب کا تعارف کرایا۔ معلوم ہوا کہ وہ محب باشندی ہیں۔ آدمی تو معقول تھے۔ مگر قدرے مایوسی ہوئی ۔ ہمارا خیال تھا کہ کوئی خاتون ہوں گی۔ بلکہ اس موضوع پر ہماری اور شباب صاحب کی بحث بھی ہوئی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ محب باشندی کوئی مرد بھی ہوسکتا ہے۔ کیونکہ محب عام طور پر مردوں کا نام ہوتا ہے۔

ہم نے کہا۔" مگر باشندی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ اگر باشندہ ہوتا تو مرد ہوسکتا تھا لیکن باشندی تو کوئی عورت ہی ہوسکتی ہے۔"

باشندی صاحب عربی لب ولہجے میں اچھی انگریزی بول رہے تھے۔ اس وقت دن نکل آیا تھا۔ سورج کی روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ وہ قمیض پتلون پہنے ہوئے تھے۔اور خاصے ہنس مکھ آدمی نظر آرہے تھے۔ ہم نے انہیں بتایا کہ ہمیں امیگریشن اور کسٹم سے نجات حاصل کرنے میں تین گھنٹے لگ گئے۔ ہماری وجہ سے ان کی بھی رات خراب ہوئی اور اتنی دیر انتظار کرنا پڑا۔

وہ مسکرائے اور بولے۔"مجھے معلوم تھا کہ آپ لوگوں کو باہر نکلتے نکلتے کافی

دیر لگ جائے گی اس لیے میں صرف تیس چالیس منٹ پہلے ہی ائرپورٹ پر آیا تھا۔"

ہم ان کے اندازوں کے قائل ہوگئے۔ جاوید صاحب نے پوچھا۔" آخر یہ لوگ ائرپورٹ پر اتنی دیر کیوں لگا دیتے ہیں۔ تیزی سے کام کیوں نہیں کرتے؟"

بولے۔"بس ہم لوگ ذرا سست واقع ہوئے ہیں۔ ہر کام آرام سے کرتے ہیں۔ اس کے بعد وہ ہمیں لے کر ائرپورٹ سے باہر کی جانب چلے۔ ایئرپورٹ پر سامان اٹھانے والوں کی کمی نہیں تھی اور ہمیں معلوم تھا کہ انہیں محنتانہ بھی زیادہ نہیں دینا پڑے گا۔ اس لئے رئیسوں کی طرح لوڈروں کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ائرپورٹ سے باہر نکلے تو باشندی صاحب نے دو ٹیکسی والوں کو اشارہ کیا۔اصولاً" تو ہر ٹیکسی کو باری باری مسافروں کے پاس آنا چاہیئے تھا مگر وہاں اس بات کو کوئی خاطر میں نہیں لارہا تھا۔ ہر ٹیکسی والے کی خواہش تھی کہ سب سے پہلے مسافروں کو اپنی ٹیکسی میں سوار کرلے۔ ٹیکسیاں خاصی اچھی حالت میں تھیں۔ ٹیکسی ڈرائیور بھی صاف ستھرے تھے اور خاصے بااخلاق بھی تھے۔ ٹیکسی میں سوار ہوتے ہوئے حسن صاحب نے باشندی سے دریافت کیا کہ قیام کا بندوبست کس ہوٹل میں ہوا ہے تو اس نے بتایا کہ کسی ہوٹل میں جگہ نہیں مل سکی ہے۔

"تو پھر کیا ہوگا؟" ہم سب پریشان ہوگئے۔"

وہ ہنسنے لگا۔"پریشانی کی بات نہیں ہے۔فی الحال میں آپ کو اپنے فلیٹ میں لے چلتا ہوں۔ آپ لوگ تھکے ہوئے ہیں۔ ذرا آرام کرلیں۔ اس کے بعد کوئی بندوبست کرلیں گے۔"

قاہرہ کی سڑکیں کشادہ اور صاف ستھری تھیں۔ جگہ جگہ کھجور اور پام کے درخت لگے ہوئے تھے۔ سڑکوں کے درمیان میں سبزہ گل کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔ صبح سویرے کا وقت تھا اس لئے سڑکوں پر ٹریفک بھی برائے نام ہی تھا لیکن ہم نے یہ دیکھا کہ ٹریفک کے تمام اشاروں پر ٹیکسی رک جاتی تھی۔ باشندی اتفاق سے ہمارے ساتھ بیٹھا ہوا تھا' وہ تمام راستے مختلف عمارتوں' سڑکوں اور مقامات کے بارے میں معلومات فراہم کرتا رہا۔ ہمیں کچھ علم پہلے ہی سے تھا لیکن لبنیٰ کیلئے یہ سب اطلاعات نئی تھیں۔

قاہرہ کی فیشن ایبل اور جدید علاقے سے گزر کر ہماری ٹیکسیاں ڈاؤن ٹاؤن میں پہنچ گئیں۔

یہ متوسط درجے کا علاقہ تھا اور شہر کے وسط میں تھا۔ لاہور کی بیڈن روڈ یا اسلام نگر سمجھ لیجئے۔ دکانیں زیادہ تر بند تھیں لیکن کہیں کہیں ریستوران کھلے ہوئے تھے۔ سڑکوں پر آمدورفت زیادہ نہیں تھی مگر عباپوش عورتیں مرداور گدھا گاڑیاں نظر آنے لگی تھیں۔

چند سڑکوں سے گزر کر ہم ایک ایسی سڑک میں داخل ہوئے جہاں صرف رہائشی فلیٹ اور مکانات ہی تھے۔ دکانیں نہیں تھیں۔ ایک جگہ ٹیکسیاں رک گئیں اور ہم باہر نکل آئے ہمارا خیال تھا کہ یورپ کے ٹیکسی ڈرائیوروں کی طرح یہ صاحب بھی ہمارا سامان ٹیکسی سے باہر نکال کر رکھ دیں گے مگر وہ بے تعلقی سے بیٹھے رہے۔ سامان ہم سب نے خود ہی باہر نکالا۔ باشندی نے ٹیکسیوں کے میٹر دیکھے اور اپنی جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا کیوں نہ ہوتا۔ آخر ایک مشرقی ملک کا میزبان تھا اور وہ بھی عرب جن کی مہمان نوازی ضرب المثل ہے مگر ہم نے ائرپورٹ سے مصری کرنسی حاصل کرلی تھی اس لیئے فوراً چند نوٹ نکال کر ٹیکسی ڈرائیوروں کے حوالے کردیئے۔ باشندی "نہ نہ" کرتا رہا مگر ہم نے اسے کرایہ ادا کرنے کی اجازت نہیں دی۔

یہ ایک خاصی اچھی سڑک تھی۔ رہائشی علاقہ تھا جس میں زیادہ تر دو اور تین منزلہ فلیٹ بنے ہوئے تھے۔ باشندی نے ایک فلیٹ کا تالا کھولا اور ہم سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچ گئے لیکن ہمارے اوپر جانے سے پہلے باشندی نے درخواست کی' چند لمحے آپ لوگ توقف کریں۔

ہم خاموش کھڑے ہوگئے۔ جاوید صاحب باشندی کی گھبراہٹ سے کچھ مشکوک سے ہوگئے۔

"آخر کیا بات ہے؟ یہ ہم سے کوئی چیز چھپانا چاہتا ہے۔" پھرانہوں نے حسن مہدی سے پوچھا۔"حسن صاحب یہ کیسا آدمی ہے یار کہیں مروا نہ دینا۔"

حسن صاحب ہنسنے لگے۔"بہت شریف آدمی ہے۔پڑھا لکھا ہے' مخلص اور سمجھ دار بھی ہے۔" اتنی دیر میں باشندی تیزی سے سیڑھیاں اتر کر نیچے پہنچ گئے۔"آیئے تشریف لے آیئے۔"

ہم سب اپنا اپنا سامان اٹھاکر چل پڑے۔ شباب صاحب کا کچھ سامان باشندی نے اٹھایااور کچھ حسن صاحب نے کیونکہ ان کے پاس ایک چھوٹے سے سوٹ کیس

کے سوا کچھ نہ تھا۔

یہ تین کمروں کا فلیٹ تھا۔ سامنے ایک بالکونی تھی جس میں چند کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ کمروں میں سامان بے ترتیبی سے پھیلا ہوا تھا۔

"معاف کیجئے گا۔ فلیٹ کچھ زیادہ صاف نہیں ہے مگر کنواروں کے فلیٹ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ امید ہے کہ آپ کی مسز درگزر فرمائیں گی۔"

فلیٹ یوں تو صاف ستھرا نہیں تھا اور جگہ جگہ کپڑے اور دوسرا سامان بکھرا ہوا تھا مگر دیواروں پر خوبصورت پینٹنگز لگی ہوئی تھیں۔ جس سے باشندی کی خوش ذوقی کا اندازہ ہوتا تھا۔ جو کمرا سب سے زیادہ صاف ستھرا تھا اور جس میں ایک سنگھار میز بھی موجود تھی وہ باشندی نے میرے اور لبنیٰ کے لئے مخصوص کردیا۔ باقی لوگوں نے سامان اٹھاکر دوسرے کمروں کی راہ لی۔

ریڈیو' ٹرانزسسٹر' بہت سے اخبارات اور میگزین 'لکھنے کی میز کتابوں اور کاغذوں کا ڈھیر یہ اس کمرے کا اثاثہ تھا۔ بیڈ کے نیچے بھی بہت سے کاغذات گھسے ہوئے تھے۔ بعد میں پتا چلا کہ باشندی نے لبنیٰ کو دیکھ کر کمرے میں نیم عریاں تصاویر والے میگزین چھپا دیے تھے۔

ہم سب بہت تھکے ہوئے تھے۔ فلیٹ میں غسل خانہ صرف ایک ہی تھا جس میں شباب صاحب گھس گئے تھے۔ مگر چند لمحے بعد ہی واپس آگئے۔ بولے ۔ "وہاں تو نہ صابن ہے اور نہ تولیہ۔ نہاؤں کیسے؟"

باشندی نے بہت معذرت کی اور کہا کہ آج کل قاہرہ میں صابن کی قلت ہے۔ بہرحال کہیں سے وہ ایک چھوٹا سا کپڑے دھونے کا صابن کا ٹکڑا اٹھا کر لے آیا اور کہا کہ فی الحال اس پر کام چلایئے۔ منہ ہاتھ دھونے کیلئے صابن پھر تلاش کرلیں گے۔ تولیوں کے بارے میں اس کا عذر یہ تھا کہ وہ سب کے سب میلے کپڑوں کے ڈبے میں ڈال دیے ہیں ابھی دکانیں کھلیں گی تو نئے تولیے خرید لیں گے۔ گویا پھر وہی تولیے! اس سے پہلے قاہرہ ہی کے ایک ہوٹل میں ہم تولیوں کے مسئلے سے دوچار ہوچکے تھے۔ مگر اس بار لبنیٰ ہماری ہمسفر تھیں اور انہوں نے احتیاطاً" ایک چھوٹا اور ایک بڑا تولیہ شباب صاحب کی خدمت میں پیش کردیا مگر ان کا کہنا تھا کہ صابن کے بغیر غسل کرنا بے کار ہے۔ اور صابن کا جو ٹکڑا دستیاب ہے۔ اس سے تو ہم سب لوگ ہاتھ منہ بھی نہیں دھوسکتے۔ اس لئے یہی فیصلہ ہوا کہ سادہ پانی سے منہ ہاتھ دھونے پر اکتفا کیاجائے۔

ہم لوگ منہ ہاتھ دھوکر تازہ دم ہوئے باشندی نے باورچی خانے سے آکر اطلاع دی کہ قہوہ تیار ہے۔ قہوہ کا بندوبست بالکونی میں کیاگیاتھا۔ ایک چھوٹی سی میز پر قہوے کی پیالیاں اور تربوز کی قاشیں رکھی ہوئی تھیں۔

باشندی سراپا معذرت بناہواتھا کہ ناشتے کا مناسب اہتمام نہ کرسکا۔ بے چارہ کنوارہ آدمی تھا۔ وہ خود بھی ہوٹل ہی میں جاکر ناشتا کرتاتھا۔ ہمارے لئے بھی اس کے پاس یہی تجویز تھی کہ قہوہ پی کر ناشتے کیلئے ہوٹل میں چلیں گے۔ باشندی پر یہ افتاد بالکل اچانک ہی پڑی تھی ۔ اس بے چارے کے وہم گمان میں بھی نہ تھا کہ حسن صاحب کے ساتھ چار دیگر مہمان بھی آجائیں گے۔ جن میں سے ایک خاتون ہوں گی۔ ہم اس کی مجبوریاں سمجھ رہے تھے اور اسے تسلی بھی دیے جارہے تھے۔

اس نے سب سے پہلے تو تربوز اٹھا کر کھانا شروع کردیا۔ انتہائی سرخ رنگ کا تربوز تھا مگر ہمیں شباب صاحب نے طبی مشورہ دے کرپابند کردیا تھا۔

"کیا بات ہے۔ آپ لوگ تربوز نہیں کھارہے؟ کیا آپ کو پسند نہیں ہے؟"

ہم نے کہا۔"دراصل ہم لوگ خالی پیٹ میں تربوز نہیں کھاتے۔ نہ ہی بھرے ہوئے پیٹ میں تربوز کھاتے ہیں۔" یہ طبی نکتہ ہمیں پہلے ہی معلوم تھا۔

وہ حیران ہوگیا"توپھر کس وقت تربوز کھاتے ہیں؟"

ہم نے کہا۔"جب پیٹ نہ تو بالکل خالی ہو اور نہ ہی پورا بھرا ہوا ہو۔ مثلاً سہ پہر کے وقت۔"

وہ ہنسنے لگا۔"مگر کیوں کیا یہ کوئی روایت ہے؟"

ہم نے کہا۔"جی نہیں۔ ہمیں حکیم لوگوں نے یہی بتایاہے ورنہ نقصان ہوجاتا ہے۔"

"ارے چھوڑیئے حکیم لوگوں کو ۔ دیکھیے۔ ہم لوگ توصبح شام' دوپہر' رات ہروقت تربوز کھاتے ہیں۔ کچھ بھی نہیں ہوتا۔ آپ بسم اللہ توکیجئے؟"

ہم نے ڈرتے ڈرتے تربوز کی ایک قاش اٹھائی اور منہ میں ڈالی تو یوں لگا جیسے مصری کی ڈلی منہ میں گھل گئی ہو۔اس قدر خوش ذائقہ اور لطیف کہ طبیعت

خوش ہوگئی۔ لذیذ تربوز ہم نے روم میں بھی کھایا تھا مگر اس تربوز کی لذت اور مٹھاس کچھ زیادہ ہی محسوس ہوئی۔ تربوز اس قدر مزے دار تھا کہ ہم نے بلا تکلف کھانا شروع کردیا۔ دوسرے لوگوں نے پہلے تو کچھ دیر توقف کیا مگر پھر وہ بھی طعام میں شریک ہوگئے۔ باشندی نے ہمیں بتایا کہ مصر میں لوگ نہار منہ تربوز کھانے کا آغاز کرتے ہیں۔ جو لوگ بیڈ ٹی پیتے ہیں وہ اس کے ساتھ تربوز کھاتے ہیں پھر دوپہر کے کھانے کے ساتھ ' شام کی چائے کے ساتھ ' رات کے کھانے کے ساتھ۔ تربوز نوشی جاری رہتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی جب جی چاہے تربوز کھاتے ہیں گویا تربوز مصریوں کا مرغوب کھاجا ہے۔ وہ اپنے دن کا آغاز اسی پھل سے کراتی ہیں۔ ہم نے تو اپنے ملک میں اسے کبھی پھل کا مقام دیا ہی نہیں تھا مگر قاہرہ میں تھوڑے دن رہے اور تربوز کھاتے رہے تو پتا چلا کہ یہ ایک لاجوب پھل ہے۔ باشندی نے ہم لوگوں کا اشتیاق دیکھا تو فرج میں سے مزید تربوز نکال کر ذبح کردیئے اور ہمارے سامنے پیش کردیے۔ قہوہ بھی اچھا تھا لیکن ہم نے تربوز کا ذائقہ برقرار رکھنے کی غرض سے قہوہ کو ہاتھ بھی نہیں لگایا جب تربوز سے پیٹ بھر گیا تو پھر قہوہ کا دور چلا۔ اس دوران میں باتوں کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ باشندی نے ہمیں بتایا کہ اس کے ماں باپ اور بھائی بہن بھی قاہرہ میں ہی رہتے ہیں لیکن وہ علیحدہ اور اکیلا فلیٹ میں رہتا ہے۔

"بھئی شادی کیوں نہیں کرلیتے؟"

کہا۔"شادی کیلئے بھی بندوبست کررہا ہوں۔ دراصل ابھی پیسہ جمع نہیں ہوا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ اگر انسان شادی شدہ نہ ہو تو فضول خرچی کرتا ہے۔"

ہم نے کہا۔"جب تک شادی نہ ہوجائے اسی خوش فہمی میں مبتلا رہو تو بہتر ہے۔"

باشندی نے حسن صاحب کے ساتھ اپنے کام کے بارے میں بھی باتیں شروع کردیں۔ اور پھر بتایا کہ ساڑھے گیارہ بجے ایک صاحب مسٹر علی' شیرٹن ہوٹل میں ان سے ملاقات کریں گے۔ ویسے بھی ہم لوگوں کو ناشتا کرنا ہے تو کیوں نہ اب شیرٹن ہوٹل چلیں؟

تربوز تو بہت کھایا تھا مگر پیٹ پھر بھی نہیں بھرا تھا اور ناشتے کی خواہش محسوس ہورہی تھی ۔ چنانچہ یہی طے پایا۔ کہ ہم لوگ شیرٹن چلیں۔ وہیں ناشتا کریں گے اور علی سے بھی ملاقات ہوجائے گی۔

باشندی فوراً" اٹھ کھڑا ہوگیا۔ کمروں کے دروازے کھڑکیاں بدستور کھلی ہوئی تھیں۔ فلیٹ میں سامان بھی بکھرا ہوا تھا مگر اس اللہ کے بندے نے کھڑی دروازے بند کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔ سب کچھ یوں ہی کھلا چھوڑ دیا۔ بس باہر کے دروازے کو تالا لگا دیا اور چل کھڑا ہوا۔

ہم نے پوچھا۔"کھڑکیاں وغیرہ بند نہیں کرو گے؟"

بے نیازی سے کہا۔" اس کی کیا ضرورت ہے؟" معلوم ہوا کہ ان کا یہی دستور ہے کہ بس باہر کا مین دروازہ لاک کرکے رخصت ہوجاتے ہیں۔

شباب صاحب نے کہا۔"احتیاط کرنی چاہیے۔ کوئی چور آگیا تو کیا ہوگا؟"

باشندی ہنسنے لگا۔"چور یہاں سے کیا لے جائے گا؟ کاغذ' رسالے' اخبار میلے کپڑے اور ایسی ہی فضول سی چیزیں پڑی رہتی ہیں گھر میں۔"

ہمیں تو قاہرہ کے چوروں کی سیر چشمی پر بہت حیرت ہوئی ورنہ ہمارے ہاں تو چور روٹی تک چرا کرلے جاتے ہیں۔

گھر سے باہر نکلے تو ذرا چہل پہل نظر آئی۔ دن نکل آیا تھا اور لوگ گھروں سے باہر نکلنے لگے تھے۔ باہر کی سڑک پر پہنچے تو چھوٹی دکانیں بھی کھلنے لگی تھیں۔ خاص طور پر پرچون کی دکانیں کھول کر عباپوش دکاندار بیٹھ گئے تھے۔ قباپوش عورتیں اور لمبی عبائیں پہنے ہوئے لڑکے بالے خریداری کرنے میں مصروف تھے۔ چند اسی قسم کی سڑکوں سے پیدل گزر کر ہم ایک بہت بڑی شاہراہ پر آگئے۔ یہ ایک ہائی وے قسم کی سڑک تھی اور غالباً" حال ہی میں تعمیر ہوئی تھی ۔ کافی کشادہ سڑک تھی جس کے درمیان ایک فٹ اونچی دیوار سی بنی ہوئی تھی۔ یہ دو رویہ سڑک تھی ۔ دونوں طرف کافی چوڑے فٹ پاتھ بنے ہوئے تھے۔ ہم نے ایک فٹ پاتھ پر سفر کرنا شروع کردیا۔ باشدی اور حسن صاحب بہت انہماک سے باتیں کررہے تھے۔ اور کافی تیز تیز چل رہے تھے جبکہ ہم چاروں دو جوڑوں کی صورت میں مصروف خرام تھے۔ لیلیٰ ہمارے ساتھ قدم ملاکر چل رہی تھی اور ہمارے پیچھے شباب صاحب اور رشید جاوید صاحب سرگرم سفر تھے۔ تیز تو ہم بھی نہیں چل رہے تھے مگر شباب صاحب کی رفتار بے حد ست تھی۔ جاوید صاحب کو مجبوراً" ان کے ساتھ آہستہ چلنا پڑ رہا تھا۔ اس شاہراہ پر

موٹر کاروں، اور ٹیکسیوں کی آمدورفت جاری تھی۔ فٹ پاتھ پر چلنے والے برائے نام ہی تھے۔

کافی دور چلنے کے بعد ہمیں پیچھے سے جاوید صاحب نے پکارا۔ اب وہ ہم سے کافی دور رہ گئے تھے۔ کہنے لگے۔ "بھائی ہم کب تک پیدل چلتے رہیں گے؟"

شباب صاحب بولے۔" ہم آخر کہاں جارہے ہیں۔ باشندی تو پلٹ کر ہماری خبر نہیں لے رہا۔"

اب جو ہم نے دیکھا تو باشندی اور حسن صاحب بدستور باتوں میں مصروف تھے اور بہت دور نکل گئے تھے۔ جس سڑک پر ہم چل رہے تھے یہ شیطان کی آنت کی طرح لمبی تھی ۔ کافی فاصلے پر کچھ اونچی اونچی عمارتیں نظر آرہی تھیں۔ اس کے سوا کوئی آبادی نہ تھی۔

ہم نے حسن صاحب کو پکارا۔ پہلے تو انہوں نے ہماری آواز ہی نہیں سنی۔ جب سن لی تو رک گئے۔ ہم لوگ ان کے پاس پہنچ گئے۔ ہم نے پوچھا۔ "بھئی آخر ہم لوگ کہاں جارہے ہیں اور ٹیکسی کیوں نہیں لیتے؟"

حسن صاحب نے باشندی سے یہی سوال دریافت کیا۔ وہ بولا۔ " وہ دیکھیے سامنے شیرٹن ہوٹل نظر آرہاہے۔"

دیکھا تو کافی فاصلے پر بہت سی عمارتیں نظر آرہی تھیں۔ ان ہی میں ایک شیرٹن ہوٹل بھی تھا۔ یہ غزہ کا علاقہ تھا جو شہر کا تجارتی مرکز ہے۔

باشندی نے کہا۔"ارے وہ سامنے تو ہوٹل ہے۔ ٹیکسی کی ضرورت نہیں ہے۔ بس ابھی پہنچ جائیں گے۔" یہ کہہ کر اس نے حسن صاحب کے ہاتھ مارا اور وہ دونوں پھر باتیں کرتے ہوئے چل پڑے۔

شباب صاحب نے بے بسی سے ہم لوگوں کو دیکھا۔ "یار اتنی دور پیدل چلنے کی کیا ضرورت ہے؟"

ہم نے کہا۔" شباب صاحب وہ سامنے ہوٹل نظر آرہاہے اور پھر یہاں اس وقت ٹیکسی بھی نظر نہیں آتی۔ ہمیں دو ٹیکسیوں کی ضرورت پڑے گی۔"

مجبوراً" وہ بھی پیدل چل پڑے۔ اب پھر وہی منظر تھا بہت دور آگے آگے حسن صاحب اور باشندی جارہے تھے۔ درمیان میں ہم اور لبنیٰ تھے اور بہت دور شباب صاحب اور جاوید صاحب خراماں خراماں چلے آرہے تھے۔ جاوید صاحب کو تیز چلنے میں کوئی تکلف نہ تھا مگر شباب صاحب بے چارے پیدل چلنے کے عادی ہی نہ تھے۔ اس لئے ان کا ساتھ دینا پڑ رہا تھا۔

کچھ دیر یہی سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ ہمیں ایک بار پھر جاوید صاحب کی آواز سنائی دی۔ پلٹ کر دیکھا تو وہ بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ ہم پھر ان کے انتظار میں رک گئے۔

"یار۔یہ کیا مصیبت ہے۔ باشندی نے ہمیں کس مصیبت میں پھنسادیا ہے۔ آخر کب تک ہم پیدل چلیں گے؟"

تھک تو ہم بھی گئے ہیں مگر پلٹ کر دیکھا تو کچھ فاصلے پر شیرٹن ہوٹل نظر آرہاتھا۔ ہم نے کہا۔"بس اب تھوڑی دور ہی تو رہ گیا ہے۔ وہ دیکھو سامنے نظر آرہاہے۔"

شباب صاحب کہنے لگے۔" ہم اتنی دور چل کر آگئے مگر یہ فاصلہ کم نہیں ہوا۔ یہ تو پہلے بھی اتنا ہی دور تھا۔ کہیں باشندی نے نظربندی تو نہیں کردی؟"

لبنیٰ نے ہم سے کہا۔ "میرے خیال میں ہم لوگ الگ الگ چلنے کے بجائے ایک ساتھ باتیں کرتے ہوئے چلیں تو راستہ جلدی کٹ جائے گا۔"

یہ تجویز سب کو پسند آئی۔ اب ہم نے بھی شباب صاحب کے ساتھ رینگنا شروع کردیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ باشندی اور حسن صاحب ہمیں دو نکتوں کی طرح نظر آنے لگے۔ ہوٹل شیرٹن کی عمارت بھی بدستور بالکل سامنے نظر آرہی تھی مگر وہاں پہنچنے میں ناکام رہے تھے۔ تھکن ہم سب پر سوار تھی۔ مگر شباب صاحب کی حالت قابل دید تھی۔ دھوپ کی تیزی کے ساتھ ساتھ گرمی میں بھی اضافہ ہوگیاتھا۔ اس شاہراہ پر درخت اور سایہ نام کی کوئی چیز موجود نہ تھی پھر بھی ہم لوگ چلے جارہے تھے۔ اب باشندی اور حسن صاحب ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوچکے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ہم سے بہت زیادہ آگے پہنچ گئے ہیں۔

"میرا تو خیال ہے وہ شیرٹن پہنچ کر ناشتہ کررہے ہیں۔" جاوید صاحب نے کہا۔

"بھئی مجھ سے تو اب چلا نہیں جاتا۔" یہ کہہ کر شباب صاحب فٹ پاتھ پر

ٹانگیں لٹکا بیٹھ گئے۔

اگر ٹیکسی نہیں لوگے تو میں یہاں سے نہیں اٹھوں گا۔"

ان کا یہ الٹی میٹم سن کر ہم بھی فکر مند ہوگئے۔ چاروں طرف دیکھا مگر کوئی ٹیکسی نظر نہیں آئی۔ پرائیویٹ کاریں البتہ گزر رہی تھیں۔

"یار بڑے بداخلاق لوگ ہیں۔" شباب صاحب نے شکوہ کیا۔ "دیکھتے جارہے ہیں کہ ہم تھک کر بیٹھ گئے ہیں مگر کوئی لفٹ نہیں دے رہا۔"

ان کی بات بھی غلط نہ تھی۔ سامنے سے گزرنے والی کاروں میں گزرنے والے شباب کو فٹ پاتھ پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھا دیکھ کر مسکراتے ہوئے جارہے تھے۔

اچانک جاوید صاحب نے نعرہ مارا۔" وہ رہی ۔ وہ رہی !" ان کا اشتیاق اور جوش دیکھ کر ہم سمجھے کہ شاید کوئی خوش شکل خاتون نظر آگئی ہے مگر وہ ایک خالی ٹیکسی کی جانب اشارہ کررہے تھے جو مخالف سمت میں جانے والی سڑک پر رواں دواں تھی۔

ہم سب نے ٹیکسی کو روکنے کیلئے ہاتھ ہلانے شروع کردیئے۔ ٹیکسی والے نے عربی زبان میں کچھ کہا اور رکے بغیر چلا گیا۔ جب کئی بار یہی تجربہ ہوا تو شباب صاحب ناراض ہوگئے۔"بھئی بہت بدتمیز ہیں یہاں کے لوگ ۔ ٹیکسی والے بھی نہیں رکتے ۔ یہ تو بہت فضول شہر ہے۔"

ہم نے کہا۔"اتنی جلدی رائے قائم نہ کیجئے۔ ابھی تو ہم نے اس سڑک کے سوا شہر دیکھا ہی نہیں ہے۔"

اتنی دیر میں ایک اور ٹیکسی مخالف سمت میں جاتی ہوئی نظر آتی تو ہم سب نے کورس میں "ٹیکسی ٹیکسی" پکارنا شروع کردیا۔ جواب میں ٹیکسی والا کچھ اشارے کرتا ہوا چلا گیا۔ یہ ہمیں بعد میں احساس ہوا کہ یک طرف سڑک پر ٹیکسی والا ہماری خدمت کرنے سے قاصر تھا اور ہم جس سمت میں جارہے تھے بدقسمتی سے اس سڑک پر ہمیں ایک بھی خالی ٹیکسی نظر نہیں آئی تھی۔

شباب صاحب بدستور فٹ پاتھ پر ٹانگین لٹکائے تشریف فرما تھے۔

جاوید صاحب نے کہا۔"بھئی کیوں تماشا بنا رہے ہو۔ اٹھو ۔ تھوڑی سی ہمت اور کرلو۔ وہ دیکھو ' سامنے شیرٹن ہوٹل ہے۔"

"یہ ہوٹل وہوٹل کچھ نہیں ہے۔ ہماری نظروں کا سراب ہے۔ باشندی ہمیں بے وقوف بنا کر چلا گیا ہے۔جب سے ہم چل رہے ہیں۔ یہ ہوٹل ہمیں اسی جگہ نظر آرہا ہے۔ آخر ہم اس ہوٹل تک پہنچتے کیوں نہیں؟ مجھے تو یہ الف لیلیٰ کا کوئی قصہ معلوم ہوتا ہے۔"

خدا خدا کرکے ایک ٹیکسی ہماری سمت میں جاتی ہوئی بھی نظر آگئی اور ہم سب نے ہاتھ ہلاہلا کر "ٹیکسی ٹیکسی"پکارنا شروع کردیا۔ ٹیکسی والا گھبرا کر فوراً رک گیا۔

ہم نے پوچھا۔"یوا سپیک انگلش؟"

اس نے جواب میں نہایت عالمانہ عربی میں تقریر کردی۔

"اب کیا کریں؟" ہم نے کہا۔

شباب صاحب بولے۔" تم ہٹ جاؤ۔ میں اس سے بات کرتا ہوں۔"

تب ہمیں یاد آیا کہ ہمارے ساتھ توایک حافظ قرآن اور عربی دان بھی موجود تھا۔ لہٰذا شباب صاحب کو ترجمانی کے فرائض سونپ دیے گئے۔ اب ان دونوں کے درمیان گفتگو شروع ہوگئی مگر ہم نے اندازہ لگایا کہ شباب صاحب کی عربی اور تلفظ ٹیکسی والے کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ جبکہ اس کی زبان شباب صاحب کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

آخر تنگ آکر جاوید صاحب نے مداخلت کی اور اردو میں بولے۔ "شیرٹن ہوٹل چلو گے؟"

اس نے فوراً سرہلادیا۔"شیرٹن ہوتیل؟ یس یس ۔"

"دیکھا آپ نے اس طرح بات کرتے ہیں۔" یہ کہہ کر جاوید صاحب فخریہ انداز میں ٹیکسی کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئے۔ شباب صاحب کو بھی فٹ پاتھ پر سے اٹھایا گیا۔ وہ بھی سوار ہوگئے۔ اس کے بعد لبنیٰ کی اور ہماری باری تھی مگر ٹیکسی والے نے شور مچادیا۔ خدا جانے کیا کیا کہنا شروع کردیا اور سب تو حیران رہ گئے تھے مگر ہمیں یاد آگیا کہ ٹیکسی والا چار مسافروں کو بٹھانے سے انکاری ہے۔ یہ مسئلہ ہم نے آسان اردو میں اپنے ساتھیوں کو سمجھایا۔

"تو پھر اب کیا کریں؟" شباب صاحب پریشان ہوگئے۔ جاوید صاحب نے کہا۔

"یار اس کی منت کرلو۔ سامنے ہی تو شیرٹن ہوٹل ہے۔ اسے میٹر سے زیادہ کرایہ دے دیں گے۔"

ہم نے بتایا یہ ناممکن ہے۔ ایسا ہے کہ آپ لوگ ٹیکسی میں چلیں۔ ہم پیدل آجائیں گے۔

پہلے تو وہ رضا مند نہیں تھے مگر پھر مان گئے۔ اس طرح وہ تینوں ٹیکسی میں رخصت ہوگئے اور ہم نے پیدل مارچ شروع کردی۔ اس وقت ہمیں اندازہ ہوا کہ تنہا سفر کرنا زیادہ آسان تھا۔ کیونکہ بہت جلد ہم ایک بڑے سے چوراہے پر پہنچ گئے اور اس چوراہے بلکہ سات راہے کے دوسری جانب بیچ بیچ شیرٹن ہوٹل موجود تھا۔ اس چوک کو عبور کرکے ہم شیرٹن ہوٹل کے سامنے پہنچ گئے۔ یہ بہت بارونق علاقہ تھا۔ ہر طرف فلک بوس عمارتیں' فٹ پاتھوں پر راہ گیروں کا ہجوم' سڑکوں پر کاروں کی ریل پیل ۔ گویا ہم قاہرہ کے قلب میں پہنچ گئے تھے۔ شیرٹن ہوٹل کے سامنے فٹ پاتھ پر ہمارے سارے ساتھی ہمارے منتظر کھڑے تھے۔

"بھئی کمال ہے۔ آپ کہاں رہ گئے تھے؟" حسن صاحب نے معصومیت سے پوچھا۔

ہمیں غصہ تو بہت آیا مگر ضبط کرگئے۔

جاوید صاحب نے کہا۔"چلو بھئی چلو۔ ناشتا کریں۔ بہت زور کی بھوک لگ رہی ہے۔" اور اس طرح بات رفع دفع ہوگئی۔

شیرٹن میں خوب رونق تھی۔ سیاحوں کی کثرت تھی جن میں زیادہ تر یورپین تھے۔ یورپ کے کسی شہر کا ماحول نظر آرہا تھا۔ ایک طرف کرنسی تبدیل کرنے کا کاؤنٹر تھا جس پر ایک عربی حور بیٹھی مسکرا رہی تھی۔

"چلو بھئی۔ پہلے کرنسی تو تبدیل کروالیں۔" حسن صاحب نے کہا۔

ہم نے ائرپورٹ پر ایک لمبی قطار میں کھڑے ہوکر بڑی مصیبت سے کرنسی تبدیل کرائی تھی مگر یہاں معاملہ ہی دوسرا تھا۔ خاتون نے نہایت ملائمت سے مسکرا کر ہمارا خیر مقدم کیا اور بڑی نزاکت سے ڈالر وصول کرنے کے بعد مصری پونڈ ادا کردیے۔ اتنا اچھا ماحول دیکھ کر جی میں تو یہی آرہا تھا کہ ساری کرنسی یہیں سے تبدیل

کرالیں مگر ناشتے کے بغیر بھوک سے برا حال تھا۔ اس لئے ہال کا رخ کیا۔

"ناشتے میں کیا کھائیں گے؟" حسن صاحب نے پوچھا۔

"نہاری اور نان۔" شباب صاحب بولے۔

"میں پراٹھے اور آملیٹ کھاؤں گا۔" جاوید صاحب نے فرمائش کی۔

حسن صاحب ہنسنے لگے۔"کیسی باتیں کرتے ہیں یہ قاہرہ کا شیرٹن ہے۔ یہاں یہ چیزیں نہیں ملیں گی۔"

"تو پھر پوچھنے کا کیا فائدہ ہے۔ ٹوسٹ اور فرائیڈ انڈے منگالیجئے۔"

چائے کی بجائے ہم نے کافی کو ترجیح دی کیونکہ وہاں اچھی چائے ملنے کی توقع نہ تھی۔

ہوٹل میں اسمارٹ اور خوش لباس ویٹریس لڑکیاں سروس پر مامور تھیں۔ ظاہر ہے کہ ناشتا بھی ہمیں بہت اچھا لگا۔ ابھی ہم ناشتے سے فارغ نہیں ہوئے تھے کہ پی آئی اے کے عملے کے لوگ بھی نظر آگئے۔ یہ رات کی فلائٹ میں ہمارے ساتھ تھے۔ ہمیں دیکھ کر وہ ہماری میز پر آگئے۔

"بھئی آپ لوگوں کے بہت مزے ہیں۔" جاوید صاحب نے کہا۔"مزے سے ملک ملک کی سیر کرتے ہیں۔ شاندار ہوٹلوں میں قیام کرتے ہیں۔ ہوا میں اڑے اڑے پھرتے ہیں۔"

"مزہ تو مرضی سے سیر کرنے اور گھومنے پھرنے ہی میں آتا ہے۔ سر اگر مسلسل ہوائی سفر کرنا پڑے اور ہوٹلوں میں قیام کرنا پڑے تو یہ تفریح نہیں عذاب بن جاتا ہے۔"

پی آئی اے کے ساتھ ہمارا اکثر سابقہ پڑتا رہا ہے اور پی آئی اے والوں کے ساتھ بھی ۔ مجموعی طور پر ہمیں پی آئی اے والوں نے آرام ہی پہنچایا ہے۔ شکایت کا زیادہ موقع نہیں دیا۔ پی آئی اے اور اس کے عملے کی قدر اس وقت معلوم ہوتی ہے جب دوسری فضائی کمپنیوں میں سفر کرتے ہیں۔ ان کے بدمزہ پھیکے پھیکے کھانے کھاتے ہیں۔ ائرہوسٹسوں کی مصنوعی مسکراہٹیں دیکھتے ہیں۔ ہر چیز مصنوعی اور اجنبی سی لگتی ہے۔

پی آئی اے والوں نے ہمیں اپنے پاس سے نکال کر کچھ تحفے پیش کئے۔ لمبی

کیلئے میک اپ کا بیگ ہم لوگوں کی کیلئے خوشبویات اور شباب صاحب کیلئے لائٹر۔"

ہم نے کہا۔"یہ تحائف تو ہوائی سفر کے دوران میں دینے چاہئے تھے۔"

ائر ہوسٹس مسکرائی اور بولی۔" سر۔ بس چپ ہی کریں۔ آپ کی قسمت میں تھے تو قاہرہ کی شیرٹن ہوٹل میں بھی مل گئے۔"

وہ لوگ دریائے نیل کے بحری سفر پر روانہ ہورہے تھے۔ رات کو واپسی تھی اور اگلے دن صبح انہیں کراچی کے لئے واپس لوٹ جاناتھا۔ انہوں نے ہم لوگوں کو بھی اس پرلطف اور معلوماتی سفر پر ساتھ چلنے کا مشورہ دیا مگر ہمیں دوسری مصروفیات تھیں۔ سب سے پہلے تو قیام کامسئلہ حل کرنا تھا۔ ہوٹل میں ہمیں کہیں جگہ نہیں مل سکی تھی۔

باشندی نے ہمیں بڑے خلوص کے ساتھ اپنے فلیٹ میں ٹھہرایا تھا مگر اس بندوبست سے نہ تو ہم خوش اور نہ ہی وہ مطمئن تھا۔ وہ ایک بے پرواہ اور کنوارہ آدمی تھا۔ آزاد منش بھی تھا۔ تنہا رہنے کاعادی تھا ۔ اتنے بہت سے مہمان بلائے ناگہانی کی مانند اچانک اس پر نازل ہوگئے تو وہ بے چارہ گھبرا گیا۔ مہمان نوازی پرا سے کوئی اعتراض نہ تھا مگر شرمندگی یہ تھی کہ مہمان داری کا حق ادا کرنے کے قابل نہ تھا۔

حسن صاحب نے کہا۔"بھئی کسی جگہ تو آخر کمرا مل ہی سکتاہے۔"

وہ ہنسنے لگا۔ بولا۔" اب تو اسپتال ہی میں کمرا ملنے کا امکان ہے اور میں آپ کو کسی اسپتال میں کمرا دلا بھی دیتا مگر ایک دو مریض تو اسپتال میں داخل کیئے جاسکتے ہیں۔ اتنے بہت سے مریضوں کیلئے گنجائش پیدا کرنا ممکن نہیں ہے۔"

خیال برا نہیں تھا لیکن مہمانوں کی کثرت نے اس منصوبے کو بھی ناقابل عمل بنادیا تھا۔

باشندی کو جس شخص کا انتظار تھا اس کا نام علی تھا۔ آگے پیچھے بھی کچھ تھا جو ہمیں یاد نہیں رہا۔ علی محکمہ سیاحت میں ملازم تھا اور باشندی نے اس کے ذمے یہ فرض لگایاتھا کہ ہم لوگوں کیلئے محکمہ سیاحت کے ہوٹلوں یا ہوسٹلوں میں رہائش کا بندوبست کرے۔ ہم نے اس سے پہلے اور اس کے بعد بھی دنیا کے بہت سے شہروں کی خاک چھانی مگر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ قیام کیلئے کوئی کمرا تک نصیب نہ ہوا ہو۔ اس کی

ایک وجہ شاید ہم لوگوں کی تعداد بھی تھی۔ اگر ایک دومسافر ہوں تو مسافر نواز بتیرے مگر یہاں تو بیک وقت پانچ مہمانوں کو سرچھپانے کی جگہ درکار تھی اور وہ بھی ایک ہی چھت کے نیچے ۔ شیرٹن ، ہلٹن قسم کے فائیوسٹارہوٹلوں میں قیام کرنا ہماری جیب کے لئے ناقابل برداشت تھا۔

جاوید صاحب نے یہ تجویز پیش کی کہ اگر اگلی بار قاہرہ آئیں تو اپنے ساتھ خیمہ بھی لے کر آئیں۔

باشندی نے کہا۔"خیمے کی بھی کیا ضرورت ہے اگر آپ لوگ ہپی بن کر آئیں تو پھرایک چھوٹے سے بیگ کے سوا کسی اور چیز کی حاجت نہ ہوگی۔"

شباب صاحب نے پائپ سلگایا تھا اور ہم سب کی باتیں بہت غور سے سن رہے تھے۔

آخر بول پڑے۔" میں اسی لئے کہیں جانے کیخلاف ہوں ۔ انسان کو اپنے گھر ہی میں رہنا چاہیے۔ بلاوجہ کی مصیبت مول لینے کی کیا ضرورت ہے۔"

ہم نے کہا۔"شباب صاحب۔ اگر دنیا کے تمام لوگ اسی طرح سوچنے لگیں تو پھر کسی کو دوسرے کا احوال ہی معلوم نہ ہو۔ یہ تاریخ، جغرافیہ، ثقافت، تمدن، قدیم عہد کے بارے میں معلومات ، مختلف علوم سے آشنائی کچھ بھی نہ ہو۔"

کہنے لگے۔"تم میری بات نہیں سمجھوگے۔ بڑے ہوکر خود ہی سمجھ میں آجائے گی۔"

عین اسی وقت علی نے ہال میں قدم رکھا اور باشندی کو دیکھ کر ہماری میز پر آگیا۔"اہلاوسہلا۔" اس نے ہمیں خوش آمدید کہا۔

باشندی نے ہم سب کا تعارف کرایا۔ علی خواب اچھی انگریزی جانتاتھا۔ کشیدہ قامت سیاہ بال، کھلتے ہوئے رنگ کا آدمی تھا۔ ہروقت ہنستا رہتاتھا۔ یا شاید اس کا چہرہ ہی ایسا تھا۔

حسن صاحب نے کاروباری بات کرنے سے پہلے یہ سوال کرنا ضروری سمجھا کہ ہم لوگوں کے قیام کاکیا بندوبست ہوا؟؟"

" دودن تک کوئی امکان نہیں ہے۔ اس کے بعد میں سارا کے گیسٹ ہاؤس میں دو دن کیلئے آپ لوگوں کو بہت مناسب جگہ دلادوں گا۔"

شباب صاحب پریشان ہوگئے۔ "نوٹ کرلو آفاقی۔ یہ سفر بہت مہنگا پڑے گا۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ مشکل؟"

"ظاہر ہے یار تم لوگ بھی بس تمی بن گئے ہو۔ منہ اٹھایا اور قاہرہ چلے گئے۔ بھائی میرے ' یہ قاہرہ ہے کوئی مذاق تو ہے نہیں۔" وہ سخت بیزار نظر آرہے تھے۔ "اور پتا نہیں لندن جاکر ہمارا کیا حال ہوگا۔"

ہم نے کہا "لندن کی ہم گارنٹی دیتے ہیں ۔ وہاں آپ کو بیک وقت دس کمرے بھی دلا دیں گے۔"

وہ طنزیہ انداز میں مسکرائے۔ "وہ لندن ہے۔ کوئی مذاق نہیں ہے۔"

ان سے فی الوقت بحث کرنا لاحاصل تھا۔ انہیں واقعی کافی پریشانی اور تکلیف اٹھانی پڑی تھی۔ وہ بے چارے تو سفر کرنے کے قائل ہی نہیں تھے۔ ان کے پہلے ہی سفر نے انہیں تھکا دیا تھا۔

باشندی نے فوراً ہم لوگوں کو تسلی دی۔ " دیکھیے۔ میرے فلیٹ پر آپ کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ میں ہر چیز کا بندوبست کردوں گا۔ دو دن کی تو بات ہے اس کے بعد علی آپ لوگوں کو بہت اچھے گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرا دے گا۔ میرا خیال ہے کہ اب اس بحث میں مزید وقت ضائع نہ کیا جائے۔ آپ لوگ قاہرہ آئے ہیں تو کم ازکم قاہرہ دیکھنا تو شروع کریں۔"

نہایت معقول مشورہ تھا۔ طے یہ پایا کہ ہوٹل سے باہر نکل کر سب سے پہلے تو غزہ کا علاقہ دیکھا جائے۔ اس کے بعد نزدیک ہی قاہرہ کا چڑیا گھر ہے وہ بھی دیکھ لیتے ہیں۔

چڑیا گھر کا نام سن کر شباب صاحب پھر خاموش ہوگئے۔ "بھئی کیا ہوگیا ہے آپ لوگوں کو۔ ہم کوئی بچے ہیں جو چڑیا گھر دیکھیں گے؟"

11

باشندی نے فوراً قاہرہ کے چڑیا گھر کی نمایاں خصوصیات بیان کرنی شروع کردیں اور بتایا کہ یہاں ایسے جانور اور پرندے بھی ہیں جو دنیا کے کسی اور چڑیا گھر میں آپ کو دیکھنے کو نہیں ملیں گے۔

"ہم دیکھیں گے ہی نہیں تو ملنے نہ ملنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔" شباب صاحب نے دلیل دی مگر علی اور باشندی نے اتنا اصرار کیا کہ آخر چڑیا گھر جانے کا منصوبہ طے پایا۔ چڑیا گھروں سے ہمیں بھی کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ مگر میزبانوں کا دل رکھنا بھی ضروری تھا۔"

ہم سب ہوٹل سے باہر نکلے تو قاہرہ اپنے پورے جاہ وجلال کے ساتھ ہمارے سامنے موجود تھا۔ کشادہ سڑکیں' شاندار عمارتیں ' خوبصورت دکانیں' فٹ پاتھوں پر لوگوں کا ہجوم 'سڑکوں پر کاروں کا اژدھام ہے۔ شکر ہے کہ فٹ پاتھ پر پہنچ کر شباب صاحب کا موڈ قدرے بہتر ہوگیا کیونکہ اتنی بہت سی یورپین خواتین انہوں نے اس سے پہلے کبھی یکجا نہیں دیکھی تھیں۔ پھر ان کے فیشن اور ملبوسات' بے باکی اور طراری' مصر کی خواتین خاصی مغرب زدہ ہیں۔ یوں تو روایتی کپڑوں میں ملبوس عورتیں بھی گھومتی پھرتی نظر آتی ہیں مگر جو مغرب سے متاثر ہیں ان میں اور میموں میں رنگت کے

سوا کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ دراصل دوسری عالمگیر جنگ کے زمانے میں جب اتحادی فوجیوں نے دل بہلانے کی خاطر عرب شہروں کا رخ کیا تھا تو اس وقت سے ان کے رنگ ڈھنگ بدلنے لگے تھے ۔ جنگ ختم ہوگئی تو شروع شروع میں کافی دقت پیش آئی مگر پھر سیاحوں نے چھٹی پہ آنے والے فوجیوں کی جگہ لے لی حکومت کی جانب سے کوئی پابندی نہ ہو بلکہ سیاحت کے نام پر اس صنعت سے زیادہ پیسے کمانے پر توجہ دی جائے توپھر سیاحوں کی وابستگی اور دلچسپی کا سامان فراہم کرنے کے لئے آزادی کیوں نہ ہوگی؟ نتیجہ یہ ہوا کہ دیکھتے ہی دیکھتے قاہرہ نہ صرف فوجی سیاحوں کی جنت بن گیا بلکہ آس پاس کے شیوخ کی تفریح گاہ اور عیش وعشرت کا مرکز بھی کہلایا۔ نائٹ کلب' قمار خانے' شراب خانے' شاپنگ سنٹر' قحبہ خانے' یہ تمام چیزیں سیاحوں کے لوازمات میں شامل ہوتے ہیں ۔ اس طرح مغربی شہروں کے تمام اوصاف اس شہر میں پیدا ہوگئے۔ اس کے باوجود قاہرہ نے اپنی قدیم تہذیب سے رشتہ نہیں توڑا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ شہر عجیب قدیم وجدید کا امتزاج ہے۔ اگر سڑکوں پر میموں کے دوش بدوش مغربی لباس میں ملبوس مقامی فیشن ایبل خواتین نظر آتی ہیں تو قدیم لباسوں میں لپٹی ہوئی' لمبے لمبے لبادے زیب تن کیے ہوئے اور چہروں کو عجیب قسم کے نقابوں سے ڈھانپے ہوئے پرانے خیال کی عورتیں بھی نظر آتی ہیں ۔ ایک طرف کشادہ اور روشن سڑکیں یورپ کے ماحول کی یادیں تازہ کرتی ہیں تو دوسری طرف شہر کے قدیم حصے آج بھی صدیوں پرانی تاریخ اور ماحول کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ ان میں ایک تو متوسط طبقہ ہے۔ یہ تعلیم یافتہ لوگ ہیں اور درمیانہ درجے کے علاقوں میں رہتے ہیں یا پھر ہمارے لاہور کے ''اندرون شہر'' کی طرح علاقے بھی ہیں جن میں پہنچ کر زمانے کے گزرنے کا احساس نہیں ہوتا ۔ وہی لوگ' وہی مشغولیات' وہی کام اور وہی انداز جو کہ صدیوں پہلے رائج تھے' آج بھی دیکھ لیجئے' یوں لگتا ہے جیسے ہالی ووڈ کے کسی فلم ساز نے فلم کی شوٹنگ کے لئے زر کثیر صرف کرکے قدیم قاہرہ کا سیٹ لگا دیا ہے۔ تنگ اور پراسرار گلیاں بہت سی کہی اور ان کہی داستانیں بیان کرتی ہیں ۔ میں نے پہلے بتایا کہ گدھا گاڑی اور گدھا آج بھی قاہرہ میں ٹرانسپورٹ کا ایک ذریعہ ہے۔ شہر کے اندرونی حصوں کی پر پیچ اور لمبی لمبی گلیوں میں گدھے کے سوا کوئی دوسری سواری آپ کو نہیں مل سکتی۔ اس لئے بہت سے لوگ گدھوں پر زین لگائے سیاحوں کو گدھا سواری کی دعوت دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ہم نے تو خیر ایک بار تجربے کے طور پر ڈرتے ڈرتے گدھے پر بیٹھنے کا تجربہ حاصل کرلیا۔ لبنیٰ اپنے شوق کی بدولت گدھے پر سوار ہوگئیں لیکن شباب نے گدھے پر سوار ہونے سے صاف انکار کردیا۔

''تم نے سنا نہیں۔ گدھے کسی وقت بھی دولتی مار دیتا ہے۔''

ہم نے کہا۔ ''مگر اس گدھے کی صورت دیکھو' کس قدر شریف اور معصوم نظر آرہا ہے۔''

کہنے لگے۔ ''یہ مت بھولو کہ وہ آخر کار ایک گدھا ہے۔ ایک گدھے سے آپ ہر قسم کے اقدامات کی توقع کرسکتے ہیں۔ آخر گدھا جو ہوا۔''

گلیوں میں مجھے مصری خواتین بھی گدھوں پر سوار انہیں دوڑاتی ہوئی نظر آجاتی تھیں۔ بڑی عمر کے مرد بھی گدھے کی امداد حاصل کرتے ہیں۔ یہ منظر ہم نے عام دیکھا کہ ایک موٹے تازے عمامہ پوش بزرگ تسبیح ہاتھ میں لیے گدھا پر بیٹھے ہیں اور بجائے تسبیح پڑھنے کے ''ہٹو بچو'' کا شور مچا رہے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ان گدھوں میں کوئی ہارن وغیرہ تو ہوتا نہیں ہے البتہ یہ اپنی ''ڈھینچوں ڈھینچوں'' کی آواز سے لوگوں کو خبردار کرسکتے ہیں مگر قاہرہ شہر کے گدھوں کو ہم نے بہت خاموش طبع پایا۔ ایسا اتفاق ایک یا دو بار ہی ہوا کہ گدھے نے اپنی صدا بلند کی ہو۔ ورنہ عام طور پر گدھا سوار ہی یہ فریضہ سرانجام دیتے ہوئے نظر آتے۔

دکانوں میں گھومتے ہوئے یورپ کے شہروں کی یاد تازہ ہوجاتی ہے لیکن مول تول کی پھر بھی گنجائش ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ یورپ کی طرح یہاں کے بڑے اسٹوروں پر اشیا پر قیمتیں درج کرنے کا رواج تو موجود ہے لیکن یورپ والوں کی طرح یہاں ''ایک دام'' نہیں ہوتے۔ اب یہ آپ کی ہمت اور قابلیت پر منحصر ہے کہ قیمت میں کتنی کمی کرا سکتے ہیں۔

ہم تو یہی سمجھتے تھے کہ ان دکانوں پر درج شدہ قیمتوں میں کمی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے جو کچھ بھی خریدا خاموشی سے لکھی ہوئی قیمت ادا کردی مگر لبنیٰ نے ہم سے کہا کہ یہ یورپ نہیں مصر ہے۔ یہاں بھاؤ تاؤ کرنے کی گنجائش ضرور نکل سکتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے جب ایک جوتے کی قیمت کم کرنے کے بارے میں گفتگو کا آغاز کیا تو ہم مارے شرمندگی کے دوسری طرف چلے گئے کہ یہ خاتون اب ہمیں بھی

شرمندہ کرائیں گی مگر کچھ دیر بعد دیکھا کہ وہ شاداں و فرحان چلی آرہی ہیں۔ وہ جوتے کی قیمت معقول حد تک کم کرانے میں کامیاب ہوگئی تھیں۔ اور بتارہی تھیں کہ سیلز گرل نے ان سے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہاتھا کہ صرف آپ کی خاطر یہ کمی کی جارہی ہے۔

"مگر میری خاطر کیوں؟" انہوں نے پوچھا۔

"اس لئے کہ آپ ہماری مہمان ہیں۔" مطلب یہ کہ انہوں نے ایک معقول عذر تلاش کرلیاتھا۔

آپ سوچتے ہوں گے چڑیاگھر کا قصہ درمیان میں ہی رہ گیا؟

بات یہ ہے کہ ہم سڑکوں' بازاروں اور دکانوں سے ہوکر چڑیا گھر پہنچے تھے۔ باشندی اور علی نے تو یہی بتایاتھا کہ چڑیا گھر "بالکل برابر" میں ہے مگر یہ بھی مصریوں کا انداز ہے کہ کبھی درست پتا نہیں بتاتے اور فاصلہ تو ہرگز نہیں بتاتے۔ آپ پڑھ ہی چکے ہیں کہ کس طرح "شیرٹن ہوٹل وہ سامنے رہا" کہتے ہوئے باشندی اور حسن صاحب نے ہمیں دو تین میل پیدل چلنے پر مجبور کردیاتھا۔ بعد میں تو ہمیں بھی عادت ہوگئی تھی۔ جب کہیں جانے کا پروگرام بنتاتو باشندی اور علی یہی کہتے کہ بالکل نزدیک ہے مگر ہم پھر بھی ٹیکسی لینے پر اصرار کرتے اور بعد میں پتا چلتا کہ وہ جگہ ڈیڑھ دو میل دور تھی۔

بالکل برابر والا چڑیاگھر شیرٹن ہوٹل سے کم ازکم سو میل کے فاصلے پر تھا مگر ہم چونکہ نوگرفتار تھے اس لئے باشندی کی بات پر یقین کرلیااور پیدل ہی چل پڑے اور چلتے چلتے مزید تھک گئے۔

شباب صاحب بجلی کے ایک کھمبے سے ٹیک لگا کر کھڑے ہوگئے۔ "یار تم کب کی دشمنی نکال رہے ہو؟ کیا ہمیں پیدل چلانے کیلئے قاہرہ لائے ہو؟"

باشندی نے بڑے خلوص سے کہا۔ "وہ دیکھیے۔ سامنے ہی تو چڑیاگھر کا دروازہ نظر آرہاہے۔" اس بار وہ بالکل سچا تھا۔ واقعی چند گز کے فاصلے پر چڑیاگھر کا دروازہ نظر آرہاتھا۔ چڑیا گھر کے سامنے اور اندر خاصی چہل پہل تھی مگر بچوں سے زیادہ بڑے نظر آرہے تھے۔ ان میں بیشتر تعداد خواتین کی تھی۔ علی نے بتایا کہ قاہرہ کے لوگ رومان کرنے بھی چڑیاگھر پہنچ جاتے ہیں ۔ ویسے ہی چڑیاگھر اس مقصد کیلئے خاصا کار آمد تھا۔ درخت' سبزہ زار' پھول پتے' پانی کی جھیلیں اور رنگ برنگے پرندے۔ خاصا رومانٹک ماحول تھا پھر چڑیاگھر کے اندر ہی چند اچھے ریستوران بھی تھے۔ جہاں خوب رونق نظر آئی۔ سیاحوں کے بعد رومانی جوڑوں کی تعداد سب سے زیادہ تھی۔

ہم چڑیا گھر کے اندر پہنچ تو گئے تھے مگر تھکن کے مارے سب کی حالت خراب تھی۔ شباب صاحب تو بالکل ناگفتہ بہ حالت میں تھے۔ اپنی چپلیں انہوں نے اتار کر سامنے رکھ لیں اور کہا۔ " آپ لوگوں کو جہاں بھی جانا ہے جائیں۔ میں یہیں بیٹھا ہوں۔"

رشید جاوید نے ان کا ساتھ دینے کے بہانے وہیں ڈیرا جمالیا۔ ہمارا بھی ایساہی ارادہ تھا مگرباشندی نے بعض نادر پرندوں اور جانوروں کے بارے میں لبنیٰ کو ایسے سبز باغ دکھائے کہ وہ آگے قدم بڑھانے پر آمادہ ہوگئیں اور ہمیں بھی ان کا ساتھ دینا پڑا۔ لبنیٰ صبح سے اونچی ایڑی کی جوتی پہنے ہوئے تھیں۔ انکے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ اتنا زیادہ پیدل چلنا پڑے گا۔ اب اس جوتی کے ساتھ مزید پیدل چلنا ان کیلئے ممکن نہیں تھا انہوں نے شباب صاحب کی چھوٹی چھوٹی نازک چپلوں کو سامنے رکھے دیکھا تو فورا" اپنی اونچی ایڑھی کی جوتی اتار کر انکی چپل پہن لی۔ اس سے پہلے انہوں نے شباب صاحب سے اجازت طلب کی جو انہوں نے بڑی فراخ دلی سے عنایت کردی مگر ساتھ میں تاکید کردی کہ جلدی واپس آیئے گا۔

ہم چڑیاگھر کی سیر کرتے رہے۔ واقعی یہ بہت شاندار جگہ ہے۔ ایک ریستوران میں بیٹھ کر ہم نے کافی بھی پی۔ باشندی کو ایک گرل فرینڈ بھی نظر آگئیں۔ اگر ہم لوگ ساتھ نہ ہوتے تو باشندی ضرور انہیں لے کر کسی جھیل کے کنارے بیٹھ جاتا پھر بھی اس نے خاتون سے ہمارا تعارف کرایا۔ وہ کشیدہ قامت' بھرے بھرے جسم کی دلکش خاتون تھیں۔ مغربی لباس یعنی اسکرٹ میں ملبوس تھیں ترشے ہوئے بال کاندھوں پر پڑے ہوئے تھے۔

باشندی نے پہلے تو عربی میں بات چیت کی پھر انگریزی میں ہم لوگوں سے تعارف کرایا۔ معلوم ہوا کہ وہ قاہرہ یونیورسٹی میں قدیم تاریخ کی طالبہ ہیں۔

حسن صاحب نے پوچھا۔ "مگر آپ اکیلی چڑیاگھر میں کیا کررہی ہیں؟"

مسکرا کرولیں۔ " چڑیاگھر کے جانور اور پرندے بھی تو قدیم تاریخ کا ایک حصہ

ہیں۔ میں تاریخ کا مطالعہ کرنے چڑیا گھر چلی آتی ہوں۔"

ان کا نام حنفیہ تھا۔ بہت خوش مزاج خاتون تھیں اور آزاد خیال بھی لیکن انہیں اپنے مضمون پر کافی عبور حاصل تھا۔ باشندی صاحب نے انہیں دیکھتے ہی فوراً کافی کی دعوت دے دی ۔ ہم نے اس شرط پر دعوت منظور کی کہ مصری قہوہ ہرگز نہیں پلایا جائے گا بلکہ انگریزی کافی چلے گی۔ حنفیہ خود بھی انگریزی کافی کی شوقین تھیں بلکہ امریکیوں کی طرح بلیک کافی ان کا پسندیدہ مشروب تھا۔ انہوں نے بتایا کہ یہ عادت انہیں ایک امریکی خاتون پروفیسر کی وجہ سے پڑ گئی اور اب وہ بلیک کافی کے سوا کوئی اور مشروب پینا پسند ہی نہیں کرتی ہیں۔

وہ ہم سے پوچھنے لگیں کہ قاہرہ آپ کو کیسا لگا؟

ہم نے کہا۔"بہت حیران کردینے والا شہر ہے۔ قدیم اور جدید تہذیبوں کا سنگم کہہ لیجئے۔"

کہنے لگیں۔"آپ کو کسی نے قاہرہ کی تاریخ بھی بتائی؟"

ہم نے کہا۔"آپ پہلی تاریخ داں ملی ہیں۔ اس لئے آپ ہی بتادیں تو نوازش ہوگی۔"

وہ ہنسنے لگیں' بولیں۔"آج جس جگہ قاہرہ آباد ہے زمانہ قدیم میں اس جگہ اہل بابل نے ایک شہر آباد کیا تھا لیکن بابل والوں کے اس شہر سے پہلے یہاں ایک اور شہر بھی موجود تھا جسے لاتو پولس کہتے ہیں۔"

حسن صاحب کہنے لگے۔"قدیم مصر کے ناموں میں "پولس" کا لفظ بہت زیادہ استعمال ہوا ہے۔ کہ! کیا اس زمانے میں لوگ پولیس سے بہت ڈرتے تھے؟"

"ارے صاحب اس زمانے میں تو آج جیسی پولیس ہوتی ہی نہیں تھی۔ یہ دراصل قدیم لفظ ہے جیسے آج کل شہروں کے ساتھ ایک لفظ لگا دیتے ہیں اسی طرح اس زمانے میں "پولس" بڑھا دیا کرتے تھے۔ 640ء عیسوی میں جب حضرت عمرؓ نے عمرو بن العاص کو لشکر اسلام کے ساتھ روانہ کیا تو انہوں نے پہلے اسکندریہ فتح کیا اور واپس ہوتے ہوئے اس مقام پر قیام کیا جسے آج کل قاہرہ کہتے ہیں۔ ان کے قیام کے باعث آس پاس کے لوگ مسلمان ہوگئے اور خیمے کی رعایت سے اس شہر کا نام فسطاط مشہور ہوگیا۔ بعد میں 385 ہجری میں تیونس کے حکمرانوں نے حملہ کردیا اور فسطاط کے قریب القاہرہ کے نام سے ایک شہر کی بنیاد رکھی۔ یہ وہی شہر ہے جسے اہل یورپ نے بگاڑ کر "کائرو" بنا دیا ہے۔"

وہ تو اس کے آگے بھی تاریخی واقعات سنانے کے موڈ میں تھیں مگر ہم نے سوچا کہ ہم تھکے ماندہ مسافروں کیلئے آج اتنی ہی تاریخ بہت کافی ہے۔ خیر اس میں تو کوئی شک نہیں کہ کسی زمانے میں قاہرہ بہت عظیم اور ترقی یافتہ شہر تھا اور انیسویں صدی کے آغاز میں بھی وہاں ٹرام چلا کرتی تھی۔ حنفیہ نے ہمیں قاہرہ کی تاریخی مساجد اور قلعوں کو دیکھنے کی فرمائش کی اور یہ بھی کہا کہ امام حسینؓ کا مزار اور مسجد اور سیدہ زینبؓ کا مقبرہ ضرور دیکھیں۔ مسجد امام حسینؓ اور مقبرہ ہم اس سے پہلے دیکھ چکے تھے۔ یہ ایک شاندار اور پرشکوہ مسجد ہے جو سنگین ستونوں پر تعمیر کی گئی ہے اور مسجد کے عقب میں مزار ہے۔ کہاجاتا ہے کہ حضرت امام حسینؓ کا سر مبارک جب کوفہ سے لایا گیا تھا تو یہیں دفن کیا گیا تھا۔ اس مسجد اور مزار پر زائرین کا ہجوم رہتا ہے۔ اسلامی ملکوں میں ایک رواج یہ بھی دیکھا کہ ہر مزار کے ساتھ ایک مسجد ضرور تعمیر کی جاتی ہے۔ سیدہ زینبؓ کے مزار پر بھی زائرین کا مجمع رہتا ہے جن میں عورتوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔

حنفیہ کے ساتھ باتیں کرنے میں کافی دیر لگ گئی۔ انہیں لیلیٰ کا پاکستانی لباس یعنی شلوار قمیض اور دوپٹہ بہت پسند آیا تھا بار بار کہہ رہی تھیں کہ کس قدر شاندار اور باوقار لباس ہے اور جاذب نظر بھی ہے۔ انہوں نے اتنی زیادہ تعریف کی کہ لیلیٰ نے انہیں پیشکش کردی کہ وہ ایک شلوار قمیض سوٹ انہیں بطور تحفہ دے دیں گی مگر انہوں نے شکریے کے ساتھ انکار کیا۔ ریستوران کے پاس ہی ایک جھیل تھی جس میں آبی پرندے اٹھکیلیاں کررہے تھے۔ لوگ وہیں سے دانہ خرید کر انہیں ڈال رہے تھے۔ ہم نے بھی یہ رسم نبھائی۔ حسن صاحب نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا کہ سارا دن لوگ دانہ ڈالتے رہتے ہیں تو پرندے بیمار کیوں نہیں ہوتے۔

حنفیہ نے کہا۔" یہ پرندے ہم انسانوں سے زیادہ ہوشیار اور محتاط ہیں۔ ہمیں ڈاکٹر دن رات بتاتے رہتے ہیں کہ بھوک سے زیادہ نہ کھائیں ورنہ بیمار پڑ جائیں گے مگر پرندے اس اصول پر سختی سے عمل کرتے ہیں اور پیٹ بھر جاتا ہے تو دانے کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔"

اس چڑیا گھر میں ہمیں فلموں کے لو اسپاٹ کا گمان گزر رہا تھا۔ کیونکہ ہر طرف جوڑے موجود تھے۔ یورپ کا سماں تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ یہ لوگ یورپ والوں جیسی ناشائستہ حرکتیں نہیں کر رہے تھے۔ تاریخی عمارتوں وغیرہ میں تو ہم نے لوگوں کو رومان کرتے ہوئے دیکھا تھا مگر چڑیا گھر کا یہ استعمال ہمارے لئے انوکھا تھا۔ باشندی نے ہمیں بتایا کہ اس معاملے میں قاہرہ کے لوگ بہت جدت پسند ہیں۔ ان کے ایک دوست کا رومان ایک اسپتال میں ہوا تھا۔ خیر...... یہاں تک تو ٹھیک ہے کہ ایک مریض اسپتال کی نرس سے محبت کرنے لگا۔ یہاں تک کہ دونوں کی شادی ہوگئی مگر لطیفے کی بات یہ ہے کہ جب دونوں کی شادی ہوئی تو سیاحوں کا سیزن شروع ہو چکا تھا اور کسی معقول ہوٹل میں انہیں ہنی مون منانے کے لئے کمرا دستیاب نہیں تھا۔ چنانچہ انہوں نے ایک اسپتال میں داخلہ لے کر وہاں ہنی مون منایا مگر یہ اسپتال وہ نہیں تھا جہاں دلہن صاحبہ نرس کے طور پر کام کرتی تھیں۔

ابھی ہم لوگ اٹھنے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ ایک مصری بزرگ ہاتھ میں تسبیح گھماتے ہوئے ایک جانب سے نمودار ہوئے۔ وہ ٹخنوں تک لمبا لبادہ پہنے ہوئے تھے۔ سر پر گول کپڑے کی ٹوپی تھی جو کہ مصری عام طور پر پہنا کرتے ہیں۔ رنگ تو ان کا گندمی تھا مگر ناک نقشہ بہت اچھا تھا اور خاصا نورانی چہرہ تھا۔ ممکن ہے داڑھی اور تسبیح کے باعث ہمیں نور نظر آرہا ہو۔ باشندی اور علی پر نظر پڑی تو انہوں نے دور ہی سے اہلاً وسہلاً کا نعرہ لگایا اور تیزی سے ہماری میز کی طرف آئے۔ علی اور باشندی نے اٹھ کر ان سے معانقہ کیا ایک دوسرے کے رخسار چومے گئے اور پھر نہایت سلیس عربی میں الفاظ کا تبادلہ ہوا۔ ہمیں اندازہ ہوا کہ کچھ ہم لوگوں کے بارے میں کہا جا رہا تھا۔

باشندی نے فوری طور پر تعارف کا فرض ادا کیا۔ ان کا نام یوسف الہدی تھا۔ قاہرہ کے بہت پرانے باشندے تھے اور قدیم شہر کے علاقے میں رہتے تھے۔ ان کی درزی کی دکان تھی مگر اپنے پیشے سے خاصے بیزار لگ رہے تھے وجہ یہ تھی کہ نئے نئے فیشن کے مطابق لباس بنانا انہیں پسند نہ تھا۔ انہوں نے ایک سرد آہ بھر کر کہا کہ کیا کروں؟ مجھے کوئی اور کام بھی نہیں آتا ورنہ بے حیائی کے اس کام پر لعنت بھیج کر اس سے نجات حاصل کرلوں۔

وہ خاصی عمر کے بزرگ نظر آتے تھے اور نئے زمانے سے سخت بیزار تھے۔"جنگ کے زمانے میں فرنگیوں نے یہاں آوارگی اور بدمعاشی پھیلائی۔ اس زمانے میں فوجی یہ خرابیاں لے کر آتے تھے۔ اب یہ منحوس سیاح آجاتے ہیں۔" وہ انگریزی میں بڑبڑائے۔ انگریزی وہ کام چلانے کے لائق جانتے تھے۔

سیاحوں کو انہوں نے برا بھلا کہا تو باشندی نے فوراً" کھنکار کر ان کی توجہ ہم لوگوں کی طرف منعطف کرائی کہ حضرت کیا کرتے ہیں۔ یہ لوگ بھی سیاح ہیں جو ہمارے ساتھ بیٹھے ہیں۔

وہ باشندی کا مطلب سمجھ گئے' بولے۔" ارے میں ان سیاحوں کو تھوڑا ہی کہہ رہا ہوں۔ میں تو ان میموں اور انگریزوں پر لعنت بھیج رہا ہوں۔ زمانے بھر کی خرافات ان کی وجہ سے ہمارے ملک میں پھیل رہی ہے۔"

حنیفہ نے کہا۔"یاشیخ ان سیاحوں کی وجہ سے ہمیں کتنی زیادہ آمدنی بھی تو ہوتی ہے۔"

بولے۔"یہی تو خرابی ہے۔ ان لوگوں کی وجہ سے .... نہ صرف برائیاں پھیل رہی ہیں۔ بلکہ لوگ سست اور کاہل بھی ہوگئے ہیں۔ کوئی کام کرنا ہی نہیں چاہتا۔ سیاحت کی آمدنی' بخشش اور بھیک پر ہی سب کا گزارا ہے اور ان بے حیا عورتوں کو دیکھ دیکھ کر ہماری عورتیں بھی دیدہ ہوائی ہوتی جارہی ہیں۔ میرا بس چلے تو ان سیاحوں کا داخلہ ہی بند کردوں۔ دیکھا نہیں ہماری یادگاروں کا کیا حال بنادیا ہے انہوں نے۔ کم بخت اہرام اور ابوالہول پر بھی چڑھ چڑھ کر تصویریں بنواتے ہیں۔ اہرام کے پتھر خراب کرکے رکھ دیے ہیں۔ دو چار سو سال اور یہی حال رہا تو اہرام غائب ہوجائیں گے۔ پرانی چیزوں کی تلاش میں گلی گلی مارے پھرتے ہیں۔ اور نوجوان لڑکے ان کی ننگی ٹانگیں اور ننگے جسم دیکھ کر بے قابو ہوئے جارہے ہیں۔ تماشا بنا کر رکھ دیا ہے۔" غصے کے مارے انہوں نے بہت زور زور سے تسبیح گھمانی شروع کردی۔

ہم نے چپکے سے علی سے پوچھا کہ یہ اتنی بہت سی باتیں کر رہے ہیں تو پھر تسبیح پر کیا پڑھ رہے ہیں؟

کہنے لگے ۔"پڑھنا وڑھنا کیا ہے۔ دل ہی دل میں گالیاں دے رہے ہوں گے۔"

یکایک انہیں کچھ خیال آیا۔ انہوں نے ہم سب لوگوں کو بغور دیکھا۔ لبنٰی

کے لباس کا جائزہ لیا اور بولے۔" دیکھو کتنا شریفانہ لباس پہن رکھا ہے اس لڑکی نے۔ آخر یہ بھی تو عورت ہے۔ کیوں بھئی تم لوگ کس ملک سے آئے ہو؟"

ہم نے کہا۔"پاکستان سے۔ ابھی آپ کو باشندی نے بتایا تو ہے۔"

پوچھنے لگے۔"کیا وہاں بھی سیاح آتے ہیں؟"

ہم نے کہا۔" ہمارے ہاں بہت کم سیاح آتے ہیں۔ دراصل ان کے مطلب کی اتنی چیزیں وہاں نہیں ہیں۔"

کہنے لگے۔" خوش قسمت ہو کہ تمہارے ملک میں فرعون نہیں تھے اسی لئے اہرام بھی نہیں ہیں۔ ویسے کوئی دریا وریا تو ہوگا؟"

ہم نے کہا۔" جی ہاں۔ ہمارے شہر لاہور کے پاس بھی ایک دریا بہتا ہے۔ اس کا نام راوی ہے۔"

"مگر وہ نیل کی طرح بڑا نہیں ہوگا۔ پتا نہیں ان لوگوں کا اپنے ملک میں دل کیوں نہیں لگتا وہاں چین سے کیوں نہیں بیٹھتے۔ میری بات یاد رکھنا۔ قیامت ان ہی لوگوں کی وجہ سے آئے گی۔ یہ سب نشانیاں قیامت کی ہیں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور "اللہ حافظ" کہہ کر رخصت ہوگئے۔

ہم نے پوچھا۔"یہ اس وقت چڑیا گھر میں کیوں گھوم رہے ہیں؟"

باشندی نے کہا۔" یہ ہر روز یہاں آتے ہیں اور یہ چیک کرتے ہیں کہ نوجوان جوڑوں میں ان کے محلے کے لڑکے اور لڑکیاں کتنے ہیں۔ بعد میں ان کیخلاف اپنے محلے میں پروپیگنڈہ کرتے ہیں۔"

واقعی شیخ یوسف المدی بھی خوب ہیں۔ اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو۔ ایسے بزرگوں کی ہمارے ملک میں بھی کمی نہیں ہے۔

ہم لوگوں کو گھومتے پھرتے کافی دیر ہوگئی تھی۔ حسن صاحب کا خیال تھا کہ اب واپس چلنا چاہیے۔ شباب صاحب اور جاوید صاحب انتظار کر رہے ہوں گے۔ ہم واپس آگئے تو شباب صاب کو سخت بیزاری کے عالم میں پایا۔ جاوید صاحب ہمیں دیکھ کر مسکرانے لگے۔

چڑیا گھر سے باہر نکلتے ہی وہ فٹ پاتھ پر کھڑے ہوگئے اور بولے۔" جب تک ٹیکسی نہیں آئے گی میں ایک قدم بھی نہیں چلوں گا۔" اس سے پہلے انہیں جو تلخ تجربہ ہو چکا تھا اس کے پیش نظر ان کی یہ احتیاط جائز بھی تھی۔ ہم نے فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر ٹیکسیوں کا انتظار کرنا شروع کر دیا۔ یہ غزہ کا چوک تھا۔ چھ سات سڑکیں اس چوک سے نکلتی تھیں۔ ٹریفک کا ہجوم بھی کم نہیں تھا۔ پولیس کے بجائے اسکول کے لڑکے اور لڑکیاں اسکاؤٹس کا لباس پہنے سڑکوں پر کھڑے ٹریفک کنٹرول کر رہے تھے۔ کیا مجال جو کوئی ان کے اشارے کی خلاف ورزی کر جائے۔

ہم نے پوچھا۔"کیا قاہرہ میں ٹریفک پولیس نہیں ہوتی؟"

باشندی نے کہا۔"کیوں نہیں ہوتی۔ وہ دیکھیے؟"

دیکھا کہ ایک چوک کے ایک جانب قدرے اونچائی پر ایک برجی سی بنی ہوئی تھی جس کے اندر ایک پولیس والا کھڑا ہوا ٹریفک کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ اسکولوں کے سمارٹ لڑکے اور لڑکیاں بڑی مستعدی اور ہوشیاری سے ٹریفک کنٹرول کر رہے تھے۔

باشندی نے کہا۔" قاہرہ میں اسکول کے بچوں کو اس طرح سڑکوں پر ٹریفک کنٹرول کرنے کیلئے متعین کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح ایک تو بچوں کو نوعمری ہی سے ٹریفک کے اصولوں اور ضابطوں سے واقفیت ہو جاتی ہے اور دوسرے یہ کہ ان کی تفریح بھی ہو جاتی ہے۔ ہمیں یہ آئیڈیا بہت پسند آیا۔ سوچا کہ اگر اسے پاکستان میں اپنایا جائے تو کتنا اچھا ہو۔

جاوید صاحب بولے۔"مگر ان بچوں اشارے پر کون رکے گا؟ ہمارے ہاں تو لوگ پولیس والے کے اشارے پر نہیں رکتے کے بچوں کو کون خاطر میں لائے گا؟"

ٹریفک کے حوالے سے ہمارے شہروں کا جو حال ہے وہ ہر ایک پر ظاہر ہے۔ ٹریفک کے اصول سے ڈرائیوروں کو آگاہ کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی جاتی۔ ڈرائیونگ لائسنس رشوت یا سفارش کے ذریعے گھر بیٹھے حاصل ہو جاتے ہیں تو پھر ٹریفک کے اصولوں سے کوئی واقف ہو تو کیوں کر؟ ہمارا تو یہ خیال ہے کہ خود ہی ہماری ٹریفک پولیس بھی ٹریفک کے اصولوں سے آگاہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے شہروں میں ٹریفک کے نظام کو دنیا کا بدترین نظام کہا جاسکتا ہے۔

ٹیکسیاں بھی ہمیں بہت جلد مل گئیں۔ ٹیکسیوں کی قاہرہ میں کمی نہیں ہے اور عام طور پر ٹیکسی ڈرائیور بھی خوش اخلاق لوگ ہوتے ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خوبی تو یہ ہے کہ عربی بولتے ہیں جو کم سے کم ہم پاکستانیوں کو بہت مرعوب اور متاثر کرتی

ہے۔ مسافروں کو چکر دینے کے معاملے میں ان کی زیادہ تعریف نہیں کی جاسکتی۔ کئی بار تو ایسا بھی ہوا کہ ہم کوئی پتا ڈھونڈ رہے ہیں اور جس سے پوچھتے ہیں وہ ایک مختلف سمت میں اشارہ کرکے عربی کا دریا بہا دیتا ہے۔ مجبور ہو کر ٹیکسی میں بیٹھ جاتے ہیں تو ٹیکسی والا خاصا لمبا سفر طے کرنے کے بعد جب ہمیں منزل مقصود پر پہنچاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم جہاں کھڑے پتا دریافت کررہے تھے وہ جگہ سامنے ہی تھی۔ باشندی اور علی سے ہم نے اس بارے میں شکایت کی تو انہوں نے ٹیکسی والوں کی صفائی پیش کرنی شروع کردی۔" دیکھیے نا یااخی۔ قاہرہ میں ون وے ٹریفک ہے۔ ٹیکسی والا اس کی خلاف ورزی نہیں کرسکتا۔ اسی لئے آپ کو یہ سفر بہت لمبا محسوس ہوتا ہے۔"

اللہ بہتر جانتا ہے کہ قصور قاہرہ کے ٹیکسی والوں کا تھا یا ہماری نافہمی کا!

علی نے ہم سے معذرت کرکے رخصت چاہی البتہ یہ وعدہ کیا کہ دو گھنٹے بعد باشندی کے فلیٹ پر پہنچ جائیں گے۔ ہم بہت جلد ہی باشندی کے فلیٹ پر پہنچ گئے۔ شاید اس لئے کہ باشندی ہمارے ساتھ تھے اور ٹیکسی ڈرائیور کو چکر بازی کا موقع نہیں مل سکا تھا یا شاید اس راستے میں " ون وے ٹریفک" کے الجھاؤ نہیں تھے۔ دن کے وقت قاہرہ میں خاصی گرمی ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں کے مئی جون کا نقشہ تو نہیں ہوتا لیکن تپش کافی ہوتی ہے اور پیدل چلتے ہوئے پسینہ بھی خوب آتا ہے۔ فلیٹ کے سامنے پہنچ کر باشندی نے ٹیکسی والوں سے میٹر کا حساب کیااور ہم نے ان کی ہدایت کے مطابق کرایہ ادا کردیا۔باشندی نے جیب سے چابی نکال کر دروازے کا تالا کھولا اور ہم لوگوں کو اندر داخل ہونے کی دعوت دی۔ جب ہم اندر پہنچے تو یوں لگا جیسے ایک سایہ سا لہرایا ہے اور کھلی ہوئی کھڑکی سے باہر چلاگیاہے یہ ہم پہلے بتاچکے ہیں کہ باشندی صاحب فلیٹ کے بیرونی دروازے کے سوا کوئی اور کھڑکی ' دروازہ یا روشندان بند کرنے کی زحمت گوارا نہیں فرماتے تھے۔ ایسے میں اگر کھلی کھڑکی سے کوئی اندر داخل ہوجائے تو اس میں تعجب کی کوئی بات بھی نہ تھی ہم نے دیکھا کہ باشندی نے پراسرار سائے کی جانب مطلق توجہ نہیں دی۔ ہم لوگ حد درجہ خستہ حال تھے۔ اس لئے اپنے کمروں کی راہ لی۔ ہم اپنے کمروں میں پہنچے تو کچھ تبدیلی سی محسوس ہوئی۔ کمرے میں جس جگہ اور جس طرح سامان چھوڑ کر گئے تھے اب وہ اپنی جگہ سے کھسکاہوا نظر آرہاتھا۔ لبنیٰ نے بستر کی چادر اور پلنگ پوش کو خاص طور پر صاف کیاتھا مگر اس وقت اس پر سلوٹیں نظر آرہی تھیں۔ بستر پر چند عربی کے باتصویر میگزین بھی بکھرے پڑے تھے۔ ہم نے فوراً سراغرسانی شروع کردی مگر لبنیٰ نے سب سے پہلے سوٹ کیس چیک کیے۔ سوٹ کیس مقفل تھے اور کھول کر دیکھا تو اندر بھی ہر چیز جوں کی توں موجود تھی۔

یکایک لبنیٰ نے ناک سکیڑی اور سونگھنا شروع کردیا۔ ہم نے توجہ دی تو احساس ہوا کہ کمرے میں بھینی بھینی خوشبو سی پھیلی ہوئی ہے۔"

"یہ خوشبو کیسی ہے ؟" ہم نے پوچھا۔

"زنانہ۔"لبنیٰ نے مختصر جواب دیا۔

" اس سے کم ازکم اتنا معلوم ہوگیا کہ اگر اس فلیٹ پر کسی آسیب کا سایہ تھا تو وہ مرد نہیں عورت تھا جسے خوشبو لگانے کا بہت شوق تھا اور وہ مطالعے کا بھی دلدادہ تھا۔ اس قدر خوش ذوق آسیب اور وہ بھی ایک کنوارے کے فلیٹ میں اگر رہائش اختیار کرلے تو اسے خوش قسمتی ہی قراردیاجاسکتا ہے۔ آسیب کی نہیں' کنوارے کی۔

لبنیٰ نے کہا۔ "مجھے تو ڈر لگ رہاہے۔یہاں توکسی کا سایہ ہے۔"

ہم نے کہا۔" دیکھو۔ یہ بات کسی اور کو مت بتانا اور اگر کوئی سایہ ہے بھی تو صنف نازک کا ہے اور قطعی بے ضرر ہے۔ کسی فن کار قسم کے آسیب سے برائی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔"

اتنی دیر میں ڈرائنگ روم سے شباب صاحب کے پکارنے کی آواز سنائی دی۔ ہم سمجھے شاید ان کا بھی کسی سائے سے واسطہ پڑ گیا ہے۔ ان کے پاس پہنچے تو ہاتھ میں شلوار اور قمربند لیے کھڑے تھے۔ کہنے لگے۔"یار تمہیں شلوار میں کمربند ڈالنا آتا ہے تو ذرا ڈال دو۔"

ہم نے فوراً حکم کی تعمیل کردی۔ دوسری بات انہوں نے یہ کہی کہ ہم لوگ سوئیں گے کیسے؟

ہم نے کہا۔ "یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ ارے بھئی بیڈ پر لیٹ کر آنکھیں بند کریں اور سوجائیں گے۔"

"یہ بات نہیں ہے مشکل یہ ہے کہ کسی بھی کمرے میں پنکھا نہیں ہے۔ گرمی میں نیند کیسے آئے گی؟"

ہم نے ابھی تک اس موضوع پر غور نہیں کیا تھا۔ اب جو غور کیا تو پتا چلا کہ واقعی پورے فلیٹ میں ایک پنکھا بھی نہیں ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ قاہرہ کے متوسط طبقے کے لوگ گھروں میں عام طور پر پنکھا لگانے کے قائل نہیں ہیں۔ پنکھا نظر نہ آیا تو ہمیں بھی گرمی کا احساس ہونے لگا۔ اتنی دیر میں باشندی ایک ٹرے میں تربوز کی قاشیں اور قہوہ لیے ہوئے نمودار ہوا۔

"آپ لوگوں نے کھانا بھی نہیں کھایا ہے۔ اس لئے تربوز سے شوق فرمائیں۔"

تربوز تو ہم نے کھا لیا مگر پنکھے کی عدم موجودگی سے غافل نہ ہوسکے۔

باشندی کی توجہ اس طرف مبذول کرائی تو وہ بولا۔ "پنکھے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ آپ اسی طرح سو جائیے جس طرح ہم لوگ سوتے ہیں۔"

"آپ لوگ کس طرح سوتے ہیں؟"

اس نے کہا "اسطرح۔" یہ کہہ کر پہلے تو کمرے کی کھڑکیاں بند کیں پھر بیڈ پر لیٹ کر سر سے پیر تک کمبل لپیٹ لیا۔ چند لمحے بعد اس کے خراٹوں کی آواز گونجنے لگی۔ ہم حیران رہ گئے۔ اس قدر گرمی میں ساری کھڑکیاں بند کر کے حبس دم کر لیا اور پھر کمبل لپیٹ کر پڑ گئے۔ ہم نے تو اس طریقے کو مسترد کر دیا۔ پہلے ساری کھڑکیاں کھولیں، پھر کمبل کو الماری میں رکھ دیا۔ سونے کیلئے تو نیند کہاں آتی۔ بس کروٹیں بدلتے رہے یہاں تک کے اٹھ کر بیٹھ گئے۔

"چھوڑو یار۔ رات کو سوئیں گے۔"

باشندی ڈیڑھ گھنٹے تک مزے سے سوتا رہا پھر اٹھا تو منہ ہاتھ دھو کر بالکل تازہ دم ہوگیا۔ ہمارے کمروں کی کھڑکیاں کھلی دیکھیں تو فوراً تمام کھڑکیاں بند کردیں اور کہا کہ یہاں کے موسم میں کھڑکیاں بند کرنا ہی مناسب ہوگا، مگر ہم نے اس کے جاتے ہی ساری کھڑکیاں دوبارہ کھول لیں۔

علی نے شام کو آکر یہ اطلاع دی کہ آج ہم شہر کی سیر کریں گے اور کل اہرام دیکھنے جائیں گے۔ فلیٹ سے باہر نکلے تو راستے میں چند چھوٹی چھوٹی دکانیں دیکھ کر یوں ہی دیکھنے کھڑے ہوگئے۔ شیشے کی الماری میں ہمیں "لکس" صابن کی چند ٹکیاں نظر آئیں تو بہت حیران ہوئے۔ جاوید صاحب کا کہنا تھا کہ نقلی ڈبے ہوں گے ورنہ صابن کی

قلت کے زمانے میں کون یوں صابن کی ٹکیاں سجا کر رکھے گا۔ ڈرتے ڈرتے ہم نے دکاندار کو دیکھا۔ یہ ایک موٹی تازی قبول صورت خاتون تھیں۔ لبنیٰ نے صابن کی طرف اشارہ کیا تو انہوں نے مسکراتے ہوئے بلا تامل صابن نکال کر دے دیا۔

ہم نے کہا۔ "باقی دو ٹکیاں بھی لے لو۔"

لبنیٰ نے ان کی طرف اشارہ کیا تو خاتون نے وہ دونوں ٹکیاں بھی نکال کر حوالے کردیں اور لطف یہ کہ قیمت بھی بالکل واجبی وصول کی۔ خدا جانے انہیں شہر میں صابن کی قلت کا علم نہ تھا یا کوئی دشمن انہیں کچھ دیر کیلئے اپنی دکان پر بیٹھا گیا تھا۔ صابن خرید کر ہمیں ایسی مسرت ہوئی جیسے کوئی نعمت مل گئی ہو۔ ایک صابن ہم لوگ استعمال کرتے رہے اور دو ٹکیاں ازراہ فیاضی بطور تحفہ باشندی کو دے آئے۔

قاہرہ وہی تھا جو پہلے دیکھ چکے تھے۔ دریائے نیل کی رونقیں بھی ویسی ہی تھیں اور سڑکوں پر اژدہام بھی بدستور تھا۔ باشندی اور علی گائیڈ کے طور پر معلومات فراہم کرتے رہے مگر ہمارے لئے یہ "ایکشن ری پلے" تھا کیونکہ ہم ان تمام راستوں سے پہلے ہی گزر چکے تھے۔

رات کا کھانا ایک مخصوص قسم کے مصری ریستوران میں کھایا۔ یہاں کے کباب مشہور تھے۔ باشندی نے بہت تعریف کی تھی۔ کہ اس ریستوران کے کباب سارے قاہرہ میں مشہور ہیں۔ شہرت سن کر ہم بھی وہاں پہنچ گئے۔ ریستوران کا ماحول لکشمی چوک کے ریستورانوں سے مختلف نہیں تھا۔ البتہ موسیقی کا اضافہ تھا۔ ام کلثوم کے نغمات پس منظر میں بج رہے تھے۔

علی نے کہا۔ "یہ ریستوران والا بہت چالاک ہے۔ خاص طور پر کھانے کے وقت ام کلثوم کے نغمات بجاتا ہے۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے؟"

"بھوک بہت لگتی ہے اور مالک کا فائدہ ہوجاتا ہے۔"

کباب آئے تو ہمارے سیخ کبابوں کی مانند تھے مگر سائز میں چھوٹے اور ٹھوس۔ یعنی سیخ پر نہیں بنائے گئے تھے۔ خوشبو تو بہت اچھی تھی مگر جب کھائے تو کوئی خاص لطف نہ آیا۔ مسالے کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ مرچ اور نمک تک نہیں تھا۔ خدا جانے خالص قیمے کے ان کبابوں میں کیا خاص بات تھی جس کے اہل قاہرہ دیوانے تھے۔

کھانے کے بعد علی اور باشندی نے مزید سیرو تفریح کا پروگرام بنایا تھا مگر شباب صاحب نے ہینڈز اپ کردیے اور اعلان کردیا کہ اب گھر جاکر سونے کے سوا کوئی اورپروگرام نہیں ہوگا۔ تھکن اور نیند کے مارے ہمارا بھی برا حال تھا۔ چنانچہ خیر سے بدھوگھر کو آئے۔

اپنے کمرے میں پہنچے تو دیکھا کہ کمرے میں میگزین بکھر گئے تھے اور روشنی بھی جل رہی تھی حالانکہ ہم لوگ لائٹ بجھاکر گئے تھے۔

لبنٰی کو خاصا ڈر لگ رہاتھا بولیں۔" رات کے وقت ہم ضرور کھڑکیاں بند کرکے سوئیں گے۔"

"کیوں؟"

"آسیب سے بچنے کیلئے۔"

ہم نے کہا۔" رات کے وقت ہی تو کھڑکیاں کھول کر سونے کالطف ہے۔ دیکھانہیں باہرسے کتنی اچھی ٹھنڈک آرہی ہے۔"

یہ حقیقت ہے کہ سورج غروب ہونے کے بعد قاہرہ کا موسم نہایت خوشگوار ہوجاتاتھا۔

"لیکن آسیب .....؟" انہوں نے کہا۔

"بھئی آسیب ہمارا کیابگاڑے گا۔زیادہ سے زیادہ لیمپ جلاکر میگزین ہی پڑھے گا۔"

رات واقعی بہت پرسکون اور فرحت بخش تھی۔ بلکہ رات کے وقت ہمیں کمبل بھی استعمال کرنا پڑا۔ صبح سب سے پہلے بیڈ ٹی(یعنی قہوہ) کے ساتھ شیریں تربوز پیش کیاگیا۔ اس کے بعد باشندی نے آملیٹ اور ٹوسٹ لاکر میز پر رکھ دیے۔ دونوں چیزیں معقول تھیں مگر یہ سمجھ میں نہیں آیاکہ باشندی نے یہ ناشتا کس وقت تیار کرلیاتھا۔ کیونکہ وہ ہمارے ساتھ ہی بیدار ہواتھا۔

لبنٰی نے کہا۔ "میراتو خیال ہے کہ آسیب نے ناشتا بنایاہے۔"

ہم نے کہا۔" ایسا ایک آدھ آسیب ہمیں بھی لاہور میں مل جائے تو کتنا اچھا ہو!"

اسی رات ہم پر آسیب کا راز بھی فاش ہوگیا۔ جب ہم نے ایک خوش شکل

سانولی سلونی لڑکی کو کھڑکی کے راستے باہر جاتے ہوئے دیکھ لیا۔

"میرا خیال ہے یہ باشندی کی گرل فرینڈ ہے۔" لبنٰی نے خیال ظاہر کیا۔" اس لیے شاید یہ اپنی فلیٹ کی کھڑکیاں کھلی رکھتا ہے۔"

ہم نے کہا۔"مگراس کے فلیٹ میں تو چار پانچ کھڑکیاں ہیں جبکہ یہ ایک کھڑکی سے بھی کام چلاسکتاہے پھر کھڑکیوں کی اتنی زیادہ فضول خرچی کی کیاضرورت ہے؟"

اگلے دن ہماری پہلی منزل قاہرہ کا تاریخی میوزیم تھا۔ یہ ایک شاندار اور وسیع عمارت ہے۔ دنیا میں اس سے زیادہ پرشکوہ اور عالیشان میوزیم بھی موجود ہیں لیکن قاہرہ کے عجائب گھر کے اندر جواشیا نمائش کیلئے محفوظ رکھی گئی ہیں وہ کہیں اور دیکھنے میں نہیں آتیں۔ ہاں لندن کے میوزیم میں ایک حصہ قدیم مصر کے نوادرات کیلئے مخصوص ہے جہاں ممیاں اور فراعنہ کے عہد کا دوسرا سازو سامان نمائش کیلئے رکھاگیا ہے۔ لیکن قاہرہ میں ان نادر اشیا کی بہتات ہے۔ فرعونوں اور ان کی بیگمات کی سکڑی سمٹی ہوئی ممیوں کو دیکھ کر عبرت حاصل ہوتی ہے لیکن دوسرا سازوسامان اس قدر مرعوب کن ہے کہ اس عہد کے حکمرانوں کے جاہ وجلال اور طاقت واختیار کا بھی اندازہ ہوجاتاہے۔ اسلحہ ' تاج ' ملبوسات۔ اس زمانے میں گھوڑوں اور اونٹوں کو بھی لباس فاخرہ پہنائے جاتے تھے۔

ایک گھوڑے کی ممی بھی دیکھی جو اپنے ہی چاروں پیروں پر کھڑی ہے۔ اس پر کاٹھی لگام اور دوسرا تمام سازو سامان بھی سجا ہوا ہے۔ اس عہد کے ہتھیار ' زیورات ' ملبوسات 'سامان آرائش ہرچیز دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس قدر قدیم اشیا دنیا کے کسی اور میوزیم میں دیکھنے میں نہیں آتیں۔ انہیں دیکھ کر اگر امتداد زمانہ کااحساس ہوتا ہے تو ان مطلق العنان فرعونوں کی شان وشوکت بھی نگاہوں میں پھر جاتی ہے جوہزارہا سال پہلے اس خطہ زمین کے مختار مطلق تھے اور خود کو "خدا" کہتے تھے۔

شباب صاحب کوکلوپٹرا کی ممی کی جستجو تھی۔ ہرایک سے دریافت کررہے تھے کہ آخر کلوپٹرا کی ممی کہاں چھپاکر رکھی ہے؟

ہم نے کہا۔"کلوپٹرا کسی فرعون کی ملکہ ہوتی تو شاید اس کی ممی بھی بن جاتی مگر آپ کو اس کی ممی کی تلاش کیوں ہے؟"

بولے۔" میں سوچتاہوں کہ کلوپٹرا کے حوالے سے ایک نئی فلم بنائی

جائے۔"

جاوید صاحب نے فوراً مشورہ دیا۔"میرے خیال میں نیلو اس کردار کیلئے بالکل موزوں رہے گی۔"

حسن صاحب آہستگی سے بولے۔" وہ تو ٹھیک ہے مگر یہ سوچ لیجئے کہ اس فلم پر روپیہ بہت خرچ ہوگا' ہاں یہ ہوسکتاہے کہ آپ "ماڈرن کلوپٹرا" بنائیں۔"

یہ سن کر شباب صاحب سوچ میں پڑ گئے۔

قاہرہ کا یہ تاریخی میوزیم اپنے نوادرات کے اعتبار سے بے مثال ہے لیکن اسکی نگہداشت کا ویسا اہتمام نہیں ہے جیسا کہ یورپ کے عجائب گھروں میں دیکھنے میں آتا ہے۔ اس میوزیم کی اشیاء میں مغربی سیاح بہت زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ ہر چیز کو انتہائی غوروخوض سے دیکھتے ہیں ۔ ایک نہایت خوبصورت اور خوش لباس خاتون کو دیکھا کہ وہ ایک فرعون کی ملکہ کی ممی کا نہایت انہماک سے محدب شیشے کی مدد سے معائنہ کررہی تھیں سمجھ میں نہیں آیا کہ اس ممی میں وہ کیا تلاش کررہی تھیں۔

"شاید چہرے پر میک اپ تلاش کررہی ہیں کیونکہ اس زمانے میں تو خواتین بوڑھی ہوکربھی جوان اور تروتازہ ہی نظر آتی تھیں۔" حسن صاحب نے کہا۔

باشندی نے بتایا کہ اس عجائب گھر سے بہت سی بیش قیمت اشیا چوری ہوچکی ہیں جو دوسرے ملکوں میں فروخت کردی گئیں۔ عجائب گھر کی کئی منزلیں ہیں اور یہ عمارت بہت دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ ہر حصہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ بچوں اور جانوروں کی ممیاں بھی نہایت احتیاط سے رکھی گئی ہیں۔ اتنے بہت قدیم انسانوں کی ممیاں دیکھ کر ہمیں تو گھبراہٹ ہونے لگی۔ البتہ فرعونوں کے ملبوسات' سازو سامان' ہتھیار اور مختلف قسم کے زیورات دیکھ کر ان کے جاہ وجلال اور ذوق کا اندازہ ہوتا ہے۔

میوزیم سے باہر نکلے تو بخشش مانگنے والوں نے گھیرلیا۔ یہ بھی ان ہی لوگوں کے پسماندگان ہیں جن کی شان وشوکت کے آثار دیکھ کر ہم ابھی میوزیم سے باہر نکلے تھے۔

جاوید صاحب کہنے لگے۔" اگر فرعونوں نے اپنی قوم کی طرف توجہ دی ہوتی تو اس قوم کا آج یہ حال نہ ہوتا۔"

ہم نے کہا۔"آپ ہزاروں سال پہلے کے فرعونوں کی بات کررہے ہیں۔یہاں تو آج کے حکمراں بھی اپنی قوم کی طرف توجہ نہیں دے رہے پھر فرعونوں کی شکایت کیسی ۔ ان بے چاروں کو تو جمہوریت وغیرہ کا پتہ بھی نہیں تھا۔"

شباب صاحب کافی دیر سے سوچ میں کھوئے ہوئے تھے ۔ ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے اچانک بولے۔" یار۔ یہ بات ٹھیک ہے۔نیلو کلوپیٹرا بن کربہت اچھی لگے گی۔"

اس کا مطلب یہ تھا کہ شباب صاحب کا دماغ فلم سازی کے سلسلے میں کام کرنے لگاتھا جو قاہرہ میں انہیں مصروف رکھنے کا اچھابہانہ ثابت ہوسکتاتھا۔ورنہ ہم جن حالات سے دوچار تھے اس کے پیش نظرشباب صاحب مسلسل بے زاری میں مبتلا نظر آتے تھے۔ دنیا میں اگر کوئی چیزانہیں مصروف رکھ سکتی تھی تووہ "فلم" ہی تھی۔ اس کے سوا انہیں کسی چیز سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

باشندی صاحب تو ہم لوگوں کو قاہرہ کی مسجدیں دکھانے کیلئے بے تاب تھے جو ہم پہلے ہی دیکھ چکے تھے لیکن ہمارے ساتھیوں نے نہیں دیکھی تھیں لیکن جاوید صاحب کو بھوک ستانے لگی تھی۔ ظاہر ہے کہ مختصرساناشتا کرنے کے بعد ہم لوگ کافی دیر تک گھومتے رہے تھے۔ علی نے تجویز پیش کی کہ چاتیز کھاناکھایاجائے۔ قاہرہ میں ایسا ایساریستوران تھا جو خاص چینی کھانوں کیلئے مشہور تھااور مہنگا بھی بہت تھا۔ چینی کھانا ہم سب کو پسند تھا لیکن یہ صرف ہم ہی جانتے تھے کہ قاہرہ میں خالص چینی ریستوران کا کھانا کیسا ہوگا۔ اس لئے ہم نے اس کی شدید مخالفت کی اور جب ان لوگوں نے بہت اصرار کیا تو ہم نے انہیں ایک خالص چینی ریستوران کا قصہ سنایا جو بہت مہنگا تھا۔ اس ریستوران میں ابوالقاسم اور راجندر ناتھ ہمیں لے کر گئے تھے اور خاں صاحب اور بٹ صاحب بھی اس لالچ میں چلے گئے تھے کہ وہ چینی کھانے کے بہت شوقین تھے۔ ہم نے انہیں سمجھایا بھی تھاکہ ہمارے چاتیز ریستوران میں جو کھاناملتاہے وہ دوسرے ملکوں کے چینی کھانوں سے مختلف ہوتا ہے اور خاص طورپر خالص اور اصلی چینی کھانا تو ہمارے حلق سے اتر ہی نہیں سکتا مگر کسی نے ہماری بات پر کان نہ دھرا۔چنانچہ ہم شاہراہ جمہوریہ کے ایک شاندار چینی ہوٹل میں پہنچ گئے۔راجندر ناتھ نے ہمیں پہلے ہی خبردار کردیا تھا کہ وہاں کھانابہت مہنگا ہوتاہے مگر خاں صاحب سخاوت کے موڈ میں تھے انہوں نے کہا۔ "یار تھرڈ کلاس ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔کم ازکم

کھانا تو فرسٹ کلاس ہوٹل میں کھانا چاہیئے۔"

چنانچہ اس فرسٹ کلاس ریستوران میں پہنچ گئے۔ ظاہری ٹیپ ٹاپ اور شان وشوکت دیکھ کر ہی مرعوب ہوگئے۔ دبیز قالینوں کا فرش تھے جس پر چلتے ہوئے پیر دھنس جاتے تھے۔ ہر طرف خوبصورت آرائشی اشیاء اور آرٹ کے نمونے سجے ہوئے تھے ۔ فرنیچرانتہائی آرام دہ اور قیمتی تھا۔ ایک خاص بات راجندر نے یہ بتائی تھی کہ اس ریستوران میں نہ صرف ویٹریس خدمات سرانجام دیتی ہیں بلکہ ہر کھانے کے ساتھ ایک نئی ویٹریس نمودار ہوتی ہے۔ شاید یہ سن کر ہی خان صاحب اس ہوٹل میں جانے کیلئے بے قرار ہوگئے تھے۔

ریستوران کو جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا۔ یعنی ہر طرف خوش شکل اور اسمارٹ خواتین انتہائی دیدہ زیب لباسوں میں گھومتی پھر رہی تھیں۔ ہمیں میزوں تک لے جانے کا فرض بھی ایک خوبصورت خاتون نے سرانجام دیا اس پر ہالی ووڈ کی ایک ایکٹریس کا گمان گزرتا تھا۔ ان کا چہرہ مہرہ ' ان کے انداز اور برتاؤ سبھی سے یوں لگتا تھا جیسے اداکاری کررہی ہیں۔ ہم لوگوں کو ایک بڑی چوکور میز تک پہنچا کر وہ بڑی لگاوٹ سے مسکراتی ہوئی رخصت ہوگئیں۔ اس ماحول نے ہم سبھی کو مرعوب کردیا تھا۔

بٹ صاحب نے کہا۔"یوں لگتا ہے جیسے کسی فلم کی شوٹنگ میں حصہ لے رہے ہیں۔"

خاں صاحب فخریہ بولے۔" دیکھ لیا ہمارا انتخاب کبھی غلط نہیں ہوسکتا۔"

چند لمحے بعد خوشبو کا ایک جھونکا سا آیا اور اسکے ساتھ ہی ایک اور خوش انداز ویٹریس نے آکر سلیس انگریزی میں ہمیں خوش آمدید کہا اور مینو کی ایک ایک کاپی سب کی خدمت میں پیش کردی اور رخصت ہوگئیں۔ مینو انگریزی میں لکھا ہوا تھا مگر کھانوں کے نام خالص چینی تھے جن سے کچھ اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ بارہ پندرہ قسم کے تو سوپ ہی تھے اس کے علاوہ بھی کھانوں کی ایک بہت طویل فہرست تھی۔ مینو کیا تھا اچھا خاصا طویل مختصر ناول معلوم ہوتا تھا۔ ہماری سمجھ میں تو کچھ آیا نہیں۔ دوسروں کا بھی یہی عالم تھا۔ راجندر اور ابوالقاسم نے بتایا کہ اس سے پہلے وہ صرف ایک ہی بار یہاں آئے تھے اور کیا کھانا منگایا تھا یہ انہیں یاد نہیں تھا۔ سوپ تو درجنوں قسم کے تھے مگر کوئی مانوس نام نظر نہیں تھا ۔ اتنی دیر میں ایک اور حسین ویٹریس آرڈر لینے کے لئے

کاغذ قلم سنبھال کر تشریف لے آئی تھیں: انکی شکل وصورت کے پیش نظر تو وہ جتنی زیادہ دیر تک وہاں قیام کرتیں اتنا ہی بہتر تھا لیکن آداب واخلاق بھی آخر کوئی چیز ہے۔ اس لئے ہم نے ایک سوپ کے نام پر انگلی رکھ کر دو پیالے لانے کا آرڈر دیا اور کہا باقی کھانا ہم ذرا سوچ کر منگائیں گے۔ وہ مسکراہٹ بکھیرتی ہوئی رخصت ہوگئیں۔

خاں صاحب اس ماحول سے بہت متاثر تھے۔ کہنے لگے۔"اب تو جتنے دن بھی قاہرہ میں رہیں گے کم ازکم ایک وقت کھانا تو یہیں سے کھایا کریں گے۔"

ہم نے کہا۔"سنا ہے کہ یہ بہت مہنگا ہے۔"

بولے۔"پیسہ تو ہاتھ کا میل ہوتا ہے۔ انسان کو ٹھاٹ سے زندگی بسر کرنی چاہیئے۔ اور پھر ہوٹل کے خرچ سے جو ہم بچارہے ہیں وہ یہاں خرچ کیا جاسکتا ہے۔ اگر آپ لوگوں کو اعتراض ہے تو پھر چندہ کرلیا کریں گے۔"

سچی بات تو یہ ہے کہ اس ماحول نے سبھی کو مسحور کردیا تھا اس لئے ہم نے اور بٹ صاحب نے بھی مخالفت نہیں کی۔ اور دیواروں سے لٹکے ہوئے چینی انداز کے چھوٹے چھوٹے فانوس دیکھ کر ان کی مدح وستائش میں لگ گئے۔

چند لمحے بعد ایک اور خوشبودار ویٹریس ایک خوبصورت ٹرالی کھینچتی ہوئی نمودار ہوئیں۔ شکل وصورت کے اعتبار سے یہ بھی کچھ کم نہ تھیں لیکن مسکرانے کے معاملے میں سابقہ خواتین پر بازی لے گئی تھیں۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں میں سفید دستانے پہن رکھے تھے۔ بڑی نفاست کے ساتھ انہوں نے ٹرالی میں رکھا ہوا ایک ایک پیالہ دونوں ہاتھوں سے اٹھایا اور انتہائی نزاکت کے ساتھ ایک ایک پیالہ سب کے سامنے رکھ دیا۔اس اثناء میں کسے ہوش تھا کہ پیالے کی جانب نظر کرتا کیونکہ سبھی کی نظریں پیالہ بردار خاتون پر جمی ہوئی تھیں۔ جب وہ اپنی ٹرالی لے کر واپس گئیں تو کافی دور تک نگاہیں ان کا تعاقب کرتی رہیں۔ کسی نے ایک لفظ بھی نہیں کہا لیکن بہت کچھ کہہ دیا۔ اس کے بعد پیالوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ ہم تو دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ پیالے میں ہلکے سفید رنگ کا مشروب تھا جس میں بہت چھوٹی چھوٹی زندہ مچھلیاں تیر رہی تھیں۔ یہ منظر ناقابل اعتبار تھا ۔ یکا یک بٹ صاحب کی "لاحول ولاقوۃ" نے سب کو چونکا دیا۔ ہم سبھی اس سوپ کو دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔ زندہ مچھلیوں کا سوپ زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔ابھی فیصلے پر نہیں پہنچے تھے کہ وہی خاتون ایک بار پھر سراپا

نیاز بنی ہوئی نمودار ہوئیں جنہوں نے میزوں تک ہماری رہنمائی کی تھی۔ انہوں نے مطلع کیا کہ اپنے معزز مہمانوں کی فرمائش پر خصوصی کھانے بھی فوری طور پر تیار کر دیے جاتے ہیں۔ اگر آپ لوگ مناسب سمجھیں تو ایک نظر دیکھ لیں اور پھر اپنی پسند کے کھانوں کے آرڈر مرحمت فرمائیں۔

ہم سب اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ اس لئے کہ زندہ مچھلیوں سے نظریں چرانا چاہتے تھے۔ بہت دلکش انداز میں چلتی ہوئی وہ ایک طرف کو روانہ ہوئیں اور ہم سب ان کے پیچھے تعاقب میں چل پڑے۔ ہال خاصا وسیع اور پہلودار تھا۔ وہ ہمیں لے کر ہال کے ایک گوشے میں پہنچ گئیں۔ اور سامنے اشارہ کرکے فرمانے لگیں کہ آپ خود ہی ملاحظہ کرلیجئے اور پھر اپنی پسند سے آگاہ کیجئے ہماری نظروں کے سامنے شیشے کی دیوار تھی جس کی دوسری جانب دیواروں اور کانچ کی الماریوں میں زندہ کیکڑے' سانپ' کچھوے' مچھلیاں اور نہ جانے کون کون سی دریائی مخلوق موجود تھی۔ اندر سفید براق لباس پہنے ہوئے سروں پر سفید اونچی ٹوپیاں لگائے ہوئے باورچی بھی نظر آرہے تھے جوان زندہ چیزوں کو اٹھا اٹھا کر ان کی کاٹ چھانٹ میں مصروف تھے۔

ہم تو اخلاق و آداب کو فراموش کرکے فوراً واپس مڑ گئے۔ دوسرے حضرات نے ہمارا ساتھ۔ بٹ صاحب بار بار لاحول پڑھ رہے تھے۔ اور ہم سب کا جی متلانے لگا تھا۔ پہلے تو یہ سوچا کہ سیدھے باہر کا رخ کریں لیکن بل ادا کرنا بھی ضروری تھا۔ اپنی میز پر پہنچ کر ہم نے ان خاتون کو فوراً بل لانے کی ہدایت کی جو حیران پریشان ہمارے پیچھے پیچھے آگئی تھیں۔ ابوالقاسم نے انہیں بتایا کہ ہم لوگوں کو اچانک ایک ضروری اسائنمنٹ یاد آگئی ہے اس لئے فوری طور پر جانا ضروری ہے۔ وہ معذرت اور ہمدردی کرتی ہوئی واپس چلی گئیں۔ اور کچھ دیر بعد ایک اور طرح دار ویٹریس ایک سنہری ٹرے میں بل لے کر نمودار ہوئیں۔ بل کی رقم دیکھنے کا ہوش کس کو تھا؟ خاں صاحب نے جیب سے کچھ نوٹ نکال کر ٹرے میں ڈال دیئے اور باقی ٹپ کے طور پر رکھنے کی ہدایت دے کر چل پڑے۔ ہم لوگ ریستوران سے باہر تو پہنچ گئے تھے لیکن سب کی بھوک اڑ چکی تھی۔

ہم نے یہ واقعہ شباب صاحب وغیرہ کو گوش گزار کردیا اور ان سب نے خالص چینی کھانا کھانے کا ارادہ ترک کردیا۔ باشندی نے ایک مصری ریستوران میں چلنے کا مشورہ دیا۔ یہ زیادہ فاصلے پر نہیں تھا اور اچھا معقول ریستوران تھا۔ علی صاحب نے جاتے ہی ہم سے پوچھا کہ آپ کون سا گوشت کھانا پسند کریں گے؟

ہم سب نے حیران ہوکر انہیں دیکھا تو بولے کہ یہاں اونٹ کا اور گھوڑے کا گوشت بھی ملتا ہے۔ گھوڑے کے گوشت کے پارچے اور تکے نہایت لذیذ ہوتے ہیں۔

ہم نے کہا کہ بھائی ہمیں تو گھوڑا بھاگتا ہوا ہی اچھا لگتا ہے۔ اس لئے بکری وغیرہ ہی مناسب ہے۔ بکری کے گوشت کے تکے خاصے خوشبودار اور لذیذ تھے مگر مرچ مسالہ سے محروم لیکن پیٹ بھر گیا۔

مساجد دیکھنے دوبارہ ہم بھی ساتھ ساتھ گئے مگر زیادہ تر بخشش ہی دینے میں مصروف رہے۔ جامعہ ازہر کو دیکھ کر شباب صاحب بہت جذباتی ہوگئے۔ سامنے والے چوک میں کھڑے ہو کر بہت دیر تک عمارت کو دیکھتے رہے۔

جاوید صاحب نے کہا۔ "کیا بات ہے۔ یہاں شوٹنگ کرنے کا خیال ہے یا داخلہ لینے کا ارادہ ہے؟"

کہنے لگے۔ "یہ بہت تاریخی درس گاہ ہے۔ عالم اسلام کے لئے ایک یادگار کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے بارے میں بہت کچھ سنا اور پڑھا تھا۔ خوش قسمتی سے آج اس کا دیدار بھی ہوگیا۔"

آس پاس سے گزرنے والے لبادہ پوش علما قسم کے بزرگوں کو دیکھ کر بھی وہ بہت مرعوب اور متاثر ہوئے۔

ہم نے کہا۔ "ان سے عربی میں بات کریں۔ آخر آپ کی عربی اور ہماری عربی کے انداز میں کتنا فرق ہے۔"

ہم نے کہا۔ "تو پھر ان حالات میں دور دور سے دیکھ لینا ہی بہتر ہے۔"

الخلیل کے بازار کو بھی سب نے بہت پسند کیا۔ علی صاحب نے کبوتر کھلانے کی پیش کش کی مگر سب کا پیٹ بھرا ہوا تھا اور شباب صاحب نے کہا۔ "کبوتر اڑتے ہے اچھے لگتے ہیں۔"

حسن صاحب بولے۔ "اطمینان رکھیے جب آپ انہیں کھالیں گے تو پھر یہ نہیں اڑیں گے۔"

قدیم قاہرہ کی گلیوں اور ڈھکے ہوئے بازاروں سے بھی سب لطف اندوز

ہوئے ۔ لبنیٰ مختلف دکانوں کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتی رہیں مگر خریداری کا وقت
اور موقع نہ تھا اس لئے صبر کے سوا کوئی چارہ نہ تھا ۔ نوادرات کی دکانوں میں
خریداری کرنے سے ہم نے انہیں پہلے ہی منع کردیا تھا اس لئے کہ یہاں غیرملکی سیاحوں
کی کھال اتاری جاتی ہے اور ویسے بھی مول تول کرنے میں گھنٹوں لگ جاتے ہیں۔

مصری عورتیں چہرے پر جو نقاب یا حجاب ڈالتی ہیں وہ لبنیٰ کو بہت پسند آیا۔
اس نقاب میں وہی معاملہ ہے کہ بقول شاعر

صاف چھپتے بھی نہیں ، سامنے آتے بھی نہیں

مصری عورتوں کے ملبوسات کے بارے میں ہم پہلے ہی بتاچکے ہیں کہ ان میں کوئی
نزاکت یا نفاست نہیں ہوتی۔ مغربی لباس اسکرٹ وغیرہ پر مشتمل ہوتا ہے جس کے اوپر
سے بعض خواتین مصری لبادہ اوڑھ لیتی ہیں۔ لبنیٰ کا شلوار قمیض البتہ مصریوں کو بہت
پسند آیا۔ خواتین پلٹ پلٹ کر اسے دیکھتی تھیں اور لبنیٰ کا کہنا تھا کہ اش اش بھی کرتی
تھیں۔

اس رات باشندی نے ہم سب کو اپنی بہن کے گھر پر کھانے کی دعوت دی
تھی۔ باشندی کی بہن ایک متوسط درجے کے رہائشی علاقے میں رہتی تھیں اور ان کا
فلیٹ عمارت کی نچلی منزل پر تھا۔ ہم وہاں پہنچے تو باشندی کی بہن اور بھانجیاں منتظر
تھیں۔ انہوں نے خالص مصری کھانے پکائے تھے اور پاکستانی دستور کے مطابق نہ صرف
مہمانوں کو اصرار کرکے کھلا رہی تھیں بلکہ زبردستی پلیٹوں میں انڈیل بھی رہی تھیں۔
کھانا واقعی بہت لذیذ تھا۔ چاول کا مزہ ہمارے پلاؤ کی طرح تھا۔ تکے اور سالن بھی مزیدار
تھے۔ کبابوں کے علاوہ مچھلی کی بھی دو تین اقسام موجود تھیں۔ جاوید صاحب باربار
ہمارے کان میں پوچھ رہے تھے۔ کہ ان لوگوں نے کون سا گوشت پکایا ہے؟ ہم نے کہا
بھائی حلال گوشت ہی ہوگا۔ لذیز بھی ہے۔ اب اور کیا چاہئے؟ باشندی کی بہن اوران
کے بچے انتہائی پرخلوص اور بے تکلف تھے لیکن زبان کی مشکل درمیان میں حائل
تھی۔ وہ لوگ عربی کے سوا کوئی زبان نہیں جانتے تھے اور ہم سب عربی سے نابلد تھے۔
باشندی اور علی مترجم کے فرائض انجام دے رہے تھے۔
خدا جانے وہ صحیح ترجمہ بھی کررہے تھے یا من گھڑت ہی سنا رہے تھے۔ شکر ہے کہ اس
کھانے کااختتام مصری قہوے کے بجائے کافی پر ہوا جو بہت پرلطف تھی۔میزبان خواتین

کا اصرار تھا کہ دوبارہ بھی ضرور آئیں۔ ہم معذرت کررہے تھے کہ وقت کی بہت کمی
ہے ورنہ ضرور آتے لیکن ان کا اصرار بڑھتا جارہاتھا۔ آخر باشندی نے عربی میں ان سے
کچھ کہا جس کے بعد وہ لوگ مطمئن ہوگئے ۔ اور "تشکرتشکر" کہتے ہوئے سراپا سپاس
بن گئے۔

ہم نے باشندی سے انگریزی میں پوچھا کہ تم نے ان سے کیا کہاہے؟
بولا۔"آپ لوگوں کی طرف سے کہہ دیاہے کہ دوبارہ بھی ضرور آئیں گے۔
اگر یہ نہ کہتا تو یہ ساری رات دلیلیں دیتے رہتے اور آپ کا یہ بھی عذر نہ سنتے۔ یہ ہم
مصریوں کی عادت ہے کہ اپنی ہی کہے جاتے ہیں۔ مہمان کی ایک نہیں سنتے۔"
اس گھرمیں ہمیں ذرا بھی اجنبیت محسوس نہیں ہوئی۔ یوں لگ رہاتھا جیسے
کسی پاکستانی گھرانے میں بیٹھے ہیں۔ وہی بے تکلفی ، وہی خلوص اور ویسا ہی ماحول،
صرف زبان کا فرق تھا۔ وہ لوگ ہمارے نام سن سن کر بہت خوش اور حیران ہورہے تھے
کیونکہ یہ خالص عربی نام تھے۔
علی سفیان تو خیر تھا ہی عربی لیکن لبنیٰ کے نام پر بھی خواتین نے بہت خوشی کا
اظہار کیا۔ باشندی نے کہاکہ ہمارے ہاں پچاس فیصد سے زیادہ لڑکیوں کانام لبنیٰ
ہوتا ہے۔
جب ہم نے انہیں بچیوں کے بارے میں بتایا کہ ایک کا نام نادیہ اور دوسری
کا سارہ ہے تو ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی کیونکہ یہ بھی خالص عربی نام ہے۔ اس
زمانے میں وہاں ایک مشہور ہیروئن کا نام بھی نادیہ تھا۔
حسن مہدی بھی خالص عربی نام تھا۔ شباب اور رشید جاوید البتہ انہیں
قدرے ثقیل سے لگے۔ ہم نے انہیں بتایا کہ ہمارے ملک میں عربی نام بہت مقبول ہیں
لوگ عربی نہیں جانتے مگر قرآن سب پڑھتے ہیں اور بہت سے لوگ قرآن حفظ بھی
کرلیتے ہیں۔ مصریوں کیلئے یہ بھی ایک حیرت انگیز بات تھی کہ عربی نہ سمجھنے کے باوجود
ہم لوگ قرآن حفظ کرلیتے ہیں اور صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ باشندی نے انہیں
بتایا کہ پاکستانی بہت اچھا گاتے بھی ہیں۔ مطلب یہ کہ بہت اچھی قرات بھی کرتے ہیں۔
مختصر یہ کہ رات کے بارہ بج گئے اور وقت گزرنے کا احساس تک نہ ہوا حالانکہ ہم لوگ
ایک دوسرے کی زبان سے قطعی ناواقف تھے لیکن مذہب، ماحول، مزاج اور خیالات کی

ہم آہنگی کے باعث یوں لگتا تھا جیسے عرصہ دراز سے ایک دوسرے سے واقف ہیں۔ رخصت ہونے کا انداز بھی خالص پاکستانی تھا یعنی الوداع کہتے کہتے پندرہ بیس منٹ لگ گئے تب کہیں جاکر اس فلیٹ سے باہر نکلے۔

علی اور باشندی نے ہمیں یہ خوش خبری سنادی تھی کہ باشندی کے فلیٹ میں ہم لوگوں کا قیام صرف آج ہی رات اور ہوگا۔ اس کے بعد علی نے محکمہ سیاحت کی جانب سے سارا ڈیزرٹ کے نزدیک واقع گیسٹ ہاؤس میں ہم لوگوں کے دو روزہ قیام کا بندوست کردیا تھا۔ گیسٹ ہاؤس کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ بہت آرام دہ اور خوبصورت ہیں اور عین مغربی سیاحوں کی ضرورت کے مطابق بنائے گئے ہیں۔ اس خیال سے بہت مسرت ہوئی کہ ہم دو راتیں اہرام اور ابوالہول کے پہلو میں گزاریں گے۔ اور دنیا کے عظیم ترین صحرا کے کنارے قیام کریں گے۔ یہ سوچ کر ایک عجیب قسم کی خوشی اور فخر کا احساس ہوا۔ ایسے تاریخی مقامات پر جانا ہی کسی حیرت انگیز واقعے سے کم نہیں ہے۔ اور اگر وہاں قیام کرنے کا موقع بھی مل جائے تو اسے حسن اتفاق کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے۔

دیکھا جائے تو باشندی کی فلیٹ میں ہمیں کوئی تکلیف نہیں تھی۔ سوائے اس کے کہ دن کے وقت جب ہم کمروں میں قیلولہ کرنے کیلئے جاتے تھے تو تمام کھڑکیاں کھول دیا کرتے تھے مگر باشندی صاحب ایک ایک کرکے تمام کھڑکیاں بند کردیتے اور اصرار کرتے کہ ہم لوگ بھی ان کی طرح سر سے پیر تک کمبل لپیٹ کر سوئیں۔ ہمیں تو خیر پنکھے کے بغیر ہی مشکل سے نیند آتی تھی اس پر گر کمبل بھی لپیٹ لیا جاتا تو کیا حشر ہوتا۔

شباب صاحب اس کے اصرار پر ایک دن کہنے لگے۔ "اس کی بات ہرگز نہ ماننا ورنہ ہم لوگ دم پخت ہوجائیں گے۔" ویسے مصریوں کا گرمی سے مقابلہ کرنے کا یہ عجیب انداز ہمیں بہت پسند آیا۔

باشندی کے فلیٹ میں دوسرا مسئلہ غسل خانے کا تھا فلیٹ میں ایک ہی غسل خانہ تھا جسے باری باری استعمال کرنا پڑتا تھا۔ تولیے وہاں دستیاب ہوجاتے تھے اور باشندی غریب ہرروز ارجنٹ ڈبل ریٹ پر تولیے دھلوا کر غسل خانے میں رکھ دیا کرتا تھا۔ صابن کا مسئلہ خودبخود حل ہوگیا تھا۔ ناشتے کے لئے میٹھا اور سرخ تربوز اور قہوہ اور اس کے

بعد ٹوسٹ اور انڈا مل جاتا تھا۔ پہلے دن تو ہم نے باشندی کے تیار کیئے ہوئے فرائیڈ انڈے کھائے مگر دوسرے دن یہ فرض لبنیٰ نے اپنے ذمے لے لیا اور کم سے کم ڈھنگ کا ناشتا ملنے لگا تھا۔

ہم لوگ کافی رات گئے باشندی کے فلیٹ پر پہنچے۔ سب لوگوں نے کپڑے تبدیل کرنے کیلئے اپنے اپنے کمرے کی راہ لی۔ ہم نے اپنے بیڈ روم کا دروازہ کھولا تو اس کی دونوں کھڑکیاں حسب معمول چوپٹ کھلی ہوئی تھیں۔ بستر پر میگزین بکھرے ہوئے تھے اور کمرے میں بھینی بھینی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ ایک نمایاں تبدیلی یہ نظر آئی کہ سنگھار میز پر رکھے ہوئے ٹرانزسسٹر ریڈیو سے نغموں کی آوازیں بلند ہورہی تھیں۔ اس سے ظاہر ہورہا تھا کہ ہم لوگوں کی اچانک آمد سے بوکھلا کر وہ خاتون یا آسیب اتنی جلدی میں گھر سے رخصت ہوئیں کہ موسیقی بند کرنا بھی یاد نہ رہا۔ باشندی کو بھی اس بات احساس تھا کہ ہمارے کمرے میں ایک بن بلائی مہمان تشریف لاتی رہتی ہیں مگر وضع داری کے خیال سے نہ تو ہم نے کبھی اس سے کچھ پوچھا اور نہ ہی اس موضوع پر کوئی بات کی۔

ہم لوگ دوسرے دن کا پروگرام بنانے کیلئے ڈرائنگ روم میں اکٹھے ہوئے تو شباب صاحب اپنی شلوار اور کمربند لئے ہوئے پہنچ گئے۔ "بھئی کیا مصیبت ہے۔" انہوں نے بیزاری کا اظہار کیا۔

ہم میں سے کوئی نہ کوئی ان کی شلوار میں ازار بند ڈال دیا کرتا تھا۔ انہوں نے کچھ دیر بعد شلوار قمیض زیب تن کرکے دوبارہ ڈرائنگ روم کا رخ کیا اور کچھ دیر تک شلوار اور ازار بند کے مسئلے پر اظہار خیال کرتے رہے۔

جاوید صاحب نے کہا۔ "دیکھو بھئی۔ اس مسئلے کے دو ہی حل ہوسکتے ہیں۔"

"وہ کیا؟"

"یا تو تم شلوار پہننا ترک کردو یا پھر ازار بند کی جگہ اس میں الاسٹک استعمال کرو۔"

دوسرے دن کا پروگرام یہ تھا کہ ناشتے کے بعد علی صاحب محکمہ سیاحت کی وین میں ہمیں لینے کیلئے آئیں گے اور ہم سب اس میں سوار ہوکر رخصت ہوں گے۔ راتیں، قاہرہ میں ٹھنڈی ہوتی ہیں اس لئے بہت آرام سے سوئے۔ دوسرے دن حسب

معمول پہلے شیریں اور سرخ تربوز اور قہوے سے "بیڈ ٹی" کا آغاز کیا اور پھر ٹوسٹ اور انڈوں کا ناشتا کیا۔ ہمارے پاس جو صابن بچا تھا وہ بھی باشندی کی نذر کردیا جس کا اس نے تہہ دل سے شکریہ ادا کیا بلکہ آدھا صابن تحفے کے طور پر علی کو بھی پیش کردیا۔

صبح ساڑھے نو بجے علی اور ائرکنڈیشنڈ وین موجود تھی۔ ہم لوگوں نے اپنا سامان اس میں رکھا اور باشندی کے فلیٹ کو الوداع کہا۔

12

اہرام اعظم کے سامنے پہنچ کر ہم لوگوں کو اتار دیا گیا۔ علی اور باشندی بھی ہمارے ساتھ تھے۔ ڈرائیور کو ہدایت کی گئی کہ وہ ہمارا اسباب گیسٹ ہاؤس میں رکھنے کے بعد دوبارہ اسی جگہ واپس آجائے۔

اہرام اعظم کو ہم دوسری بار دیکھ رہے تھے مگر اس کے رعب داب اور ہیبت میں کوئی کمی محسوس نہیں ہوئی اور سب پر بھی مرعوبیت کی ایسی ہی کیفیت طاری تھی۔ عجیب منظر آنکھوں کے سامنے تھا۔ صحرا کے سینے پر ٹھوس پتھروں کے ٹکڑوں سے تعمیر کیا ہوا یہ تکونا سانوکدار اہرام آسمان کی جانب سر اٹھائے کھڑا تھا۔ ہر طرف سیاحوں کے غول کے غول گھومتے پھر رہے تھے۔ تصویریں اتاری جارہی تھیں۔ گائیڈ قصے کہانیاں سنانے میں مصروف تھے۔ ہزار ہا سال قدیم اہرام کے دامن میں آس پاس جدید ترین لباسوں میں ملبوس یورپین خواتین ایک تضاد پیش کررہی تھیں اور زمانے کی تبدیلیوں کی داستان بیان کررہی تھیں۔ ایک طرف ہزاروں سال پرانا مگر اپنے انداز میں نرالہ اور انوکھا مالخوردہ اہرام تھا اور دوسری طرف چمکتے دمکتے ہوئے گلابی سفید اور سنہری چہرے اور مرمریں جسم — جدید ترین کیمرے، قدیم ترین عمارت کے پیش منظر میں کھڑے ہوئے ماڈرن انسان کی تصویریں بنانے میں مصروف تھے یہاں پیشہ ور فوٹوگرافر بھی

منڈلاتے رہتے تھے ۔ جس کسی کے پاس کیمرہ نہ ہو فوراً" اس کے پاس پہنچ کر اسے یادگار اور تاریخی تصویر بنوانے کا مشورہ دیتے ہیں اور منہ مانگے دام وصول کرتے ہیں ۔ تصویریں بنانے میں خواتین بہت سرگرم اور پیش پیش تھیں۔ اہرام کے پتھروں پر بیٹھ کر' کھڑے ہوکر اور لیٹ کر مختلف انداز میں تصاویر بنوائی جاتی تھیں۔ ہر شخص کی خواہش تھی کہ اہرام کے اندر جائے مگر وہاں کے متعلق جو داستان سنی تھی اس کے بعد زیادہ تر لوگ تو ڈیوڑھی سے ہی لوٹ کر آجاتے۔ ہمارے سامنے چند بہادر اور مہم جو غیر ملکی حضرات سرنگ کے اندر بھی چلے گئے۔ خدا جانے بعد میں ان کا کیا حشر ہوا۔ ہم تو خونو کے اہرام کے آس پاس کا میلہ دیکھنے میں لگے ہوئے تھے۔ سیاح موج در موج پھر رہے تھے اور ان کی وابستگی کیلئے مقامی لوگ بھی موجود تھے۔ مصر کے قدیم سازوں کو بجاتے ہوئے سازندے' قدیم مصری لباسوں میں لپٹے ہوئے 'گزرے ہوئے زمانے کو آواز دیتے ہوئے نظر آتے تھے۔ ان کے اردگرد سیاحوں کا مجمع تھا۔ من چلی خواتین تالیاں بجابجاکر موسیقی کی آواز پر رقص کررہی تھیں اور اس تماشے کو دیکھنے کیلئے بھی ایک خلقت جمع تھی۔ غیر ملکی سیاحوں کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ کوئی ایک ہرم بھی دیکھنے سے نہ رہ جائے اس لئے وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ گھومتے پھرتے ہیں۔ یہیں اونٹ اور ساربان بھی نظر آئے۔ سانڈنیاں زیورات اور لباس سے سجی اور بنی سنوری ٹھمک ٹھمک کر چلتیں تو ان کے پیروں میں بندھے ہوئے گھنگھروں کی موسیقی صحرا میں بکھر جاتی ۔ ان کے گرد سیاحوں کا مجمع تھا ۔ سب لوگ باری باری ان پر سوار ہوکر تصویریں بنوا رہے تھے۔ ہم نے بھی تصویریں بنوائیں اور اونٹ پر سواری بھی کی مگر شباب صاحب دور کھڑے رہے۔ سب نے بہت اصرار کیا تو اونٹ کے سامنے کھڑے ہوگئے اور تصویر بنوالی مگر اس پر سواری کے لئے رضامند نہیں ہوئے۔

"بھئی یہ ایسا جانور ہے جس کی کوئی کل سیدھی نہیں ہوتی۔"

ساربان اچھی خاصی انگریزی جانتے تھے۔ کم از کم اپنا مفہوم تو بخوبی سمجھا دیتے تھے۔ انہوں نے شباب صاحب کو بتیرا سمجھایا کہ اونٹ کی سواری بالکل بے ضرر ہوتی ہے مگر شباب صاحب کسی طرح اونٹ پر بیٹھنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ اس بارے میں انہیں مختلف قسم کے اعتراضات تھے۔ مثلاً" بدشکل جانور ہے۔ انتہائی بے ہنگم اور بے ڈول جسم ہے' ہر وقت منہ چلاتا رہتا ہے یوں لگتا ہے جیسے چیونگم کھارہاہے۔ ایک وقت میں نہ کھڑا ہوتا ہے اور نہ بیٹھتا ہے ۔ قسطوں میں سارے کام کرتا ہے۔ اس کا قد بہت اونچا ہے۔ اگر اوپر سے گر گئے تو ہڈی پسلی ٹوٹ سکتی ہے وغیرہ وغیرہ۔"

اونٹ کے بارے میں ان کے تکنیکی اعتراضات بجا مگر ہم سب نے کہا کہ چلئے اونٹ کو رہنے دیجئے کم از کم کسی گدھے پر تو سواری کرلیجئے۔ آخر قاہرہ کے سفر کی کوئی یادگار تو ہونی چاہئے۔

کہنے لگے ۔" آپ نے گدھے پر سواری کرلی ۔ بس یہی کافی ہے۔"

ہم سب نے تو باری باری اونٹ اور گدھے پر بڑے اہتمام سے سواری کی کیونکہ یہ زندگی میں پہلا موقع نصیب ہوا تھا اس کے بعد پھر کبھی اتفاق نہیں ہوا۔

علی نے ہماری ملاقات ساربان سے کرائی۔ وہ مصری لباس میں تھا اور اچھی خاصی انگریزی بولتا تھا۔ وہ پچھلے بیس بائیس برسوں سے اہرام مصر کے سائے میں سیاحوں کو اونٹ کی سواری کرارہاتھا۔ اچھی خاصی کمائی ہوجاتی تھی۔جب اسے معلوم ہوا کہ ہم پاکستان سے آئے ہیں تو فوراً" ہاتھ تھام کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے بشیر ساربان کا حوالہ دیا اور اس کی خوش نصیبی پر رشک کرتا رہا کہ امریکی صدر جانسن کی اس سے ملاقات ہوگئی اور صدر "جانسن نے اسے امریکا کے دورے کی دعوت دے دی اور انعام وکرام بھی دیا۔"بس حبیبی یہ بھی اپنی اپنی قسمت کی بات ہے۔"

ہم نے کہا۔"بھائی آپ مایوس نہ ہوں ۔ دراصل اس سے پہلے آپ کے ملک کے تعلقات امریکا سے خاصے کشیدہ رہے ہیں۔ اب صدر سادات کے آنے کے بعد اچانک تعلقات میں گرمجوشی پیدا ہوگئی ہے۔ امریکی امداد اور اسلحہ خوب آرہاہے۔ ہم نے شہر میں دیکھاہے کہ ہر جگہ تعمیری کام ہورہاہے۔ اب یہ امید ہوچلی ہے کہ کوئی امریکی صدر قاہرہ بھی آجائے گا اور ممکن ہے کہ آپ کے اونٹ پر سواری بھی کرے ۔ اہرام کو دیکھنے کیلئے تو سبھی آجاتے ہیں۔ آپ کو ایسا موقع ملے تو بالکل ہاتھ سے نہ گنوایئے گا اور سے بصدر جانسن اور بشیر ساربان کی کہانی یاد دلاکر اپنے دورہ امریکا کا بندوبست کرلیجئے گا۔"

وہ اداس ہوگیا ۔ اپنی پیشانی پر ہاتھ مارا اور کہا۔"یااخی۔ ہماری ایسی قسمت کہاں ۔ امریکی صدر کو اہرام دیکھنے کی فرصت ہی کہاں ہے؟ نہ وہ یہاں آئے گا نہ ہماری تقدیر کا ستارہ جگمگائے گا۔"

اسکی مایوسی پر ہمیں بہت دکھ ہوا مگر سوائے تسلی دینے کے اور کیا کرسکتے تھے۔ امریکی صدر کو قاہرہ بلا کر اس سے ملاقات کرانا ہمارے بس سے باہر تھا۔ ہماری دلجوئی سے وہ بہت خوش ہوا اور اصرار کرنے لگا کہ کچھ دیر کیلئے میرے گھر چل کر مجھے مہماں داری کا موقع دیجئے۔ ہمارے پاس وقت کی کمی تھی مگر علی اور باشندی نے بھی سفارش کردی اور کہاکہ اس کا گھر بالکل نزدیک ہے۔ اس طرح آپ کو عام مصریوں کی طرز رہائش سے بھی واقفیت حاصل ہوجائے گی۔ اس ساربان کا نام اسماعیل باقری تھا۔ اس نے فوراً اپنے اونٹ کی رسی ایک ساتھی کو تھمائی اور ہمارے ساتھ چل پڑا۔ قریب ہی ایک آبادی میں وہ رہتا تھا۔ یہ غریبوں کی بستی تھی۔ زیادہ تر لوگ اونٹ اور گدھوں کی سواری کرانے کا پیشہ کرتے تھے۔ کچی سی بستی تھی۔ گھر بھی مٹی کے بنے ہوئے تھے اور گلیاں اسی طرح گندی تھیں جیسی کہ ایسی آبادیوں میں ہمارے ملک میں بھی ہوتی ہیں۔

دروازے پر ایک پردہ سا پڑا ہواتھا۔ اس نے اندر پردہ کرانے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی اور ہمیں پردہ اٹھاکربراہ راست اندر لے گیا۔ اندر صحن اور دو کمرں پر مشتمل یہ گھر خاصا صاف ستھرا تھا۔ ہمیں ایک کمرے میں چٹائی پر بٹھایا گیا اور قہوے کے ساتھ مٹھائی بھی پیش کی گئی۔ اسماعیل کی بیوی نے فوراً بے تکلفی سے باتیں شروع کر دیں۔ وہ ہم سے مخاطب تھی مگر ہمارے پلے ایک لفظ بھی نہیں پڑ رہا تھا۔ ہماری طرف سے اسماعیل ہی جواب دیتا رہا۔ دو نوجوان لڑکیاں بھی خاطرمدارات میں مصروف تھیں۔ اسماعیل نے انہیں بڑے فخریہ انداز میں بتایا کہ یہ لوگ بشیر ساربان کے ملک پاکستان سے آئے ہیں۔ یہ سن کر وہ اور بھی زیادہ مرعوب ہو گئیں اور مزید خاطرداری کے پیش نظراونٹنی کادودھ بھی پیالوں میں ڈال کرلے آئیں۔

شباب صاحب کہنے لگے۔" دیکھ لو بشیر ساربان کی وجہ سے ہم لوگوں کی کتنی خاطرداری ہو رہی ہے۔"

واقعی یہ بھی عجیب بات ہے کہ مصری ساربانوں کے حلقے میں ہم بشیر ساربان کے حوالے سے پہچانے گئے۔ کچھ دیر میں آس پاس سے کچھ اور لوگ اور عورتیں بھی آگئیں۔ بچوں نے ہمارے گرد مجمع لگا لیا اور عربی خدا جانے کیا کیا کہتے رہے۔ ظاہر ہے کہ ہم پر رشک کر رہے ہوں گے کہ بشیر ساربان کے ملک سے ہمارا

تعلق ہے جو امریکی صدر کا ذاتی دوست اور امریکا کی سیر بھی کر چکا ہے۔

ہم نے کہا۔" ایک بات ہم مان گئے ہیں۔ صدر ایوب خان کی کوئی اور خوبی یا د ہو یا نہ ہو مگر ان کی بدولت بشیر ساربان کو اور اس کے طفیل میں ہمیں جو عزت ملی ہے وہ بھی کسی کارنامے سے کم نہیں ہے۔"

اسماعیل کے گھر والوں نے بتایا کہ انہوں نے اہرام کو دور دور ہی سے دیکھا ہے۔ کبھی نزدیک جانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ بلکہ ان کی سمجھ میں یہ بات بھی نہیں آتی تھی۔ کہ آخر دنیا بھر کے لوگ اینٹوں اور پتھروں کے یہ ڈھیر دیکھنے کے لیے کیوں آجاتے ہیں؟ ہم کیا کہہ سکتے تھے۔ سوائے اس کے کہ گھر کی مرغی دال برابر ہوتی ہے۔ اہرام مصران لوگوں کیلئے پتھروں اور روڑوں کے ملبے کے سوا کچھ نہ تھا۔ البتہ اس بات کا انہیں اعتراف تھا کہ ان کی بدولت ان کو روٹی مل جاتی ہے۔

اسماعیل تو ہمیں بشیر ساربان کے لئے اونٹ کی کھال سے بنا ہوا ایک تحفہ بھی دینے پر اصرار کررہاتھا مگر ہم نے معذرت کرلی اور بتایا کہ ہماری بشیر ساربان سے شناسائی نہیں ہے۔

وہ حیران رہ گیا۔" حیرت ہے۔ آپ اسی ملک میں رہتے ہیں بشیر ساربان سے ملاقات نہیں ہوئی۔" وہ بہت دیر تک ہماری اس محرومی پر افسوس کرتارہا اور سرہلاتا رہا۔

اہرام تو دیکھ لیے تھے۔ خوفو کا ہرم اعظم بھی کئی بار دیکھ چکے تھے۔ ابوالہول کا مجسمہ بھی ملاحظہ کرلیاتھا بلکہ اس کے سامنے کھڑے ہوکرتصویریں بھی بنوالی تھیں۔ شام ہونے لگی تھی۔ باشندی اور علی کا اصرار تھا کہ کچھ دیر بعد روشنی اور آواز کاشو ہونے والا ہے۔وہ ہمیں ضرور دیکھنا چاہیے۔ ہم نے بھی اس کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا اس لئے اشتیاق تھا مگر شباب صاحب تھک گئے تھے۔ گرمی نے الگ پریشان کرر کھا تھا۔

کہنے لگے۔"یار تم بھی خوب چھوڑتے ہو۔یہ بے جان چیزیں کس طرح کہانی سناتی ہیں؟"

ہم نے کہا۔" یہ واقعی قابل دید پروگرام ہے۔ اس موقع پر اہرام اور ابوالہول اپنی زباں سے اپنی کہانی سناتے ہیں۔"

دوسرے لوگوں نے بھی اتنا اصرار کیا کہ شباب صاحب بالآخر مان گئے۔

صحرا میں جوں جوں شام ڈھل رہی تھی' موسم خوشگوار ہو رہا تھا۔ ہوا کے جھونکوں میں ٹھنڈک سی پیدا ہوگئی تھیں۔ باشندی نے بتایا کہ رات کے وقت تو یہاں باقاعدہ سردی لگتی ہے۔ ابوالہول کے مجسمے کی دوسری جانب ایک بہت کشادہ اوپن ائر تھیٹر بنا ہوا ہے۔ بڑے سلیقے سے اور ترتیب سے رنگین کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ آن تمام کرسیوں پر جاکر بیٹھ گئے۔ اسوقت تک دوسرے لوگ نہیں آئے تھے اس لئے ہم آپس میں باتیں کرتے رہے۔ اچانک ایک مصری بزرگ عصا ہاتھ میں لیے نمودار ہو۔۔ وہ سوٹ پہنے ہوئے تھے۔ گلے میں بوٹائی لگی تھی۔ آنکھوں پر عینک تھی۔ ساٹھ سال کی عمر ہوگئی مگر صحت ایسی کہ مرد چالیس سالہ نظر آرہے تھے۔ خاص بات یہ تھی ـ انہوں نے سر پر سرخ ترکی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ ساری دنیا میں اور ہمارے ملک میں یہ ترکی ٹوپی کے نام سے مشہور ہے۔ کسی زمانے میں یہ برصغیر میں شرفا کی پہچان سمجھی جاتی تھی مگر انگریزی دور حکومت آیا تو رفتہ رفتہ متروک ہوگئی ۔ اب تو چند پرانے لوگ ہی ترکی پہنے ہوئے نظر آتے ہیں ورنہ پنجاب میں شلوار قمیض ' اچکن اور سوٹ کے ساتھ اس کا استعمال عام تھا ۔ مصریوں میں بھی کسی زمانے میں ترکی ٹوپی کا رواج تھا۔ اس کا سبب غالباً"یہ تھا کہ شاہ فاروق کے جد امجد جنہوں نے مصر کی بادشاہت سنبھال لی تھی ترک تھے اور اپنے لباس اور کلچر پر فخر کیا کرتے تھے۔ ابتدائی زمانہ ، میں تو یہ لوگ عربی سے بھی قطعاً نابلد تھے ۔ شاہ فاروق بھی اکثر ترکی ٹوپی استعمال کیا کرتے تھے۔ لیکن اب مصر میں بھی ترکی ٹوپی معدوم ہوگئی ہے۔ یہ پہلے بزرگ تھے جو ہمیں قاہرہ میں ترکی ٹوپی پہنے ہوئے نظر آئے تھے۔ انہوں نے چاروں طرف ، نظریں دوڑائیں اور پھر اسی طرف چلے آئے۔ جس طرف ہم لوگ بیٹھے تھے۔

"اہلاً" وسہلاً"۔" کے بعد انگریزی میں تعارف ہوا تو پتا چلا کہ خاصے دلچسپ آدمی ہیں۔ انہوں نے ہمارے ساتھ والی کرسی پر بیٹھنے کی اجازت طلب کی اور بیٹھ گئے پھر کہنے لگے۔ "آپ شاید حیران ہوں گے کہ ہر طرف بے شمار کرسیاں پڑی ہوئی ہیں مگر میں آپ کے پاس آکر بیٹھ گیا ہوں۔"

ہم نے کہا۔ "بالکل نہیں۔ ہمارے لئے تو یہ خوشی کی بات ہے۔"

بولے "دراصل آس پاس کوئی بیٹھا نہیں تھا جس سے اجازت لی جاتی۔"

اس کے بعد خود ہی ایک لطیفہ سنایا کہ ایک تھیٹر ہال میں ایک واحد تماشائی بیٹھے ڈراما دیکھ رہے تھے۔ جب ڈراما ختم ہوا تو وہ مینجر کے پاس گئے اور بولے کہ آپ کی پیچھے والی سیٹیں بہت نیچی ہیں۔ مسلسل گردن اٹھا کر بیٹھنا پڑتا ہے۔ میری تو گردن ہی اکڑ گئی ہے۔"

مینجر نے کہا۔" آپ اجازت لے کر کسی اور کرسی پر کیوں نہیں بیٹھ گئے

بولے "سارے ہال میں میرے سوا کوئی موجود ہی نہیں تھا اجازت کس لیتا۔

یہ کہہ کر وہ مسکرائے اور اپنے خوبصورت مصنوعی دانتوں کی نمائش کرنے لگے۔ ان کا خیال تھا کہ ہم لوگ وقت سے پہلے آگئے ہیں۔ کہنے لگے۔" میں تو اس لئے آگیا ہوں کہ مسز کے ساتھ جھگڑا ہوگیا تھا۔ غصے میں گھر سے نکل کر چلا آیا مگر آپ لوگ کیوں اتنی جلدی آگئے؟"

ہم نے بتایا کہ ہم اہرام اور ابوالہول دیکھ رہے تھے جب فارغ ہوئے تو ادھر چلے آئے۔

انہوں نے اپنا نام ہاشم الخیری بتایا۔ کسی زمانے میں محکمہ تعلیم میں افسر تھے۔ اب ریٹائر ہوچکے تھے اور پر سکون زندگی گزار رہے تھے۔ وہ پرانے خیالات کے آدمی تھے۔ مصر کے انقلاب کے سخت مخالف تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ حکومت کرنا تو بادشاہوں کو ہی زیب دیتا ہے۔ جنرل نجیب اور کرنل ناصر وغیرہ نے بلاوجہ شاہ فاروق کا تختہ الٹ دیا اور سارا نام خراب کردیا۔

ہم نے کہا۔ "کرنل ناصر تو ساری عرب قوم کے رہنما تھے۔"

کہنے لگے ۔" جی ہاں ۔انہوں نے قوم پرستی کو بہت اچھالا تھا مگر مشرق وسطی اور افریقہ کی کوئی قوم بھی اس پر رضامند نہیں ہوئی ۔ عرب ہونا علیحدہ بات ہے مگر یہ کہنا کہ سارے عرب ایک قوم ہیں اس لیے ایک ہی نظام کے تابع ہو جائیں بالکل غلط ہے۔"

بولے۔" قوم پرستی بھی ایک فتنہ ہے یہ انسانوں میں فساد ڈال دیتی ہے ۔ اس کے پیچھے دشمنوں کی سازش کار فرما ہوتی ہے ۔ اب یہی دیکھ لیجیے کہ عثمانی ترکوں کے عہد میں یہ خطہ کس قدر ترقی یافتہ اور خوشحال تھا مگر مغرب والوں نے عربوں کو بہکایا اور کہا کہ عربوں پر عربوں کی حکمرانی ہونی چاہیئے۔ بہت سے لوگ لالچ میں ان کے ملاوے میں آگئے اور الگ الگ حکومتیں بنالیں مگر سب کے سب مغرب والوں

کے دست نگر ہیں۔ اگر یہاں ایک ہی حکومت ہوتی تو اس علاقے کا نقشہ ہی بدلا ہوا ہوتا۔"
کافی دیر تک وہ مصری انقلاب کو برا بھلا کہتے رہے پھر کہا۔ "عرب نیشنلزم نے ہمیں آخر دیا کیا ہے؟ فلسطین پر یہودیوں کا قبضہ ہوگیا۔ اور عرب علاقوں پر بھی ان کا تسلط ہے۔ اس نیشنلزم سے حاصل کیا ہوا؟"

ہم سب ان کی باتوں پر سعادت مندی سے سرہلاتے رہے مگر ان کے جذبات ابھی تک بھڑک رہے تھے۔" یہ دیکھ لیجئے ۔ اہرام' ابوالہول اور دوسری یادگاریں عربوں کی بنائی ہوئی تو نہیں ہیں؟ فرعون بھی عرب نہیں تھا مگر ہم پر کتنا بڑا احسان کرگئے ہیں کہ ہزاروں سال گزرنے کے بعد بھی ہم ان کی چھوڑی ہوئی یادگاروں سے دولت کماتے ہیں۔ تیل ہمارے پاس ہے نہیں ۔ اگر اہرام بھی نہ ہوتے تو کوئی پلٹ کر بھی ادھر نہ دیکھتا۔

کافی دیر تک وہ گرجتے برستے رہے۔ اتنی دیر میں آہستہ آہستہ لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا انہیں ایک اور مصری بزرگ نظر آگئے تو وہ ہم سے اجازت لے کر ان کے پاس چلے گئے۔

جاوید صاحب نے کہا۔" شکر ہے کہ انہیں کوئی دوسرا شکار مل گیا ورنہ ہماری خیر نہیں تھی۔"

ابھی چاروں طرف پوری طرح اندھیرا نہیں پھیلا تھا مگر اوپن ائیر تھیٹر میں روشنیاں جل گئی تھیں۔ آنے والوں میں حسب توقع مغربی سیاحوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ یکایک کسی نے ہمیں نام لے کر پکارا۔ دیکھا تو فاروقی صاحب کھڑے ہوئے تھے۔فاروقی صاحب لاہور سے ایک سہ روزہ اور غالباً" ہفت روزہ بھی نکالا کرتے تھے۔ ان سے زیادہ ملاقات تو نہ تھی مگر کبھی کبھی ملنا ہوجاتا تھا مگر وہ اتنے خلوص اور گرم جوشی سے ملے کہ ہمیں اپنی یاداشت پر شک ہونے لگا۔

"کہاں ٹھہرے ہو؟ ہمارے ساتھ کیوں نہیں ٹھہرے؟ اور کون کون آیا ہے۔ کب سے آئے ہوئے ہو؟"

ہم نے اپنے ساتھیوں کی طرف اشارہ کیا۔ ایک لمحے کیلئے تو وہ ذرا ٹھٹکے مگر پھر بولے۔"کوئی بات نہیں ۔ آپ کے ساتھ ان سب کو بھی مہمان رکھا جاسکتا ہے۔"
اس فراخ دلی کی وجہ یہ تھی کہ وہ بذات خود قاہرہ میں مہمان تھے۔ احمد سعید کرمانی صاحب اس زمانے میں مصر میں پاکستان کے سفیر تھے اور فاروقی صاحب ان ہی کے سمان کے طور پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ انہوں نے احمد سعید کرمانی صاحب سے بھی ملاقات کرائی۔ کرمانی صاحب سے لاہور میں ہماری ملاقات ہوچکی تھی مگر بطور سفیر یہ ان کی پہلی ملاقات تھی ۔ وہ کیونکہ سفیر تھے اس لئے پروٹوکول کے تحت انہیں ایک مخصوص جگہ پر بٹھایا گیا تھا۔ آس پاس سفارتی عملے کے افراد اور سیکیورٹی والے بھی تھے۔

کچھ دیر بعد چاروں طرف اندھیرا چھاگیا اور تھیٹر ہال کی تمام روشنیاں گل ہوگئیں۔ سارا ماحول تاریکی میں ڈوب گیا۔ اس کے بعد ایک جانب سے ایک بارعب مردانہ آواز ابھری۔ یہ ابوالہول کی آواز تھی۔ ابوالہول نے اپنی زبانی قدیم مصر کی کہانی شروع کردی۔ جیسے جیسے وہ کہانی سنا رہا تھا۔ موسیقی کا تاثر بھی کم وبیش ہوتا جارہا تھا اور یکے بعد دیگرے مختلف عمارتوں پر روشنی نمودار ہونے لگی تھی۔ یہ ایک مسحور کن اور انوکھا سماں تھا۔ کھلے آسماں اور کھلے صحرا کی وسعتوں میں حد نگاہ تک پھیلے ہوئی تاریخی مقامات ایک ایک کرکے اجاگر ہورہے تھے۔ کبھی اس آواز میں جاہ وجلال پیدا ہوجاتا' کبھی دکھ اور درد کی کیفیت محسوس ہوتی تھی۔ابوالہول یہ سنا رہا تھا کہ قدیم زمانے میں فرعون کس طرح حکمرانی کرتے تھے پھر رفتہ رفتہ دوسرے لوگ بھی مصر میں آئے اور حکمراں بنے ۔ اس گفتگو کا خلاصہ یہ تھا کہ دنیا میں کسی چیز کو ثبات نہیں ہے۔ لیکن خوفو کا ہرم اور ابوالہول کا مجسمہ آج بھی اپنی جگہ پر موجود ہے۔ اور آنے والے وقتوں میں بھی دنیا والوں کے لئے یہ دیدہ عبرت کا نشان بنا رہے گا۔

"لائٹ اینڈ ساؤنڈ" شو دنیا کے سبھی تاریخی شہروں میں ہوتے ہیں لندن میں ' پیرس میں ' روم میں' ویانا میں مگر جو بات اہرام مصر کے سامنے پیش کیئے جانے والے لائٹ اینڈ ساؤنڈ شو میں ہے وہ کہیں اور دیکھنے اور محسوس کرنے میں نہیں آتی اور یہ ممکن بھی نہیں ہے۔ کسی اور جگہ حد نگاہ تک پھیلا ہوا کینوس بھی نظر نہیں آتا اور نہ ہی الف لیلائی داستانیں اس قدر پراثر اور مرعوب کن آواز میں پیش کی جاتی ہیں۔ یہ اس ماحول اور مقام کی ہیبت اور عظمت ہے جو دیکھنے اور سننے والوں کو مرعوب کردیتی تھی ۔ رفتہ رفتہ اہرام ابوالہول اور دیگر یادگاروں کی روشنیاں ایک ایک کرکے بجھ گئیں اور تھیٹر ہال میں روشنیاں جگمگانے لگیں۔ لیکن اس منظر اور آواز نے جو سحر طاری کردیا تھا اس کے اثر سے باہر آنا بہت دیر تک ممکن نہ تھا۔ یہ تاثر بعد میں بھی کئی دن تک قائم رہا۔ وہ منظر آنکھوں میں سمایا رہا اور وہ بارعب اور پر ہیبت آواز کانوں میں گونجتی رہی ۔ اس زمانے میں آڈیو کیسٹ کا رواج نہیں تھا لیکن ہم نے اس پروگرام کے

ریکارڈ خرید لیے اور گاہے گاہے انہیں سنتے بھی رہے مگر یہ اندازہ ہوا کہ محض آواز سے کام نہیں چل سکتا۔ جب تک کہ وہ منظر اور ماحول بھی نگاہوں کے سامنے نہ ہو یہ داستان متاثر نہیں کرسکتی۔

شو تو ختم ہوگیا مگر کافی دیر تک لوگ اپنی سیٹوں پر مبہوت اور مسحور بیٹھے رہے۔ کچھ دیر بعد اس تاثر سے باہر نکلے تو رخصت ہونے لگے۔ ہم نے بھی فاروقی صاحب اور احمد سعید کرمانی صاحب کو الوداع کہا۔ مصری بزرگ نظر نہیں آئے۔ وہ شاید یہ کہانی سن کر دوبارہ ابوالہول اور خوفو کے اہرام کی طرف نکل کھڑے ہوئے ہوں گے۔ وہ ماضی میں خوش رہنے والے آدمی تھے۔ نئی دنیا کی نت نئی باتیں انہیں پسند نہیں تھیں مگر حالات کا جبر انہیں اس نئے زمانے میں زندہ رہنے پر مجبور کر رہا تھا۔

پارکنگ میں محکمہ سیاحت کی وین ہماری منتظر تھی۔ علی صاحب ہمیں فوری طور پر گیسٹ ہاؤس لے جانا چاہتے تھے۔

"مگر کھانے کا کیا ہوگا؟" ہم نے پوچھا۔

وہ مسکرانے لگے۔ "کھانے کا بھی وہیں بندوبست ہے آپ پریشان نہ ہوں۔"

گیسٹ ہاؤس اس جگہ سے زیادہ دور نہیں تھے۔ یہ گیسٹ ہاؤس کسی ایک عمارت کا نام نہیں تھا بلکہ صحرا میں بہت دور تک مختلف عمارتیں پھیلی ہوئی تھیں۔ ہر عمارت ایک مکمل یونٹ تھی۔ بیڈ روم، ڈرائنگ روم، غسل خانہ اور ایک برآمدہ۔ کوئی گیسٹ ہاؤس ایک کمرے پر مشتمل تھا کوئی دو یا تین کمروں پر مشتمل تھا۔ یہ سب بہت اچھے فرنیچر سے آراستہ تھے۔ قطاروں میں دور تک یہ عمارتیں بنی ہوئی تھیں اور کھلے صحرا میں عجیب منظر پیش کر رہی تھیں۔ بہت سی عمارتوں میں روشنیاں بھی جل رہی تھیں۔ ہمارے لئے دو دو بیڈ روم کے تین گیسٹ ہاؤس مخصوص کر دیئے گئے تھے۔ باشنزی کے فلیٹ کے بعد یہاں رہنا عیاشی سے کم نہ تھا۔

گیسٹ ہاؤس سے کچھ فاصلے پر ایک ریستوران تھا جو سامنے ہی نظر آرہا تھا۔ علی ہمیں کھانے کے لئے وہاں لے گئے۔ خاصی پر رونق اور خوبصورت جگہ تھی، مصری اور یورپین کھانا بھی بہت اچھا تھا۔ ہم نے تو سوپ اور مچھلی پر ہی گزارا کیا۔ اکثریت مغربی خواتین و اصحاب کی تھی جن کے لئے مشروبات کا بھی اہتمام تھا۔ ماحول بہت رنگین تھا۔ سیاح بہت اچھے موڈ میں تھے اور ایک میز سے دوسری میز پر جاکر ایک دوسرے سے تعارف کرنے اور ہنسنے بولنے میں مصروف تھے۔ ہماری میز پر بھی چند خواتین آگئیں اور بے تکلفی سے باتیں شروع کر دیں۔ میل ملاپ کا کام زیادہ تر خواتین ہی کر رہی تھیں کیونکہ مرد تو مے خواری میں مگن تھے۔

"بھئی بہت نیند آرہی ہے۔ اب چل کر سونا چاہئے"۔ شباب صاحب نے کہا۔

علی نے کہا۔ "یہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔ آج کا سب سے دلچسپ اور رنگین پروگرام تو ابھی باقی ہے"۔

"وہ کیا ہے؟"

"یہ گیسٹ ہاؤس دنیا کے سب سے بڑے ریگستان سہارا کے ایک کونے پر واقع ہے۔ اس کے نزدیک ہی سہارا نائٹ کلب ہے جو دنیا کا مشہور ترین نائٹ کلب ہے۔ ابھی تو وہاں کا پروگرام باقی ہے"۔

نیند اور تھکن کے مارے سب کا برا حال تھا مگر دنیا کے مشہور ترین نائٹ کلب کے بارے میں سنا تو سب ہوشیار ہو گئے۔ ہم نے علی کو ایک طرف لے جاکر دریافت کیا کہ اس پروگرام میں کوئی قابل اعتراض بات تو نہیں ہوگی؟

وہ ہنسنے لگا۔ "مسٹر آفاقی۔ یہاں صرف مصری رقص اور موسیقی کا پروگرام پیش کیا جاتا ہے۔ لوگ اپنے خاندان کے ساتھ آتے ہیں"۔

نائٹ کلب ایک کشادہ اور خوبصورت عمارت میں تھا جس کی آرائش خالص مصری انداز کی تھی۔ کرسیوں کے درمیان میں ایک چبوترہ بنا ہوا تھا۔ ہم جس وقت وہاں پہنچے تو کافی لوگ موجود تھے جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔ ہم نے دیکھا کہ مختلف کاروں اور ویگنوں میں سے مصریوں کے خاندان باہر نکلتے اور گاتے اور تالیاں بجاتے ہوئے نائٹ کلب کے اندر چلے جاتے۔ علی نے بتایا کہ مصری، موسیقی کے دلدادہ ہوتے ہیں۔

جس طرح گاتے ہوئے آئے ہیں اسی طرح گاتے ہوئے واپس جائیں گے۔

ہمارے لئے یہ کوئی حیرت کی بات نہیں تھی کیونکہ ہم پہلے قاہرہ آچکے تھے مگر ہمارے ساتھی اس بات پر بہت حیران تھے کہ نائٹ کلب میں لوگ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ آئے ہیں کیونکہ عام طور پر نائٹ کلب کے ساتھ جو خیالات وابستہ ہیں ان کے مطابق تو کسی شریف آدمی کا تنہا نائٹ کلب جانا بھی قابل اعتراض ہے کہاں یہ کہ وہ اپنے بال بچوں کو بھی ساتھ لے جائے۔

"سہارا نائٹ کلب" قاہرہ کا ایک معروف اور قابل ذکر نائٹ کلب ہے۔ اس

کی اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ تاریخی ریگستان سہارا یہیں سے شروع ہوتا ہے اور یہ کلب اس کے ایک گوشے میں واقع ہے پھر بتایا گیا کہ اس کلب میں بہت نامور اور مقبول فن کار اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

ابھی ہم کلب کے اندر داخل نہیں ہوئے تھے کہ دف بجانے کی آواز کانوں میں پڑی۔ دیکھا کہ عمارت کے ایک حصے کی جانب سے ایک خوبرو رقاصہ نہایت خوش رنگ لباس میں نمودار ہوئیں اور لہراتی' بل کھاتی اور مٹکتی ہوئی کلب کی عمارت میں داخل ہو گئیں۔ ان کا لباس ویسا ہی تھا جیسا کہ عام طور پر مغربی فلموں میں دکھایا جاتا ہے۔ اگر عریانی کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو خاصا قابل اعتراض تھا لیکن مصریوں کو غالباً" اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ تالیاں بجاتی اور مسکراتی ہوئی کلب میں داخل ہوئیں تو حاضرین نے بھی ان کے ساتھ تالیاں بجانی شروع کر دیں اور کافی دیر تک تالیاں بجانے کا یہ مقابلہ جاری رہا یہاں تک کہ وہ اسٹیج کے ایک عقبی دروازے میں غائب ہو گئیں۔ نائٹ کلب کا ماحول اب ایک دم زندگی سے بھرپور ہو گیا۔ لوگوں نے باتیں کرنی شروع کر دیں تھیں.... بچے کھیل رہے تھے ۔ بڑے لوگ ہنسی مذاق اور لطیفہ بازی میں مصروف تھے۔ طرفہ تماشہ یہ تھا کہ جب کوئی رقاصہ اور مغنیہ اندر داخل ہوتیں تو وہ بھی دف بجاتی اور تالیاں بجاتی ہوئی اندر آتی تھیں اس طرح لوگوں کے ہجوم بھی دف بجاتے ہوئے یا تالیاں بجاتے ہوئے اندر آتے تھے اور انہیں دیکھ کر ہال میں موجود لوگ بھی تالیاں بجانا شروع کر دیتے تھے۔

کچھ دیر بعد رقص اور نغمے کا پروگرام شروع ہوا۔ رقص واقعی انتہائی دلکش اوردلفریب تھا۔ اس پر عربی موسیقی نے اور بھی سماں باندھ دیا تھا لیکن سب سے زیادہ دلچسپ اور قابل ذکر حاضرین محفل کا طرز عمل تھا جو بڑھ چڑھ کر اس ناچ گانے میں حصہ لے رہے تھے اور لطف اندوز ہو رہے تھے۔ محفل بہت دلچسپ اور رنگین تھی۔ رقاصہ ایک کے بعد ایک رقص اور نغمہ پیش کر رہی تھی اور جوں جوں رات گزرتی جارہی تھی محفل میں جولانی آتی جا رہی تھی لیکن نیند کے مارے ہم لوگوں کا بہت برا حال تھا۔ ہزار کوشش کے باوجود آنکھیں کھلی رکھنا دوبھر ہو گیا تھا۔ ایک دو بار تو ہم کرسی سے گرتے گرتے بچے۔ دراصل جب سے ہم قاہرہ پہنچے تھے مسلسل گردش میں تھے اور نیند بھر کر سونا نصیب نہیں ہوا تھا۔ اس لئے اب یہ عالم تھا کہ آنکھیں کھلی رکھنا محال تھا۔ رقاصہ کیا کر رہی ہے اور کون سے نغمے گا رہی ہے؟ کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ ہم نیند میں غوطہ کھا گئے۔ آنکھ کھلی تو دیکھا کہ ایک نئی رقاصہ نئے لباس میں جلوہ گر ہے اور کوئی اور نغمہ گا رہی ہے۔ غرض یہ کہ سوتے جاگتے یہ تماشہ دیکھتے رہے' کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی رنگین خواب دیکھ رہے ہیں۔ جب کرسیوں پر بیٹھے رہنا بالکل ناممکن ہو گیا تو ہم نے اپنے دوسرے ساتھیوں کی جانب نگاہ کی ۔ دیکھا تو ان میں سے کچھ سو چکے تھے۔ شباب صاحب بھی باربار جھونکے کھا رہے تھے۔

لفٹی ہمارے شانے سے سر ٹکائے سو رہی تھی۔ البتہ باشندی اور علی چاق وچوبند تھے۔ جب ہم نے کمرے میں جاکر سونے کا ارادہ ظاہر کیا تو وہ بہت حیران ہوئے اور کہا کہ یاحبیبی اتنا اچھا پروگرام باربار نہیں دیکھنے کو ملتا اور آپ اسے چھوڑ کر جارہے ہیں۔

ہم نے گھڑی کی جانب توجہ دلائی جس میں ڈھائی بج رہے تھے ۔

انہوں نے کہا۔" تو پھر کیا ہوا۔ آپ خود دیکھ لیجئے۔ بچے تک جاگ رہے تھے یہ محفل تو صبح تک جاری رہے گی۔"

ہم نے معذرت طلب کی۔ اپنے ساتھیوں کو جگایا اور بھری محفل چھوڑ کر گیسٹ ہاؤس کی راہ لی جو چند قدم کے فاصلے پر ہی تھا۔ رات کافی گزر چکی تھی اور ریگستان میں خاصی خنکی ہو گئی تھی۔ کمرے میں بھی ٹھنڈک محسوس ہو رہی تھی اور نیند کے نشے کو دو آتشہ بنائے دے رہی تھی کلب سے موسیقی اور تالیوں کی آوازیں ہمارے کمرے میں بھی پہنچ رہی تھیں۔ باشندی اور علی نے بھی اپنے لئے وہیں کمرے کا بندوبست کر لیا تھا۔ جب انہوں نے ہم سے رخصت طلب کی تو ہم نے فوراً" اٹھ کر کمرے کی کھڑکیاں بند کرنی شروع کر دیں۔

باشندی نے کہا۔" یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ صحرا کی ہوا کا لطف تو رات ہی کو آتا ہے۔ کھڑکیاں بند کر دیں گے تو اس سے محروم ہو جائیں گے۔"

ہم نے کہا۔"مگر کمرے میں ہمارا سامان بھی موجود ہے۔ اور ہم نے دیکھا ہے کہ اس آبادی کے ارد گرد احاطے کی دیوار تک نہیں ہے۔ نہ ہی کوئی چوکیدار نظر آیا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہوا کے ساتھ ساتھ چور بھی آجائے؟"

وہ ہنسنے لگا۔" ارے چھوڑیئے۔ آرام سے سو جائیے۔ یہاں سے کسی کا سامان چوری نہیں ہوتا۔ سب لوگ کھڑکیاں کھول کر ہی سوتے ہیں۔"

اس کا دل رکھنے کیلئے ہم نے کھڑکیاں کھلی چھوڑ دیں مگر صبح اٹھے تو سب سے

پہلے اپنے سوٹ کیس چیک کیے۔ سب چیزیں محفوظ تھیں۔ اپنے قیام قاہرہ کے دوران یہ بات ہمیں بہت پسند آئی بلکہ ہم اس سے متاثر بھی ہوئے' چوری چکاری کا لوگوں کو ڈر نہیں تھا۔ باشندی اپنے فلیٹ کی کھڑکیاں کھلی چھوڑ کر چلا جاتا تھا۔ لق ودق ریگستان میں ' شہر سے دور قریباً" ویرانے میں واقع گیسٹ ہاؤس میں نہ کوئی چوکیدار تھا نہ پہرے دار اور سیاح اپنے کمروں کی کھڑکیاں کھلی چھوڑ کر سویا کرتے تھے۔ یہ گزرے وقتوں کی باتیں ہیں ۔ خدا جانے اب وہاں کیا حال ہے؟ لوگ اپنے گھروں کی کھڑکیاں دروازے کھول کر سوتے ہیں یا بندوقیں لیے جاگتے اور پہرہ دیتے رہتے ہیں۔ ہم سوچتے ہیں کہ اگر وہاں کھڑکیاں بند کرنے کا رواج ہوگیا ہے تو پھر باشندی جیسے کنواروں کا کیا ہوگا اور ان کے گھروں کے اندر پراسرار آسیب کیوں کر داخل ہوا کریں گے؟

گیسٹ ہاؤس کے باتھ روم انتہائی خوبصورت اور شاندار تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ قاہرہ پہنچنے کے بعد پہلی بار ہمیں ایک اچھے غسل خانے میں آرام سے نہانے کا موقع ملا تھا جو بجائے خود کسی عیاشی سے کم نہ تھا۔ صبح دیر سے سوکر اٹھے تو پھر کافی دیر تک نہاتے رہے تھے اس لئے جب کمرے سے باہر نکل کر ریستوران کی طرف گئے تو وہ بالکل ویران تھا۔ نہ آدم نہ آدم زاد۔ کرسیاں میزیں خالی پڑی ہوئی تھیں۔ عملے کا کوئی فرد بھی نظر نہیں آیا۔ دن کے ساڑھے نو بج رہے تھے اور دھوپ میں جیسے جیسے تیزی آرہی تھی اسی تناسب سے گرمی بھی بڑھ رہی تھی۔ وہی مقام جو رات کے وقت ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکوں سے لطف اور ترنگ پیدا کر رہا تھا اب وہاں دھوپ کی تمازت پریشان کرنے لگی تھی۔ پڑوس کا سارا نائٹ کلب بھی اجڑ چکا تھا۔ نہ موسیقی اور تالیوں کی آوازیں تھیں اور نہ ہی تماشائیوں کے قہقہوں کی موسیقی ۔ راتوں رات یہ جگہ پناحلیہ تبدیل کرچکی تھی۔ لطف کی بات یہ تھی کہ گیسٹ ہاؤس جو رات کو مہمانوں سے لبریز تھا اس وقت ان درجنوں بنگلوں میں کوئی ایک ذی روح بھی موجود نہ تھا۔ دراصل وہ سب غیر ملکی سیاح تھے۔ منہ اندھیرے ہی اٹھ کر سیروسیاحت کیلئے چلے گئے تھے۔ ہماری طرح تو نہ تھے کہ صبح ساڑھے آٹھ بجے بیدار ہوئے تھے۔

باشندی اور علی نے بلند آواز میں آوازیں لگانی شروع کیں تو کچھ دیر بعد ریستوران کے ایک گوشے میں کچھ کھڑبڑ سی ہوئی اور پھر ایک جبہ پوش مصری نوجوان جماہیاں لیتا ہوا برآمد ہوا۔ اس نے آتے ہی باشندی اور علی کو ڈانٹنا شروع کردیا۔ بعد میں انہوں نے بتایا کہ وہ انہیں کچی نیند سے جگانے پر برا بھلا کہہ رہا تھا۔

باشندی نے کہا۔" مگر یہ سب لوگ کہاں چلے گئے؟ ہمیں ناشتا کرنا ہے۔"

ناشتے کو بھول جاؤ۔ ذرا گھڑی کی طرف نظر ڈالو۔ بندہ خدا یہ کوئی ناشتے کا وقت ہے۔ یہاں تو صبح ساڑھے سات بجے تک ناشتا فراہم کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد جو بھی آئے وہ ہوا کھائے یا ریت پھانکے ۔ میری بلا سے۔"

یہ کہہ کر وہ جماہیاں لیتا ہوا رخصت ہوگیا اور اسی گوشے میں پہنچ کر ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔ باشندی نے یہ تمام صورتحال ہم لوگوں کو سمجھائی اور تسلی دی کہ گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ابوالہول نے نزدیک والے ریستوران میں جاکر ناشتا کریں گے۔ گویا قاہرہ کے قیام کے دوران میں ابوالہول اور اہرام سے نجات ملنا ممکن نہیں ہوتا۔

ابوالہول اسی طرح غرور سے سراٹھائے کھڑا تھا جس طرح ہزارہا سال سے ایستادہ ہے۔ اس کے آس پاس سیاحوں کی ٹولیاں بکھری ہوئی تھیں۔ گائیڈز جھوٹی سچی کہانیاں سنا رہے تھے اور سیاح حیران ہوکر سن رہے تھے۔ تصویریں بنائی جارہی تھیں۔ اونٹوں اور گدھوں پر سوار کا سلسلہ جاری تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بخشش طلب کرنے والوں کی ٹولیاں بھی سرگرم عمل تھیں۔ رات کے وقت لائٹ اینڈ ساؤنڈ شو کے دوران میں ہم نے جو منظر اور ماحول دیکھا تھا وہ بھی ایک خواب کی مانند تبدیل ہوگیا تھا لیکن اس کی صدائے بازگشت کانوں میں اور مناظر کی رعنائی آنکھوں میں سمائی ہوئی تھی۔ رات کو جو کچھ دیکھا تھا وہ سراب تھا یا حقیقت؟ کون کہہ سکتا ہے!

ریستوران کے اندر خوب رونق تھی۔ مغربی سیاحوں خواتین گرمی کے بہانے برائے نام لباسوں میں ملبوس تھیں مگر خوشبوؤں سے ریستوران مہکا ہوا تھا۔

باہر ابوالہول کا بارعب مگر سال خوردہ مجسمہ تھا تو ریستوران کے اندر رنگ ونور اور خوشبو کا چمن کھلا ہوا تھا۔ قدیم وجدید کا یہ امتزاج بھی خوب تھا۔

یہ قاہرہ میں ہماری آخری رات تھی ۔ جہاں تک خاص خاص قابل دید مقامات کا تعلق ہے وہ ہم لوگ دیکھ چکے تھے۔ ورنہ تفصیل سے قاہرہ کو دیکھنے کیلئے تو ایک عمر درکار ہے۔ لئیق نے یہ تجویز پیش کی کہ آج شاپنگ کی جائے۔ غزہ کے علاقے میں قاہرہ کے بہترین شاپنگ سنٹر موجود ہیں۔

ہم نے شباب صاحب سے کہا۔" ٹھیک ہے۔ نزدیک ہی چڑیا گھر بھی ہے ۔ اس کا بقیہ حصہ آج دیکھ لیں گے۔"

شباب صاحب ناراض ہوگئے۔ "خبردار ۔ کوئی چڑیا گھر کا نام نہ لے ۔ میں اس کے نزدیک بھی نہیں جانا چاہتا۔"

چھوڑو یار۔ بھابھی آج پھیر میری چپل پہن کر چلی جائیں گی۔" ہم سب ہنسنے لگے۔

قاہرہ کا ماڈرن علاقہ یورپ کی یاد دلاتا ہے۔ مغربی سیاحوں کی کثرت کے سبب بھی یورپین ماحول نظر آتا ہے۔ البتہ سڑکوں اور دکانوں میں لبادہ پوش مصری مرد اور نقاب پوش مصری خواتین بھی نظر آجاتی ہیں جن کہ وجہ سے مشرقیت کا احساس رہتا ہے ۔ قاہرہ کی سڑکوں پر ٹریفک کا اژدہام تھا لیکن بہت نظم وضبط کے ساتھ ٹریفک رواں دواں تھا۔ اس زمانے میں صدر سادات کی حکومت نئی نئی آئی تھی۔ کافی مدت کے بعد مصر نے سوویت روس سے کنارہ کش ہوکر امریکا کی طرف رخ کیاتھا اور امریکی امداد کے ریل پیل شروع ہوگئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی "بڑے اور مراعات یافتہ" لوگوں کے پاس بھی دولت کی فراوانی ہوگئی تھی۔ تعمیری کام ہر طرف نظر آرہاتھا۔ سڑکیں کشادہ ہورہی تھیں۔ قاہرہ میں اوور ہیڈ پل اور فلائی اوور تعمیر کیے جارہے تھے۔ شہر میں آنے والے مغربی سیاحوں کے تعداد میں بہت اضافہ ہوگیاتھا۔ دکانیں مصنوعات سے بھری ہوئی تھیں۔

ہم نے دکانوں میں ونڈو شاپنگ بھی کی اور برائے نام شاپنگ بھی کی ۔ مثلا ہم نے اونٹ کی کھال سے بنا ہوا ایک کمیشن خریدا۔ جاوید صاحب نے ایک کیمرہ خریدا۔ شباب صاحب نے بجلی کا شیونگ ریزر خریدا۔ حسن صاحب نے کچھ نہیں خریدا لیکن باشندی نے ایک کپڑے کا ٹکڑا خرید کالبنی کو تحفے کے طور پر پیش کیا۔ "یہ آپ کے اسکرٹ کے لئے ہے۔ آجکل مصری خواتین میں اسکرٹ کے لئے یہ کپڑا بہت مقبول ہے۔"

"مگر میں تو اسکرٹ نہیں پہنتی۔"

"تو پھر آپ قمیض بنالیجئے گا۔"

علی نے خوشبو کی ایک شیشی لبنی کو خرید کردی اور بتایا کہ یہ خوشبو مصر کی مخصوص اور مشہور خوشبو ہے۔

باشندی نے لقمہ دیا۔ "جو کلو پیٹرا استعمال کیا کرتی تھی۔"

جاوید صاحب نے شاپنگ تو برائے نام ہی کی مگر سیلز گرل کے ساتھ بھاؤ تاؤ کرتے رہے۔ وہ ہر چیز کی اتنی کم قیمت پیش کرتے تھے کہ سیلز گرل کے رضامند ہونے

کا کوئی امکان ہی نہیں تھا۔

ہم نے کہا۔ "بھئی کیوں بلاوجہ وقت ضائع کررہے ہو؟"

کہنے لگے۔ "وقت تو تم ضائع کررہے ہو۔ میرا وقت توبہت اچھا گذر رہا ہے۔"

شباب کیرانوی کی خواہش تھی کہ قاہرہ سے رخصت ہونے سے پہلے ایک بار جامعہ الازہر ضرور دیکھ لیں۔ ان کی فرمائش پوری کرنے کیلئے ہم جامعہ الازہر چلے گئے۔

خدا جانے یہ اس کے بارے میں پڑھی ہوئی داستانوں کا اثر تھا یا واقعی یہ عمارت ہی ایسی پرشکوہ اور مرعوب کن ہے کہ وہاں جاکر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔ یہ درسگاہ ہے جو کسی زمانے میں دنیائے اسلام کی عظیم ترین درسگاہ سمجھی جاتی تھی اور مذہبی معاملات میں جامعہ الازہر کی سند آخری سند تصور کی جاتی تھی۔ یہاں ایک علمی فضا کا احساس ہوتا ہے۔ قدیم ملبوسات میں ادھر سے ادھر جانے والے علماء کے باعث ماحول کچھ اور بھی زیادہ برگزیدہ ہوجاتا ہے۔ شباب صاحب کافی دیر تک خاموش کھڑے اس عمارت کو دیکھتے رہے پھر ایک سرد آہ بھری اور بولے۔ "کتنے خوش نصیب ہوتے ہیں وہ لوگ جو اس جامعہ الازہر میں تعلیم حاصل کرتے ہیں ۔" شباب صاحب اگر چند سال اور کم عمر ہوتے تو شاید جامعہ الازہر میں ضرور داخلہ لے لیتے۔ ان کے انداز سے کم سے کم یہی ظاہر ہورہاتھا۔

جامعہ الازہر کے سامنے بازار خان خلیل ہے۔ اس بازار کی رونق میں کبھی کمی نہیں آتی۔ ایک تو مقامی لوگوں کی آبادی بہت گنجان ہے اس پر سے ہر وقت سیاحوں کی آمدورفت رہتی ہے۔ اس بازار میں نوادرات کی بہت سی دکانیں ہیں۔ حسن صاحب نے مشورہ دیا کہ چلو تھوڑی دیر کیلئے نوادرات ہی دیکھ لیں۔ خریدنے کی تو پسلی نہیں تھی۔ مگر دیکھنے اور قیمت دریافت کرنے میں کیا ہرج تھا۔

ہم نے قاہرہ میں نوادرات کی ایک دکان پہلے بھی دیکھی تھی اور چند دکانیں اس روز بھی دیکھیں۔ کم ازکم ہمارا مشاہدہ اور تجربہ یہ ہے کہ نوادرات کی ان دکانوں میں سائز کے سوا کوئی اور خاص فرق نہیں ہوتا۔ ان سب دکانوں پر کباڑخانوں کا گمان گزرتا ہے۔ سبھی جگہ مدہم روشنی میں ایک پراسرار ساماحول نظر آتا ہے۔ سبھی دکاندار ہوشیار' چالاک ' باتونی اور ہالی ووڈ کی فلموں میں پیش کیئے جانے والے کرداروں کی مانند مصنوعی نظر آتے ہیں۔ خدا جانے ہالی ووڈ کے فلم سازوں نے انہیں دیکھ کر اپنے فلمی کردار تخلیق کیئے ہیں یا ان حضرات نے ہالی ووڈ کی فلمیں دیکھنے کے بعد خود کو اس

سانچے میں ڈھال لیا ہے۔ ان دکانوں میں ہر چیز کی قیمت آسمان سے باتیں کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اگر پتھر کا ایک ٹکڑا بھی اٹھا کر اس کی قیمت دریافت کریں تو وہ سینکڑوں ہزاروں میں ہوتی ہے۔ دکاندار گاہکوں کو یہ تاثر دیتے ہیں جیسے کہ یہ پتھر کسی فرعون کے تاج کی زینت تھا۔ گپیں لگانا تو ان لوگوں پر ختم ہے اور اس قدر وثوق اور اعتماد کے ساتھ گپ لگاتے ہیں کہ ان پر یقین بھی آجاتا ہے۔ یہ دکاندار عربی لہجے میں انگریزی بولتے ہیں۔ انگریزی اتنی ضرور جانتے ہیں کہ اپنا مافی الضمیر واضح کردیں۔ اکثر دکانوں میں ہم نے خوش شکل لڑکیوں کو بھی دیکھا۔ یہ کھلے عام سامنے نظر آتی ہیں بلکہ عقب کے کمروں میں یا چلمن لگے ہوئے دروازوں کے پیچھے موجود ہوتی ہیں اور گاہے بگاہے اپنی جھلک دکھاکر رخصت ہوجاتی ہیں۔ یہ براہ راست گاہکوں کو مخاطب نہیں کرتیں مگر دزدیدہ نگاہوں سے ان کی جانب دیکھتی اور مسکراتی رہتی ہیں۔ خواتین کے بارے میں تو کہا نہیں جاسکتا مگر مرد گاہک ان کے اس انداز پر ہی گرویدہ ہوجاتے ہیں اور اکثر اشیا کی زائد قیمتیں ادا کردیتے ہیں۔ اگر دکانداروں کے بیان پر یقین کیا جائے تو ان کی دکانوں پر کوئی بھی ایسی چیز نہیں ہوتی جو کسی فرعون یا بادشاہ کے استعمال میں نہ رہ چکی ہو۔ زنانہ قسم کی اشیاء پر وہ فوراً" کلوپیٹرا کا ٹھپا لگادیتے ہیں۔

"یہ پتھر کی پیالی کیسی ہے؟"

"جناب والا۔ اس میں کلوپیٹرا اپنے چہرے کا میک اپ رکھا کرتی تھی۔"

"اور بے ہنگم سی شیشی نما چیز؟"

"کیا بات کرتے ہیں آپ؟ اس میں وہ لوشن رکھا جاتا تھا جس سے کلوپیٹرا ہر صبح اپنے چہرے پر مساج کرایا کرتی تھی۔"

ان بازاروں اور دکانوں میں وہ بوڑھے بوڑھے پراسرار قسم کے لوگ بھی نظر آجاتے ہیں جو سرگوشیوں میں بتاتے ہیں کہ فراعنہ کی بیگمات کی لازوال جوانی کا راز انہیں معلوم ہے۔ ان کے پاس قدیم تاریخی نسخے محفوظ ہیں۔

"یہ نسخے آپ کو کہاں سے ملے؟"

"یہ فرعونوں کے مقبروں میں ان کی ملکاؤں کے ساتھ ہی دفن کردیے جاتے تھے۔ وہیں سے تلاش کرکے نکالے گئے ہیں۔ یہ پچاس سالہ خاتون کو بیس سالہ دوشیزہ کے سانچے میں ڈھال سکتے ہیں۔ یہ جڑی بوٹیوں سے بنائے جاتے ہیں اور ان جڑی بوٹیوں کو افریقہ کے جنگلوں سے تلاش کرکے لایا جاتا ہے۔"

ہم لوگوں کیلئے تو یہ سب داستانیں محض گپیں ہی تھیں اس لئے کہ ہم لوگ اپنے ملک میں اس سے زیادہ گپیں سنتے رہتے ہیں مگر اہل مغرب ان سے مرعوب ہوتے ہیں۔ مغرب کے لوگ خواہ کتنی ہی ترقی کرلیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ غیر شعوری طور پر مشرق کو پراسرار سرزمین کہتے ہیں اور یہاں کے بارے میں ان کے سامنے جتنا جھوٹ بولا جائے وہ اسے سچ ہی سمجھتے ہیں۔

ہم رنگین شیشوں سے مزین کھڑکیوں اور دروازوں والی جس دکان میں سب سے آخر میں آئے تھے۔ وہاں شباب صاحب کو ایک مصری دوشیزہ اتنی پسند آئی کہ انہوں نے فوراً" اپنا خیال ظاہر کردیا کہ یہ لڑکی اگر فلموں میں کام کرے گی تو بہت کامیاب ہیروئن بن جائے گی۔ تم یہ بات نوٹ کرکے رکھ لو۔

ہم نے کہا کہ بھائی ہم یہاں دوبارہ نہ جانے کب آئیں گے۔ خدا جانے یہ لڑکی ہمیں دوبارہ ملے یا نہ ملے۔ ہمیں اس کے درخشاں مستقبل کے بارے میں پیش گوئیاں نوٹ کرنے کی کیا ضرورت پڑی ہے۔

ہم لوگ اپنا وقت بے کار ضائع نہیں کررہے تھے۔ دراصل باشندی نے اسی رات مصر کے ایک فلم ساز کے ساتھ ہماری ملاقات کا بندوبست کیا تھا۔ ان صاحب سے ایک ریستوران میں ملاقات ہوئی۔ یہ ایک چھوٹے قد کے موٹے تازے، درمیانہ عمر کے گورے چٹے آدمی تھے۔ ظاہر ہے کہ شام، فلسطین یا اردن سے ان کا تعلق تھا۔ باشندی نے بتایا یہ چند کامیاب فلمیں بنا چکے ہیں۔ ان سے میں نے آپ لوگوں کے بارے میں تذکرہ کیا تھا کہ آپ لوگ ان کے ساتھ مشترکہ فلم سازی کے خواہش مند ہیں۔

فلم ساز کا نام حارث بن کچھ تھا۔ انگریزی کام چلانے کے مطابق جانتے تھے اور اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی پر ذرا بھی شرمندہ نہیں تھے۔ انگریزی انہوں نے کسی اسکول یا کالج میں نہیں پڑھی تھی۔ صرف بول چال کے ذریعے سیکھی تھی۔ ان کے ساتھ ایک دراز قد، بھرے بھرے جسم کی کالی اور موٹی آنکھوں والی ایک خاتون بھی تھیں۔ معلوم ہوا کہ وہ ان کی سیکرٹری حبیبہ ہیں اور عنقریب ان کی ایک فلم میں ہیروئن کے طور پر پیش کی جانے والی ہیں۔

"جھانسا دیا ہے۔" جاوید نے چپکے سے کہا۔

حارث صاحب نے ابتدائی گفتگو کے بعد کام کی باتیں شروع ہوئیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ اگر کوئی فیصلہ کن بات ہوگی تو آپ لوگ واپسی میں پھر چند روز کیلئے قاہرہ

میں قیام کرلیجئے گا۔ باقی تفصیلات بعد میں طے ہوجائیں گی۔ پہلے یہ بتائیے کہ آپ کی تجویز کیا ہے؟

ہم نے فوراً انہیں تجویز پیش کردی۔ اس وقت تک یہ ہوتا تھا کہ جس ملک کے ساتھ مل کر فلم بنائی جاتی تھی وہاں کے جو آرٹسٹ مشترکہ فلم میں کام کرتے تھے وہ مقامی فلم ساز کی ذمہ داری ہوتے تھے۔ جس ملک میں شوٹنگ ہوتی تھی وہاں کے تمام اخراجات بھی مقامی فلم ساز ہی برداشت کرتا تھا۔ باقی اخراجات کے بارے میں بھی طے کرلیا جاتا تھا۔

ہم نے کہا۔ دیکھیے صاحب۔ ہیروئن ہم اپنے ساتھ لائیں گے۔ ہیرو آپ دیں گے۔ اس طرح دو اور فن کار اور چھوٹے موٹے اداکار اور ایکسٹراز بھی آپ ہی کے ذمے ہوں گے۔ قاہرہ میں ایک ماہ کے قیام وطعام اور شوٹنگ کے اخراجات بھی آپ برداشت کریں گے۔ باقی سب اخراجات ہمارے ہوں گے۔ ہم نیگیٹو آپ کے حوالے کردیں گے آپ اسے عربی میں ڈب کرکے سارے عالم عرب میں چلانے کے مجاز ہوں گے۔"

حارث صاحب نے چند لمحے غور کیا پھر بولے۔"یا اخی! یہ بتائیے کہ آپ پیسے کتنے خرچ کریں گے۔ ہم تو ففٹی ففٹی کے قائل ہیں۔ ہمارے ملک میں ایک فلم کی لاگت (پاکستانی روپے کے مطابق) چالیس سے پچاس لاکھ ہوتی ہے۔ اس کی آدھی رقم آپ لے آئیں آدھی ہم دیں گے۔"

یہ سن کر ہم ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔ بات یہ تھی کہ اس وقت ایک رنگین پاکستانی فلم پر آٹھ لاکھ روپیہ لاگت آتی تھی۔ کہاں آٹھ لاکھ اور کہاں نصف لاگت پچیس لاکھ!

"آپ کی ہیروئن کتنا معاوضہ لے گی؟" انہوں نے پوچھا۔

"ہم نے اپنی دانست میں بڑھا چڑھا کر کہا۔"چار پانچ لاکھ روپے۔"

وہ بولے۔"ہمارا ہیرو کم سے آٹھ لاکھ روپے لیتا ہے۔ باقی اداکار بھی دو ڈھائی لاکھ سے کیا کم لیں گے۔ ایکسٹراؤں کو بھی رقم آپ ہی ادا کریں گے مگر اطمینان رکھیے آپ کو اپنے حصے کے ففٹی پرسنٹ سے زیادہ خرچ نہیں کرنا پڑے گا۔"

باشندی نے کہا۔"اب بولیے۔ کیا خیال ہے؟"

ہم نے بڑے اطمینان سے کہا۔"سوچنا پڑے گا۔ چند دن کی مہلت درکار ہے"

"بڑے شوق سے مہلت لے لیجئے مگر ایک سوال یہ بھی ہے کہ فلم کی کہانی

کیا ہوگی؟ ہم ایسی کہانی چاہیں گے جو مصر میں بھی پسند کی جائے۔"

شباب صاحب نے اردو میں کہا۔"اسے کوئی ایکشن کی کہانی گھڑ کر سنا دو۔"

ہم نے فوراً فی البدیہہ ایک کہانی بنا کر سنا دی جس میں ہیروئن پر اسمگلروں کے ایجنٹ کا شبہ ہوتا ہے اور ہیرو خفیہ پولیس افسر ہوتا ہے مگر پبلک کو یہ خبر نہیں ہوتی۔ ہیرو اور ہیروئن ایک دوسرے سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ ہیروئن کے پیچھے پولیس بھی لگی ہوئی ہے اور اسمگلر بھی اس کی تلاش میں ہیں۔ ہیرو اس کی مدد کرتا ہے۔ دونوں بھاگے بھاگے پھرتے ہیں اور اس بہانے قاہرہ کی تمام تاریخی اور قابل ذکر مقامات پر جاتے ہیں۔ فلم کا کلائمکس ابوالہول کے مجسمے پر ہوتا ہے جہاں اسمگلروں اور ہیرو کے مابین لڑائی ہوتی ہے اور عین وقت پر پولیس بھی آجاتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

حارث کو کہانی کچھ پسند نہیں آئی تو ہم نے فوراً دوسری کہانی سنا دی۔ یہ ایسے سمگلروں کے بارے میں ہے جو کھدائی کرنے والوں کے روپ میں قاہرہ میں آتے ہیں اور قیمتی نوادرات چرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ ہیروئن کو فریب دے کر اپنے ساتھ ملا لیتے ہیں۔ ہیرو ان کی اصلیت جان لیتا ہے اور پھر بھاگ دوڑ شروع ہوجاتی ہے

حارث نے کہا۔"آخر آپ کی ہر کہانی میں اسمگلر اور بھاگ دوڑ کیوں ہے؟"

ہم نے کہا۔"اس لئے کہ اول تو آج کل ساری دنیا میں ایسی ہی فلمیں بن رہی ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس قسم کی کہانی ہر ملک میں پسند کرلی جاتی ہے۔ تیسرے یہ کہ اس بہانے ہم قاہرہ کا چپہ چپہ دکھا سکتے ہیں۔"

حارث نے کہا۔"آئیڈیا برا نہیں ہے مگر مجھے سوچنے کے لئے مہلت چاہیے۔" ہم نے فوراً مہلت دے دی کیونکہ یہ تو سمجھ گئے تھے کہ یہ بیل منڈھے نہیں چڑھے گی۔

محض گپ شپ تک ہی محدود رہے گی۔

حارث نے کہا۔"آپ انڈیا! جیسی کوئی کہانی کیوں نہیں بناتے؟"

ہم نے کہا۔"وہ تو ہمارے بائیں ہاتھ کا کام ہے مگر ناچنا گانا شاید آپ کے تماشائیوں کو پسند نہ آئے۔"

"ناچ گانے کے تو ہم عاشق ہیں اور یہاں انڈین فلمیں بے حد پسند کی جاتی ہیں۔"

ہم نے کہا۔"تو پھر فکر نہ کیجئے۔ ہم ایسی کہانی بنادیں گے کہ آپ انڈین فلموں کو بھی بھول جائیں گے۔"

حارث صاحب نے حبیبہ کی طرف دیکھا اور مسکرا کر بولے۔ "کلب ڈانسر کے کردار میں حبیبہ بھی بہت جچے گی۔"

حبیبہ نے بڑی لگاوٹ سے مسکرا کر حارث کو دیکھا اور عربی میں کچھ کہا جو جاوید صاحب کے خیال میں یہ تھا کہ چلو شریر کہیں کے!

بہرحال ہم لوگوں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ اس میٹنگ کے دوران میں حارث اور باشندی وہسکی نوش کرتے رہے۔ ہم لوگوں نے کوک پر گزارا کیا۔

رات گئے یہ میٹنگ ختم ہوئی اور ہم نے سہارا گیسٹ ہاؤس کی راہ لی۔

یہ رات بھی ویسی ہی پرلطف' ہوادار اور موسیقی سے لبریز تھی۔ موسیقی اور تالیوں کی آوازیں ہمارے کمروں میں بھی آرہی تھیں مگر ہمیں اگلے دن سویرے اٹھ کر ائرپورٹ روانہ ہونا تھا۔ نیند کے مارے آنکھیں بند ہورہی تھیں۔ اس لئے کلب جانے کے بجائے تالیوں اور موسیقی کی لوری سنتے سنتے سو گئے۔ باشندی اور علی البتہ نائٹ کلب چلے گئے اور صبح ہم ناشتے کیلئے گئے تو وہ سیدھے نائٹ کلب ہی سے آرہے تھے۔

مصریوں کی ٹولیاں گاتی بجاتی ہوئی کاروں اور کوچوں میں رخصت ہو رہی تھیں۔ ان میں مرد' عورت بچے سبھی شامل تھے۔

ہم نے سوچا۔ واقعی مصری بھی عجیب قوم ہیں۔ ایسی کوئی اور مثال ہمیں کسی اور ملک میں نظر نہیں آتی۔

ائرپورٹ پر باشندی اور علی نے بغلگیر ہوکر رخساروں پر بوسے دے کر ہم لوگوں کو رخصت کیا اور اصرار کیا کہ واپسی پر قاہرہ میں ضرور قیام کریں تاکہ فلم کے بارے میں دوسری تفصیلات بھی طے پاجائیں۔

ہم لوگ ہوائی جہاز میں سوار ہوئے تو شباب صاحب نے کہا۔ "آفاقی۔ نوٹ کرلو۔ یہ حارث فلم ولم نہیں بنائے گا۔ صرف ہمیں بے وقوف بنارہا ہے۔"

ہم نے کہا۔ "اور ہم بھی تو اس کے ساتھ ایسا ہی کررہے ہیں۔"

رفتہ رفتہ قاہرہ بہت دور رہ گیا تھا۔ نیچے ہماری نگاہوں کے سامنے ایک بے کراں ریگستان تھا۔ یقین ہی نہیں آتا تھا کہ اس ریگ زار میں قاہرہ جیسا شہر بھی آباد ہے۔